itsurdu.blogspot.com
2
حرف راز
اوریا مقبول جان
اوریا مقبول جان کے منتخب
KHALID
itsurdu.blogspot.com
میں
MAHMOOD
itsurdu.blogspot.com
itsurdu.blogspot.com

آبلے پڑ گئے زبان میں کیا

وہ جو گزشتہ ایک صدی سے اس بات پر دلائل کے انبار اکٹھا کئے کرتے تھے، جن کے قلم ہر وقت دو قومی نظریے کو باطل ثابت کرنے میں مصروف رہے، جو گفتگو کرتے ہوئے طعن و طنز کے تیر مسلمانوں بلکہ مسلم تشخص کے علمبرداروں کی جانب برساتے اور یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے تھے کہ اصل میں نفرت کا بیج تو تم بوتے ہو، ورنہ دو قومی نظریے کی تو کوئی اساس ہی نہیں۔ یہ ایک غیر فطری تقسیم ہے جو انگریز نے اپنے مفادات کے لئے کی، لڑاؤ اور حکومت کرو کے اصول کو نافذ کیا۔ رنگ، نسل، زبان اور علاقے سے قوموں کی تخلیق پر یقین رکھنے والے آج صرف نریندر مودی کے وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہونے کے بعد کس طرح گنگ ہیں، ایسے خاموش ہیں جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، یوں لگتا ہے ذہن ہی نہیں جسم بھی سن ہو چکے ہیں۔ جرأتِ اظہار اور آزادیٔ افکار کے علمبردار کس قبرستان میں جا کر دفن ہو گئے ہیں۔ اب کوئی بولتا کیوں نہیں کہ یہ ہندو مسلم کی تقسیم جو علامہ اقبال کے خطبۂ الہ آباد سے پیدا ہوئی اور قائدِاعظم نے جسے ایک ملک کی تخلیق کے ذریعے تاریخ بنا دیا یہ سب مصنوعی، جعلی اور باطل ہے۔ دو قومی نظریہ نام کی کوئی چڑیا وجود نہیں رکھتی۔ سب پنجابی، بنگالی، سندھی، گجراتی، مراٹھی اور دیگر قومیں ہیں جو صدیوں سے ایک ہندوستان میں رہ رہی ہیں۔ ان کی ثقافت ایک، کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا، گیت غزلیں، شادی بیاہ، سب ایک ہیں۔ ناک نقشے ایک ہیں، زبان ایک جیسی ہے، یہ بھلا دو قومیں ہو سکتی ہیں۔ پاکستان کی تخلیق جیسی حقیقت کے باوجود اور دس لاکھ شہداء کے خون کی لکیر کے باوصف یہ لوگ گزشتہ 67 سال سے یہی کہتے چلے آئے تھے کہ مذہب کی بنیاد پر یہ تقسیم غلط ہے۔ انہیں خوب اندازہ تھا کہ مسلمانوں کا جینا متحدہ ہندوستان میں کس قدر دو بھر ہو گیا تھا کہ انہوں نے علیحدہ وطن کے مطالبے پر لبیک کہہ دیا۔ ان لوگوں نے برِ صغیر کی تاریخ کا بھی خوب مطالعہ کیا تھا اور وہ ہندو مذہب کے اساتیر سے بھی واقف تھے۔ انہیں خوب اندازہ تھا کہ جس مذہب میں شودر اور برہمن ایک ساتھ نہیں رہ سکتے وہاں مسلمان اور ہندو کیسے ایک قوم کہلا سکتے تھے۔ انہیں اس تعصب کا بھی "بخوبی اندازہ تھا جس کا شکار اس وقت پورے ہندوستان میں مسلمان ہو رہے تھے۔ کیا انہوں نے ریلوے سٹیشن پر ہندو پانی "اور" مسلم پانی "کی الگ الگ صدائیں نہیں سنی تھیں۔ دفتروں، کھیتوں، کھلیانوں، گھروں اور آبادیوں میں انگریز کی سرپرستی میں جو سلوک ہندو مسلمانوں کے ساتھ روا رکھتے تھے، ان کو یا ان کے اکابرین کو اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ لیکن پاکستان کے حقیقت بن جانے کے باوجود ان کی انا اسے تسلیم کرنے سے روکتی رہی۔ ان کے دلوں کا بغض و کدورت اس بات کی امید لگائے بیٹھا رہا کہ کب یہ نوزائیدہ ملک اپنی حیات کے دن پورے کرتا ہے اور ہم کلکتہ سے پشاور تک دوبارہ ایک ہو جاتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں خرابیاں ہوتی ہیں، آمریتیں برسرِ اقتدار آتی ہیں، لوگ مفلوک الحال ہوتے ہیں، ایک خطے کے لوگ زیادہ خوشحال اور دوسرے خطے کے لوگ بدحال ہوتے ہیں لیکن اس بنیاد پر کبھی ملک کی سالمیت اور بقا پر سوال نہیں اٹھایا گیا۔ افغانستان میں اس کی تخلیق یعنی احمد شاہ ابدالی کے زمانے سے لے کر اب تک بدترین آمریتیں چھائی رہیں، عدالتوں کا کوئی نظام رائج نہ تھا۔ انصاف اور امن کا تھوڑا بہت تصور صرف طالبان کے پانچ سالہ دور میں نظر آتا ہے ورنہ خانہ جنگی، غربت و افلاس اور بدترین شہنشاہیت۔ کابل کا شہر پورے افغانستان کے بدحال اور غربت زدہ معاشرے سے بالکل مختلف تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود بھی کسی شخص نے وہاں یہ نعرہ بلند نہیں کیا کہ افغانستان ٹوٹ جائے گا۔ اس کے حصے بخرے ہو جائیں گے۔ یہ پشتونوں، ازبکوں، تاجکوں، ترکوں اور دیگر قومیتوں کا ملک ہے اور ہر قومیت کے اپنے اپنے زخم ہیں۔ یہ سب علیحدگی مانگتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا اور آج تک 25 سالہ جنگ کے باوجود بھی کسی نے یہ سوال نہیں اٹھایا۔ روس حملہ آور ہوا ہو یا امریکہ تمام لوگوں نے بلکہ تمام قومیتوں نے مل کر ان دونوں طاقتوں کو مشترکہ دشمن سمجھا اور لڑائی کی۔ کسی نے اپنی نفرتوں کو بیرونی حملہ آوروں کی آڑ نہ بننے دیا۔

لیکن پاکستان کی تاریخ وہ بدقسمت تاریخ ہے کہ جس کی تخلیق کے ساتھ ہی اس ملک کے عظیم دانشوروں، تجزیہ نگاروں اور مخصوص زاویۂ نظر والے سیاستدانوں نے اس خواہش کا اظہار کرنا شروع کر دیا کہ یہ ملک جلد ٹوٹ جائے گا۔ پہلے چوبیس سال انہوں نے اس پراپیگنڈہ میں لگائے کہ مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان کا استحصال کر رہا ہے۔ اس وقت کسی کو پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتون، سرائیکی یاد نہ آئے، کیونکہ ایک نعرہ بلند کر کے لوگوں کو اس پاکستان سے متنفر کرنا تھا۔ اس کے لئے بنگالی قوم کو تختۂ مشق بنایا گیا۔ پراپیگنڈے کا طوفان، الیکشنوں کا شور، آمریت کے ڈونگرے یہ سب تھے، ہر کوئی اپنی مطلب براری کے لئے اس ملک اور اس کے عوام کو تختۂ مشق بنا رہا تھا۔ اس سب کے باوجود اگر بھارت مشرقی پاکستان پر حملہ نہ کرتا تو میرے ان عظیم دانشوروں، تجزیہ نگاروں اور مخصوص زاویۂ نظر رکھنے والے سیاستدانوں کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔ بنگلہ دیش بن گیا لیکن اس کی قیمت معصوم بنگالیوں نے کس طرح ادا کی وہ انتہائی دردناک ہے۔ انہیں کہا گیا کہ تمہارا استحصال ہو رہا ہے۔ وہ آزاد ہو گئے لیکن آزادی کے بعد ان پر کیا بیتی یہ ایک تکلیف دہ باب ہے۔ 1971ء سے پہلے کوئی ایک بنگالی بھارت میں چھوٹی موٹی ملازمت کرنے گھر سے بے گھر نہیں ہوا تھا۔ آج تقریباً ایک کروڑ بنگلہ دیشی بھارت میں مزدوری کر کے رزق کما رہے ہیں۔ بنگلہ دیش اور بھارت کی سرحد پر باڑ لگی ہوئی ہے۔ اسے عبور کرنے کی کوشش پر دوسرے دن کوئی نہ کوئی بنگلہ دیشی بھارتی فوج کی گولیوں کا نشانہ بنتا ہے۔ 1971ء سے پہلے ایک بنگالی عورت دنیا کے بازاروں میں ایسے نہیں بکی تھی کہ ان کی منڈیاں لگی ہوں۔ اس وقت دنیا بھر میں دس لاکھ بنگلہ دیشی عورتیں دنیا کے بازاروں میں بیچی جا چکی ہیں۔ کلکتہ کے بازارِ حسن میں ستر فیصد عورتیں بنگلہ دیشی ہیں۔ نوے کی دہائی تک دنیا کی مارکیٹ میں بنگلہ دیشی عورت کی قیمت 25 ہزار روپے سے زیادہ نہ تھی۔ 1971ء سے پہلے مغربی پاکستان میں خانساماؤں کی اتنی بڑی تعداد مشرقی پاکستان سے یہاں نہیں آتی تھی، حالانکہ یہ ملک بھی ایک تھا۔ اس وقت تقریباً بیس لاکھ کے قریب بنگلہ دیشی بلوچستان کے بے آب و گیاہ علاقوں سے لے کر گلگت بلتستان کی پہاڑیوں تک سب جگہ رزق کی تلاش میں دربدر ہیں۔ کراچی میں موجود بنگالی تو اپنے محبوب وطن واپس نہیں جانا چاہتے، سو طرح کے حیلوں بہانوں سے پاکستان کے شناختی کارڈ بنا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بنگالیوں نے ایک بنگلہ قوم اور زبان کے نعرے پر پاکستان سے علیحدگی اختیار کی لیکن دو قومی نظریہ پھر زندہ ہوا۔ کہا تم مسلمان ہو، ملیچھ مسلمان، اپنا الگ ملک بناؤ، کلکتہ کے بنگالیوں کے ہم پلہ ہونے کے خواب کبھی نہ دیکھنا۔ لیکن میرے ملک کے ان عظیم دانشوروں، تجزیہ نگاروں اور مخصوص سیاست دانوں کا تعصب، بغض اور نفرت ختم نہیں ہوتی۔ یہ آج بھی بنگلہ دیش کے فاریکس ریزرو کی بات کرتے ہیں۔ یہ پاکستان کا کھاتے ہیں، یہاں کے عوام سے عزت و توقیر حاصل کرتے ہیں۔ ان کے بچے یہاں عزت سے زندگی گزارتے ہیں لیکن ایک ایسی جنگ میں تمغے اور ایوارڈ حاصل کرتے ہیں جو بھارت نے 1971ء میں جیتی تھی۔ کیا کبھی کسی جرمن نے برطانیہ سے ایوارڈ حاصل کیا جس نے ان کی فوج کو شکست دی تھی۔ جرمن قوم پر بھی ہٹلر جیسا ڈکٹیٹر صفت جمہوری طور پر منتخب حکمران مسلط تھا لیکن پوری جرمن قوم میں سے کوئی ایک ایسا غدار صفت شخص پیدا نہ ہو سکا جو برطانیہ سے اس بنیاد پر ایوارڈ وصول کرتا کہ اس نے جرمنوں کو ہٹلر سے نجات دلوائی تھی۔

یہ وہ طبقہ ہے جو گزشتہ 67 سال سے پاکستان اور بھارت کی اس سرحد پر دیے روشن کرتا ہے جس پر دس لاکھ مسلمانوں کے لہو کی لکیر کھینچی گئی تھی۔ یہ پھولوں کے ہار لے کر وہاں جاتا رہا ہے۔ وہاں سے آنے والوں کے ساتھ مل کر بھنگڑے ڈالتا رہا ہے اور کہتا رہا ہے یہ لکیر تو ہم نے غلط کھینچی تھی۔ 67 سال ان کی نفرت کا نشانہ وہ لوگ بنے جو اسلام کی بنیاد پر قومیت کی بات کرتے تھے۔ جو آج بھی مسلمانوں کی شناخت کی بات کرتے ہیں۔ یہ انہیں فرسودہ، بے کار، دقیانوسی اور متعصب گردانتے ہیں۔ یہ کہتے تھے کہ بھارت تو امن چاہتا ہے وہ تو سیکولر اخلاقیات کی بنیاد پر سب سے برابری کا سلوک کرتا ہے لیکن پاکستان میں بیٹھے کچھ لوگ نفرت پھیلاتے ہیں۔ لیکن تاریخ شاید ایک بار خود کو دہرا رہی ہے۔ نریندر مودی نے وہ کام کر دکھایا ہے جو برِ صغیر کے مسلمان گزشتہ 67 سال سے نہ کر سکے۔ اس نے دو قومی نظریے کو ایک بار پھر زندہ کر دیا، اس میں نئی روح پھونک دی۔ اس نے ثابت کر دیا کہ مسلمان بنگالی، مراٹھی، گجراتی، اردو یا ہندی بولے وہ صرف اور صرف مسلمان ہے، قابلِ نفرت ہے، واجب القتل ہے۔ وہ شاہ رخ کی طرح گھر میں پوجا کا استھان بنائے یا عامر خان کی طرح سیکولرازم کے پرچار کے لئے "پی کے" جیسی فلم بنائے۔ مسلمان ہے تو پھر ہم میں سے نہیں۔ وہی تصور جو 1947ء میں ہم نے دیا تھا اور تجربے کی بنیاد پر قائدِاعظم نے کہا تھا کہ ہندو نا قابلِ اصلاح قوم ہے۔ آج اسے نریندر مودی نے سچ ثابت کر دیا۔ آج بھارت کی یاترا کرنے والے ادیب ہوں یا بنگلہ دیش سے بھارتی فتح کی یاد میں ایوارڈ لینے والے دانشور، سب مسلمان ہیں سب قابلِ نفرت، لیکن لگتا ہے ان سب کو سانپ سونگھ چکا ہے، ان کی زبانیں گنگ ہیں۔ یہ بولتے نہیں۔ ان کی 67 سال کی محنت پر صرف چند دنوں میں نریندر مودی نے پانی پھیر دیا۔ بولو، لکھو، کچھ منہ سے پھوٹو

جون ایلیا نے کہا تھا

تم مرا ساتھ کیوں نہیں دیتے

آبلے پڑ گئے زبان میں کیا

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر

جرم، قتل و غارت، بھتہ خوری، اغوا، جنسی تشدد، مذہبی منافرت، نسلی خونریزی، یہ سب دنیا میں آباد بڑے بڑے شہروں کے المیے ہیں۔ انسانی تاریخ ایسے شہروں کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے جو اپنے علاقوں میں جرائم کا ہیڈ کوارٹر تھے۔ 1919ء تک نیویارک تمام دنیا میں جرائم کی سب سے بڑی آماجگاہ سمجھا جاتا تھا۔ جس طرح وہ آج دنیا کا معاشی دارالحکومت ہے اسی طرح وہ اس زمانے میں جرائم کا عالمی دارالحکومت تھا۔ جنگ عظیم اوّل کے بعد لندن اور گلاسگو جیسے شہر بڑے بڑے مافیا کے ہاتھوں میں یرغمال تھے۔ امریکہ میں نیویارک اور شکاگو جرم کی کہانیوں کا مرکز تھے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان شہروں میں امن اور قانون کی بالادستی کیسے قائم ہوئی۔ لیوک اوون نے اپنی کتاب (HistoryofCrimeinEngland) "برطانیہ میں جرائم کی تاریخ" میں چار صدیوں پر محیط ایسے ایک معاشرے کی تصویر کشی کی جو مجرموں کے ہاتھ یرغمال ہے۔ یہ تاریخ یورپ میں طاعون کے پھیلنے سے پہلے یعنی 1340ء سے دو دہائیاں قبل سے شروع ہوتی ہے۔ طاعون نے جب یورپ کو اپنی لپیٹ میں لیا تو پھر 1346ء سے 1354ء تک موت کے سائے منڈلاتے رہے۔ ایک اندازے کے مطابق 20 کروڑ لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ یورپ کی تین چوتھائی آبادی مکمل طور پر ختم ہوگئی۔ اوون نے اس طاعون کی وبا سے پہلے کے انگلستان کا نقشہ یوں کھینچا ہے "گھروں کو روز بروز آگ لگادی جاتی" مردوں عورتوں کو یرغمال بنا کر ان سے تاوان کی رقم وصول کی جاتی، تاوان دے کر بھی اگر کوئی فرد کسی خوفناک انجام سے بچ جاتا تو اپنے آپ کو خوش قسمت خیال کرتا۔ جے ایف نکلسن اور جان ٹیلر کے مطابق انگلستان انتہائی خوشحال اور دولت مند تھا، پھر بھی لٹیروں کے گروہ چھوٹی فوجوں کی طرح تھے۔ وہ اکثر شہر کے میلوں ٹھیلوں پر بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑتے۔ وہ شہر پر قبضہ کر لیتے اور گھروں کو لوٹ کر انہیں آگ لگادیتے۔ 1347ء میں برسٹل پر ایک لٹیرے نے قبضہ کر لیا جو بندرگاہ پر لنگر انداز جہازوں کو لوٹتا تھا، جن میں بادشاہ کے حکم پر بننے والے جہاز بھی شامل ہوتے تھے۔ وہ ایک فاتح کی طرح اپنے احکام جاری کرتا تھا۔ اس کے ساتھی شہر میں جہاں چاہتے تھے اور جسے چاہتے لوٹتے اور قتل کرتے تھے۔ چنانچہ بادشاہ کو تھامس اور لارڈ ڈیزبرکلے کو امن قائم کرنے کے لیے بھیجنا پڑا۔ جب ایک تاجر کے متعلق پتہ چلا کہ اس کے پاس ملکہ فلپا کے ہیرے ہیں تو ڈاکوؤں کے ایک گینگ نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ جیسے ہی اس کے گھر کو آگ لگادی گئی، تو اس نے ہیرے ڈاکوؤں کے حوالے کر دیئے۔ عدالتیں بے بس تھیں۔ ایک بدنام لٹیرے کو مانچسٹر کے قریب ایک عدالت میں پیش کیا گیا تو غنڈوں کا ایک گینگ عدالت میں کے باہر منتظر رہا اور عدالت آنے والے ہر شخص پر حملہ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں مقدمہ منسوخ کر دیا گیا" یہ نقشہ صرف اس تاریخ کی کتاب میں نہیں ملتا بلکہ تقریباً ہر اس مورخ نے جرائم کی دنیا کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، جس نے یورپ کے جرائم کی تاریخ مرتب کی۔ ولسن وہلن کی کتاب (Criminal History of Mankind) "انسانی جرائم کی تاریخ" میں تو ایسے تمام شہروں کا تفصیلاً ذکر ہے۔ لیکن تمام مورٔخین اس بات پر متفق ہیں کہ ان شہروں میں جرم کا پھلنا پھولنا دو وجوہات کی وجہ سے ہوتا تھا۔ ایک سرکاری اور سیاسی سرپرستی اور دوسری عوام کی بے رحمانہ اور بزدلانہ خاموشی۔ کسانوں کی فصلیں ان کے کھیتوں سے زبردستی اٹھالی جاتیں اور یہ لوگ دن دیہاڑے یہ کام کرتے، پھر اناج کو ملوں کے پاس لے جاتے تاکہ ان سے پسوائیں۔ ملوں کے مالکوں کو بھی علم ہوتا کہ یہ چوری اور لوٹ کا مال ہے مگر وہ اس لیے انکار نہ کرتے کہ کہیں ان کی ملوں کو آگ نہ لگادی جائے۔ نسلی تعصب کا یہ عالم تھا کہ کسی بھی غیر ملکی کو انگلینڈ میں دیکھ کر اس کا مذاق اڑایا جاتا۔ ایک پرتگالی کا کسی انگریز ملاح سے جھگڑا ہو گیا تو اس کے کان کیلوں سے دیوار میں ٹھونک دیئے گئے۔ جب اس نے انتہائی اذیت سے کان دیوار سے چھڑا لئے تو ہجوم نے اسے چاقوؤں سے وار کر کے مار ڈالا۔

یہ صرف انگلستان کے شہروں کا نقشہ نہیں، بلکہ پورے یورپ کے بڑے بڑے شہر اس طرح کے جرائم کی دلدل میں دھنسے ہوئے تھے۔ خوفناک بات یہ تھی کہ جرائم کرنے والے یا ان کی سرپرستی کرنے والے غریب اور مفلوک الحال نہیں تھے، بلکہ معاشرے کے امیر ترین طبقات میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ یہ زمانہ پوری انسانی تاریخ پر زوال کا دور تھا۔ منگول اپنے حملوں سے دنیا کو تاراج کر رہے تھے۔ پوری دنیا میں طوائف الملوکی تھی۔ منگولوں نے چین فتح کیا تو پوری چینی قوم نے اس کے خلاف لڑنے کی بجائے سر جھکانے میں عافیت سمجھی۔ چین کی زراعت اور تجارت منگولوں کے ہاتھوں مکمل طور پر تباہ ہو گئی اور وہ آفتوں اور مصیبتوں کی زد میں آگیا۔ ایسے میں چنگیز خان اور منگولوں کے دیس کی ایک جھیل ایزک جوان دنوں کرغستان کے علاقے میں واقع ہے وہاں سے پلیگ یعنی طاعون کے جرثومے نے جنم لیا اور پھر یہ منگول فوج کے ساتھ ساتھ یورپ کی جانب روانہ ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب منگول فوج نے کریمیا کے ایک شہر کاما کا محاصرہ کیا تو ان کے ذریعے 1347ء میں پلیگ کی وبا یورپ میں پہنچی۔ یہ جرثومہ شاہراہ ریشم کے ذریعے سفر کرتا استنبول پہنچا، موصل کے شہر پر حملہ آور ہوا، حلب، فلسطین، یروشلم، شام اور دیگر علاقوں میں تھوڑی بہت تباہی پھیلائی لیکن یورپ کا تو عالم یہ تھا کہ پیرس کی آدھی آبادی موت کے گھاٹ اتر گئی۔ فلورنس کی آبادی 1338ء میں ایک لاکھ بیس ہزار تھی جو 1351ء میں صرف پچاس ہزار رہ گئی۔ ہمبرگ میں 60 فیصد آبادی لقمۂ اجل بن گئی۔ جرمنی میں لگ بھگ ایک لاکھ ستر ہزار چھوٹے گاؤں اور قصبے تھے جو 1450ء میں صرف 40 ہزار رہ گئے۔ پلیگ اس قدر تیزی سے پھیلا کہ اس سے پہلے کہ کوئی ڈاکٹر یا حکیم اس کی طرف توجہ دیتا ایک تہائی آبادی موت کے منہ میں جا چکی تھی۔ حیران کن بات یہ ہے کہ طاعون کی اس وبا کو لوگوں نے پھر بھی اسے آسمانی یا خدائی آفت نہ سمجھا اور اپنے رویوں کو درست نہ کیا، جبکہ اکثریت نے اس کا ذمہ دار یہودیوں، بھکاریوں اور غیر ملکیوں کو قرار دے کر ان پر حملے شروع کر دیئے۔ 1348ء میں مینز اور کولون کی یہودی بستیوں کو تباہ برباد کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ کوڑھ کے مریضوں کو زندہ جلادیا گیا، جس شخص کو کسی قسم کی جلدی مرض تھی اسے بھی علاقوں سے باہر لے جا کر قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد یورپ پر تین صدیاں ایسی گزری ہیں کہ بار بار ان پر پلیگ کا حملہ ہوتا رہا۔ دنیا پر آخری حملہ 1855ء سے 1859ء میں ہوا جب صرف ہندوستان میں ایک کروڑ لوگ مارے گئے۔ آپ اس زمانے کے ہندوستان کے حالات ملاحظہ کر لیں تو آپ کو اس عذاب کی وجوہات کا اندازہ خود بخود ہو جائے گا۔

مجھے معلوم ہے کہ میں اس سب کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے سزا اور عذاب کہوں گا تو میرے دوست بڑی آسانی سے جواب دیں گے کہ اس وقت تک میڈیسن اتنی زیادہ ترقی نہیں کر سکی تھی اس لیے اموات زیادہ ہو گئیں۔ انسان جب بھی کسی آفت کا شکار ہوتا ہے تو اس کی سائنسی توجیہہ کر لیتا ہے، لیکن اللہ اس کے ایک آفت پر قابو پانے کے بعد دوسری اس سے بڑی آفت نازل کر دیتا ہے۔ انسان آفتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے، بیماریوں پر قابو پاتا ہے لیکن ایک دوسری آفت اور دوسری بیماری اس کا سامنا کر رہی ہوتی ہے۔ انسان اپنی تدبیروں پر فخر کرتا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ آفت، بیماری اور مصیبت پر قابو پا سکتا ہے، لیکن اسے اس کا اندازہ تک نہیں ہوتا کہ تقدیر نے اس پر یہ آفت اس کے اعمال کے نتیجے میں نازل کی ہے۔ اللہ اپنے عذابوں میں سے ایک عذاب آپس کی خانہ جنگی اور قتل و غارت کو بھی بتاتا ہے "وہ تمہیں مختلف ٹولیوں میں بانٹ کر ایک دوسرے سے لڑا دے اور ایک دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھا دے (الانعام 65) ہم تدبیر سے عذابوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں لیکن اللہ کس امید سے ہمارے نفع ایک اور رویے کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ فرماتا ہے "پھر کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی کہ ایمان لاتی تو اسے اس کا ایمان دیتا سوائے یونس کی قوم کے، جب وہ ایمان لائی تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ان سے ذلت کا عذاب دور کر دیا اور ایک مدت تک بہرہ دنیا کے فوائد سے انہیں بہرہ مند ہونے کا موقع دیا" (یونس: 98) یونس کی قوم اجتماعی استغفار میں چلی گئی تھی اور اللہ نے ان پر اپنا کرم فرمادیا تھا۔ لیکن ہم تدبیر سے تقدیر کو شکست دینا چاہتے ہیں۔ شاید اقبال نے ہماری اسی حالت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات

[illegible] یاد آؤں گا (1)

امام مسجد کی بیٹی' امام مسجد کی بہو' میں زندگی بھر اپنی ماں کے بارے میں یہی سوچتا رہا کہ کوئی اس قدر صابر و شاکر زندگی بھی گزار سکتا ہے کہ انتہائی عسرت' تنگدستی اور بیماری میں بھی ایک حرفِ شکایت زبان پر نہ آئے' نہ دنیا کی بے مروتی کا کوئی گلہ اور نہ پروردگار عالم سے کوئی شکوہ۔ مسجد کے منبر و محراب اور راہداریوں کے اردگرد پلنے والوں کو شاید درس ہی صبر اور شکر کا ملتا ہے۔ مسجد بھی ایک چھوٹے سے گاؤں چک نمبر 155 کی جسے پنواں کہتے ہیں۔ والد کا خط پر لکھا ہوا پتہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ پنواں' ڈاکخانہ خاص' براستہ چک جھمرہ' لائل پور۔ نہروں کا جال بچھایا جانے لگا تو میرے نانا کے سسر حافظ محمد اسحاق کو ان کے والد جوان کے مرشد بھی تھے' انہوں نے حکم دیا' کھیت کھلیان بعد میں' پہلے وہاں اللہ کے گھر کی بنیاد رکھو۔ وہ درویش علی پور سیداں سے بوریا بستر سمیٹ کر اس بے آباد جنگل نما علاقے میں آ بسا۔ دور تک پھیلے کیکر اور ببول کے درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان تھوڑی جگہ صاف کی' کچی اینٹوں کا فرش بنایا' ایک چھوٹے سے چبوترے پر کھڑے ہو کر اذان دی اور لوگوں کو اللہ کے گھر کی جانب بلانے لگا۔ ساتھ ہی اپنے رہنے کے لئے ایک گھر بنایا جس کا ایک چھوٹا سا دروازہ مسجد کی پہلی صف کے آخر میں کھلتا تھا۔ 25 اکتوبر 1936ء کو دنیا سے رخصت ہوئے تو گاؤں اور مسجد کی آبادی بہت بڑھ چکی تھی۔ گاؤں والوں نے مسجد کے برابر دفن کر دیا اور ان کے داماد مولوی احمد حسن صدیقی جو اس وقت ایک سکول میں استاد تھا' اسے حافظ محمد اسحاق کی یہ وصیت سنائی کہ اللہ نے مجھے کوئی بیٹا دیا ہوتا تو اسے حکم دیتا کہ سب دنیاداری چھوڑ کر مسجد کو آباد رکھنے کا فریضہ سرانجام دے' لیکن تم داماد ہو اس لئے تم سے درخواست ہے۔ داماد نے سر تسلیم خم کیا' چنوکی کے سکول میں نوکری چھوڑی' میری ماں سمیت پانچ اولادوں اور اپنی بیوی کو لے کر مسجد کی بغل میں بنے گھر میں آباد ہو گئے۔ میری ماں اور ان کا بھائی سکول میں تھے' فوراً ان کے بستے سمیٹے اور روانہ ہو گئے۔ ایک ایسے گاؤں کی سمت جہاں نہ سکول اور نہ ہسپتال۔ اپنے بچوں کو خود گھر پہ پڑھانا شروع کر دیا۔ دیئے کی روشنی' ستاروں کی چھاؤں' بیلوں کی گھنٹیوں کی آوازیں' چکی کی گھرر گھرر کی صدائیں اور پرندوں کے غول' یہ سب کچھ میں نے اپنے بچپن میں بھی اس گاؤں میں دیکھا ہے۔ لگتا تھا سب کچھ اس جگہ آ کر تھم سا گیا ہے۔ 1936ء میں بھی ایسا ہی ہو گا۔ والدہ تقریباً دس سال کی ہوئیں تو اللہ نے ان کی ماں کو اپنے پاس بلا لیا۔ ایک بھائی اور تین چھوٹی بہنیں۔ نانا نے میری ماں سے کہا بیٹا' یہ گھر اب تم ہی سنبھالو گی۔ چھوٹی سی یتیم بچی نے دوپٹہ سر کے گرد کس کر باندھا اور جو اس کی ماں روز کیا کرتی تھی وہ سب کرنے لگی۔ بھینسوں کا دودھ دھونا' لسی بلو کر مکھن نکالنا' اوپلے تھاپنا' آگ جلا کر کھانا پکانا' ساتھ بہتے پانی کے راجباہ سے پانی لانا' چاول چھڑنا' روئی کو چرخے پر کاتنا اور گھر میں آئی ہوئی بچیوں کو قرآن پڑھانا لیکن اللہ نے اس صابر و شاکر عورت کے بہت سے امتحان لینا تھے۔ اس زمانے میں کوئی بیمار پڑتا تو دور دور تک ہسپتال نہ تھا۔ حکیم کی دوا اور باقی اللہ سے دعا کے سوا اور کوئی وسیلہ نہ تھا۔ پہلے بڑا بھائی بیمار ہوا اور دیکھتے دیکھتے قبر میں اتر گیا اور پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے تینوں بہنیں' وہ بہنیں جنہیں اپنے ہاتھ سے پالا تھا۔ نانا نے دوسری شادی کی' اللہ نے پھر دو بھائی محبت کے لئے دے دیئے لیکن ایک اور درویش صفت انسان کا گھر میری ماں کے صبر آزما سفر کا انتظار کر رہا تھا۔ امرتسر کی جامع مسجد خیر دین کے خطیب مولوی خدا بخش کا بیٹا مقبول احمد عباسی' چھ ماہ کا تھا کہ 1908ء میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ میری دادی نے گوٹا بن کر اولاد کو پڑھایا۔ پاکستان ہجرت کی تو کلیم داخل کرانے والوں نے میرے والد سے پوچھا کوئی گھر تھا وہاں' کہا ہاں تھا' کہنے لگے لکھ کر دے تاکہ تمہیں اچھا سا گھر الاٹ کر دیں۔ بولے وہ میرا تو نہ تھا' وہ تو مسجد کا تھا۔ آفیسر کے زور دیتے ہوئے کہا' لکھ دو سب ایسے ہی لکھ رہے ہیں۔ کہنے لگے یہ تو جھوٹ ہے اور پھر کرایے کے گھر میں اٹھ آئے اور دنیا سے جاتے ہوئے بھی ایک انچ ٹکڑا زمین ترکے میں نہ چھوڑی۔ کس قدر آسان سفر ہوتا ہے ایسے لوگوں کا کہ دنیا سے جاتے ہیں تو کاندھوں پر کوئی بوجھ تک نہیں ہوتا۔ تین سال ماں کی خدمت میں شادی نہ کی' ایک دن ماں نے مجبور کیا تو دونوں ماں بیٹا چک نمبر 155' پنواں پہنچے اور 13 اپریل 1955ء کو میری ماں کو بیاہ لائے۔ بائیس سال کا فرق' لیکن گاؤں کی زندگی سے شہر کی خوشحالی۔ سرکاری ملازمت' اباجی میونسپل کمیٹی لائل پور میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ رزق حلال کی دولت سے مالا مال میرا گھر میری ماں کے لئے اجنبی نہ تھا' اسے تو ایسی عسرت اور تنگدستی میں زندگی گزارنے کی عادت تھی۔ یہاں تو تھوڑی سی خوشحالی بھی ساتھ تھی۔ اباجی گجرات میونسپل کمیٹی آ گئے۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوتیں تو وہ ہمیں وزیر آباد کے ریلوے اسٹیشن سے ٹرین پر بٹھاتے اور نانا چک جھمرہ اتار لیتے۔ ایک سال ہم پنواں جاتے اور دوسرے سال ہم جھنگ' جہاں ہمارے تایا ڈاکٹر تھے۔ بس ہمارے لیے یہی دو صحت افزا مقام تھے۔ شادی کے تیرہ سال بعد اباجی ریٹائرڈ ہو گئے۔ میں اس وقت صرف بارہ سال کا تھا اور ہم آٹھ بہن بھائی تھے۔ اب میری ماں کی وہ ٹریننگ کام آنا شروع ہوئی کہ کیسے عسرت و تنگدستی میں گھر کو چلایا جاتا ہے اور کیسے ان تھوڑی سی نعمتوں پر بھی اللہ کا ایسے شکر ادا کیا جاتا ہے جیسے دو جہان کی نعمتیں میسر آ گئی ہوں۔ مٹی کے تیل کا چولہا آسان تھا لیکن خرچ زیادہ' امی نے برادے والی انگیٹھی پر کھانا پکانا شروع کر دیا اور بہانہ یہ لگایا کہ تیل کی بدبو روٹیوں میں آ جاتی ہے۔ میں کالج داخل ہوا۔ یونیفارم کی پینٹ سلوانا تھی۔ امی کو مردانہ کپڑے سینا نہیں آتے تھے۔ پڑوس میں محمد حسین برف والے کی بیٹی پینٹ اور ٹی شرٹ سی لیتی تھیں۔ امی نے تین دن میں اس سے سب سیکھ لیا اور پھر ہمارے گھر میں ہم بھائیوں کے کپڑے بھی سیے جانے لگے۔ تنخواہ بہت کم تھی تو اماں لنڈے جاتیں اور ایک ڈھیر بڑی بڑی شرٹوں اور پینٹوں کا لے آتیں اور پھر انہیں خود چھوٹا کر کے نئے سرے سے ہمیں سی دیتیں۔ لنڈے سے سویٹر لاتیں' انہیں ادھیڑ کر اون کے گولے بناتیں اور پھر خود سلائیوں سے کر سویٹر بن دیتیں کہ کہیں میرے بیٹوں کو لوگ یہ نہ کہیں کہ لنڈے کے کپڑے پہن کر آئے ہیں۔ خشک روٹی کے ٹکڑے' پرانے جوتے اور ردی اخبار اور بوتلیں جمع کرتی جاتیں۔ جب کافی ہو جاتیں تو گلی میں آنے والے ہرکارے کو بیچتیں اور چند گلاس' چائے والے پیالے یا کھانے کی پلیٹیں لے لیتیں۔ یہ سب برتن تو مہمانوں کے لئے ہوتے۔ ہمارے لئے سلور اور سٹیل کے برتن کہ جنہیں وہ روز دھو کر ایسے چمکاتیں کہ نئے معلوم ہوتے۔ اباجی کے کپڑے خود سیتیں' وہ عموماً سفید شلوار قمیض پہنتے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے دھوبی کے پاس صرف انہی کے کپڑے جاتے جو کلف لگا کر آتے۔ امی نے کلف لگانا بھی سیکھ لیا۔ اباجی نے کہا رہنے دو' دھوبی کے پاس دے آتا ہوں' کہنے لگیں پتھر پر مار مار کر دھوتا ہے' کپڑے کی ساری آن بان ختم ہو جاتی ہے۔ ریٹائرمنٹ ہوئی تو اباجی کی پنشن ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ کوئی نئی نوکری بھی نہ تھی۔ اس زمانے میں شادی کے جوڑوں کے دوپٹوں پر اصلی چاندی کا گوٹہ لگا ہوتا' امی نے اتارا' اسے آگ میں جلایا اور ساتھ ساتھ اباجی کو تسلیاں دیتی جاتیں' اب میری عمر تھوڑی رہ گئی ہے ایسے کپڑے پہننے کی۔ گوٹا بازار میں بکنے لگا۔ گوٹا ختم ہو گیا' پنشن شروع نہ ہوئی اور ادھر سب کی پڑھائی سر پر۔ گھر میں پرانی کورس کی کتابیں نکالیں' لئی بنائی' سب گھر والے ان کے لفافے بناتے اور میں اور میرا بھائی انہیں دکانوں پر بیچ آتے۔ ایک دن میں بازار گیا تو سب نے کہا کہ ابھی ہمارے پاس لفافے ہیں۔ میں مایوس واپس لوٹا تو میرے متوکل باپ نے کہا' آج اللہ خود کوئی بندوبست کر دے گا۔ ایک گھنٹے بعد ڈاکیا منی آرڈر لے کر آ گیا کہ پنشن آ گئی ہے۔ میری خطاطی اچھی تھی' میٹرک کے بعد لوگوں نے آباجی کو مشورہ دیا کہ اسے سائن بورڈ لکھنے کا کام سکھائیں تاکہ آپ کے لئے آمدن کا ذریعہ بنے۔ والد مجھے ظفریاد پینٹر کے پاس چھوڑ آئے۔ اس رات میں نے پہلی دفعہ اپنی اس سرتاپا ادب اور خدمت ماں کو اپنے باپ سے گلہ کرتے دیکھا۔ امی کا زیور جو چند ڈبے تھے' سامنے پڑے تھے اور میرے والد انہیں بار بار بند کرتے جاتے کہ رکھو اپنے پاس' اللہ بندوبست کر دے گا' جائے گا یہ کالج۔

(جاری ہے)

اب [illegible] یاد آؤں گا (آخری حصہ)

امی نے اپنے چند ڈبے زیورات ایک بڑے سے ٹرنک میں واپس رکھ لیے اور اباجی حسب معمول اپنی تسبیح اٹھا کر چھت پر چلے گئے۔ ان کا معمول تھا کہ رات دیر گئے چھت پر بچھے ایک کھجور کے تنکوں والے م ص "لے پر لیٹے تسبیح ہاتھ میں گھماتے اور ستاروں کی گردشوں میں کھوئے رہتے۔ کبھی کبھی میں نے اپنے والد کو طویل سجدوں میں روتے اور اللہ سے دیر تک گفتگو کرتے دیکھا۔ وہ اپنی دن بھر کی کہانیاں میری ماں کو آکر سناتے جو اس دوران اسی چھوٹے سے صحن میں کبھی کپڑے دھو رہی ہوتی' کھانا پکانے میں مصروف ہوتی یا پھر ہمارے کپڑوں کی پیوند کاری میں مگن' مگر رات کو اللہ سے گفتگو میں ان کی باتیں کچھ اور ہوتیں جو میرے پلے نہ پڑتیں۔ میٹرک کے بعد کا یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے ہر قسم کی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ایک تو فراغت اور دوسرا گھر کے نزدیک میونسپل کمیٹی کی کنگز لائبریری تھی۔ امام مسجد کے نواسے اور پوتے کے دل میں الحاد نے جنم لینا شروع کیا تو میری ماں پریشان ہو گئی۔ بارہ سال کی عمر' جو پڑھتا ذہن پہ نقش ہو جاتا اور امی کے سامنے آکر اگل دیتا۔ وہ مجھے حیرت سے تکتی رہتیں۔ اسی دوران میں نے دیکھا امی پریشان سی رہنے لگی ہیں۔ تسبیح اب ان کے ہاتھ میں بھی آگئی تھی۔ نہیں معلوم کیا کچھ پڑھتیں اور پھر ایک گلاس پانی پر پھونک مار کر مجھے پینے کو دیتیں۔ دہریت کا خمار چڑھے تو آدمی ایسی تمام چیزوں کے اثرات پر یقین کھو دیتا ہے۔ میں پانی پی لیتا اور مسکراتے ہوئے امی سے کہتا' امی آپ اتنی محنت کیوں کرتی ہیں' ان چیزوں کا کوئی اثر تھوڑا ہوتا ہے۔ امی سمجھتیں مجھ پر کوئی آسیب آگیا ہے۔ کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ دیکھو اللہ کو ہی نہیں مانتا۔ والد سے شکوہ کرتیں تو وہ خاموشی سے مسکرا دیتے۔ بس اتنا کہتے' کہیں نہیں جاتا' بھاگنے دو اسے جتنا چاہے بھاگ لے' واپس آئے گا' میں نے اسے درود شریف کی لوریاں دے کر پالا ہے۔ لیکن ماں کے دل کو قرار کہاں۔ ایک دن مجھے ساتھ لیا' بس پر سوار ہوئیں اور گکھڑ کے قریب ایک گاؤں میں لے گئیں جہاں ایک بابا' جادو' نظر اور جنات کا علاج کرتا تھا۔ عورتوں کا ایک ہجوم اس کی چارپائی کے اردگرد اور وہ چادر تان کر لیٹا ہوا۔ اچانک اس کے اندر کوئی روح حلول کرتی اور وہ موٹی موٹی آواز میں بولنے لگتا' ہر کوئی اپنی حاجت بیان کرتا' وہ ایک مہنگا سا نسخہ بتاتا' لوگ ساتھ کھڑے آدمی کو پیسے دیتے اور باہر چلے جاتے۔ میں نے دیکھا امی یقین و بے یقینی کے عالم میں آگئیں ہیں۔ سب دیکھ کر باہر نکل آئیں' بس پر سوار ہوئیں اور مجھے لے کر گھر آگئیں۔ سارا رستہ چپ۔ گھر آئیں اور بس اتنا کہا' ایسا مت ہو جانا کہ نانا دادا اپنی قبروں میں شرمندہ ہو جائیں۔

میں کالج داخل ہو گیا۔ اباجی نے گجرات سے بیس کلو میٹر کے فاصلے پر وزیر آباد کے نزدیک ایک فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ بڑھاپا' روزانہ دو بسیں بدل کر دفتر پہنچنا' بیمار ہوئے' میری صابر و شاکر ماں نے صرف اتنا کہا' ہمیں آپ کا سایہ سر پر چاہیے' رزق تو اللہ دیتا ہے۔ اللہ کچھ لوگوں کے فقرے عرش معلی تک جانے سے پہلے ہی قبول کر لیتا ہے۔ میری ماں نے یہ فقرے منہ سے نکالے ہی تھے کہ درسی ادارہ گجرات کے یونس بٹ نے گھر کے دروازے پر دستک دی' ان کے ساتھ ان کے بڑے بھائی صادق بٹ بھی تھے۔ کہنے لگے ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔ درسی ادارے کا اکاؤنٹنٹ چھوڑ کر چلا گیا ہے' آپ وہاں آجائیں۔ یہ ادارہ میرے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ زندگی کسی حد تک ڈگر پر آچکی تھی' لیکن پھر بھی تنخواہ قلیل تھی اور اب تو ہم آٹھوں بہن بھائی کالج اور سکول جانے لگے تھے۔ گھروں کے کرائے بڑھنے لگے تھے اور ہر چند سالوں بعد جب کوئی مالک مکان کرایہ بڑھانے کو کہتا تو ہم مزید چھوٹے گھر میں منتقل ہو جاتے۔ ایک دفعہ ہم شاہدولہ روڈ پر منتقل ہوئے۔ یہ جگہ ذرا دور تھی۔ ہمارا سامان گدھا گاڑیوں پر منتقل ہوا۔ اس دوران وہ سارے برتن جو امی نے سوکھے ٹکڑے' پرانے جوتے اور کپڑے دے کر خریدے تھے' ٹوٹ گئے۔ برتنوں کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر پھینکتی جاتیں اور کہتیں' چونکہ اب ہمارے گھر کوئی مہمان ہی نہیں آتا' اس لئے اللہ نے یہ فالتو برتن بھی ہم سے لے لیے۔ تسلیم و رضا کی کونسی ایسی منزل ہے جو میں نے اپنی ماں سے نہ سیکھی ہو۔ ہر حال میں خوش رہنا' ہر بڑے سے بڑے نقصان میں اللہ کی جانب سے حکمت اور خیر کا پہلو نکالنا۔ دست سوال تو بہت دور کی بات ہے' بندوں کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار تک نہ کرنا۔ ہم سب بہن بھائیوں کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے وافر رزق اور نعمتوں سے نوازا ہے۔ گزشتہ چھتیس سال سے میں نوکری کر رہا ہوں۔ ان چھتیس سالوں میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں کہ میری ماں نے کبھی مجھ سے کوئی فرمائش کی ہو' کسی لباس' آسائش کا سامان' یہاں تک کہ کسی موسم کے پھل کی بھی۔ یہ صرف میرے ساتھ ہی نہیں' کسی بہن بھائی سے بھی انہوں نے کوئی فرمائش نہ کی۔

کالج کے موسم کی ہوا میں آوارہ گردی کے جراثیم ہوتے ہیں۔ چھوٹے شہروں میں شام ڈھلے منڈلیاں لگنا شروع ہوتی ہیں۔ ٹیلی ویژن نے یہ سب ختم کر دیا تھا لیکن ہمارے گھر میں تو ٹیلی ویژن تھا ہی نہیں۔ ایک ریڈیو تھا جو اباجی کے پلنگ کے ساتھ طاق میں پڑا رہتا۔ شام کو چھت پر جا کر اس کا ایریل سیدھا کرنا میری ذمہ داری ہوتی۔ میں نے رات دیر سے گھر آنا شروع کر دیا۔ والد ناراض تھے' لیکن امی مجھے ان کی ڈانٹ سے بچا لیتیں۔ ان کی ناراضگی کا اظہار یہ تھا کہ وہ خود اٹھ کر دروازہ نہ کھولتے' میرے دروازہ کھٹکھٹانے پر آواز آتی' آگیا ہے تمہارا لاڈلا۔ امی دروازہ کھولتیں اور اس وقت چولہا جلا کر روٹی پکا کر دیتیں۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ میری لیے پکا کر رکھ دی ہوں۔ امی کی آنکھ سے میں نے ان تمام مصائب و آلام میں کبھی آنسو بہتے نہیں دیکھے۔ البتہ اتوار کی شام وہ اپنا تمام کام جلد سمیٹ کر میرے والد کی پائینتی آکر بیٹھ جاتیں۔ ریڈیو سے بانو قدسیہ کا ڈرامہ آتا۔ امی پورے ڈرامے کے دوران آنسو بہاتی رہتیں۔ مجھے بانو قدسیہ پر بہت غصہ آتا کہ یہ کیسی عورت ہے جو میری ماں کو ہر ہفتے رلاتی ہے۔ جب بانو آپا سے ملاقات ہوئی تو میں نے یہ گلہ کیا۔ کہنے لگیں اگر تمہاری ماں میرے ڈراموں کے بہانے نہ روتیں تو تم لوگوں کو صبر اور شکر کے معنی کیسے پتہ چلتے۔

پنجاب یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ ہاسٹل میں رہنا۔ اخراجات کا طوفان۔ میرے والد ہر ماہ لاہور آتے اور مجھے دو سو روپے دے جاتے۔ باقی میں اخبار میں مضامین لکھ کر پورا کرتا۔ مجھے حیرانی ہوتی جس شخص کی تنخواہ ڈھائی سو روپے ہے وہ دو سو روپے مجھے دے کر باقی بچوں کو کیسے پالتا ہے۔ لیکن میرے متوکل باپ نے کبھی یہ عقدہ مجھ پر نہ کھولا۔ بلوچستان یونیورسٹی میں استاد ہو گیا۔ یونیورسٹی میں گھر ملا۔ میں نے امی سے کہا کہ سب بہن بھائیوں اور اباجی کو ساتھ لے کر میرے پاس آجائیں۔ بولیں یہ اولاد اللہ نے ہمیں پالنے کے لئے دی ہے' تمہیں نہیں۔ یہ ہمارا بوجھ ہے۔ سختی سے منع کر دیا اور اپنی روزمرہ معمولات میں مصروف ہو گئیں۔ سول سروس کا امتحان پاس کیا' اکیڈمی جانے سے پہلے گجرات اباجی اور امی کے پاس گیا۔ اباجی بہت خوش تھے۔ گلے ملے تو دیر تک درود پاک کا ورد کرتے رہے۔ امی ساتھ کھڑی تھیں۔ کہنے لگیں یہ نوکری صحیح ہے' لیکن مجھے تو تمہارے پیدا ہونے سے پہلے خواب میں کچھ اور دکھایا گیا تھا۔ میں نے کریدا۔ پورا خواب بیان کیا تو میں نے کہا' امی یہ تو بہت بڑی منزل ہے' بڑی آزمائش ہے' بہت کٹھن راستہ ہے۔ میری ماں نے زندگی کا نچوڑ میرے سامنے رکھ دیا۔ کہنے لگیں۔ کیا ہم خود رستہ منتخب کرتے ہیں' خود اس پر چلتے ہیں۔ جو اللہ اس راستے پر ڈالتا' اس پر چلنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔

اچھے دن آگئے' امی کو بیٹیاں بھی ایسی ملیں کہ انہیں ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھتیں۔ خدمت میں حد سے گزر جانے والی۔ لیکن امی کے لباس سے سادگی گئی اور نہ رہن سہن میں بناوٹ آئی۔ 1999ء میں اباجی چلے گئے۔ وہ اباجی جن کی زندگی سے میں نے ایک عشق سیکھا اور وہ تھا عشق رسولؐ۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آتا تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی' حالت غیر ہو جاتی' کبھی کبھی تو ہچکیوں کی آواز اتنی بلند ہوتی کہ امی آکر سنبھالتیں اور کہتیں' پڑوس میں آواز جائے گی۔ مدینے جانے کی خواہش ان کے دل میں مچلتی تھی۔ ہمارے حالات بہتر ہوئے تو ان کی صحت نے وہاں جانے کی اجازت نہ دی۔ میں عمرے پر گیا' واپس آیا میں نے کہا کہ آپ کا سلام روضہ رسولؐ کے سامنے عرض کر دیا تھا' گھنٹوں روتے رہے اور اس دن کے بعد سے مجھے اور یا صاحب کہنے لگے کہ میں مدینے سے ہو کر آیا ہوں۔ 2010ء میں امی کو عمرے پر لے کر گیا۔ مکے سے مدینہ جانے سے پہلے مجھے ایک جانب لے گئیں اور کہنے لگیں تمہارے باپ کو مدینے جانے کا کتنا شوق تھا' ہر ماہ تھوڑے سے پیسے جمع کرتے' میں خرچ کروا دیتی۔ پنشن آئی' اکٹھے دس ہزار روپے ملے' بہت خوش تھے کہ اب تو مدینے سے بلاوا آہی گیا ہے لیکن میں نے سارے پیسے تیری پڑھائی پر لگوا دیئے۔

عدالتی نظام کی بے بسی اور عدالت الٰہی

یوں لگتا ہے کہ پاکستان میں سب سے بے بس، کمزور، لاچار اور بے اختیار عدالتی نظام ہے۔اس نظام کے سامنے روز ایسے ملزم پیش ہوتے ہیں جن کے بارے میں ججوں کو سو فیصد یقین ہوتا ہے کہ ان سے جرم سرزد ہوا ہے لیکن وہ انہیں سزا نہیں دے سکتے۔کہتے ہیں اس کے خلاف صفحۂ مثل پر کچھ نہیں، ہم سزا کیسے دیں۔یہ صرف چند ہفتے پہلے کی بات ہے کہ مشہور ممبر قومی اسمبلی اس بنیاد پر نااہل قرار دے دیا گیا کہ اس کی ڈگری جعلی ہے۔موصوف ایک ٹیلی ویژن پروگرام میں پیش تھے۔اینکر نے سوال پوچھا، آپ نے کس مضمون میں ایم اے کیا ہے۔کہنے لگے یار تیرہ چودہ سال پرانی بات ہے، اب یاد تھوڑا رہتا ہے۔اینکر کے بار بار اصرار کرنے پر بتایا کہ اتنا یاد ہے کہ میں نے ایم اے آرٹس کے مضمون میں کیا ہے۔یہ اینکر اگر مزید دو تین سوال اور کرتا تو پاکستان بھر میں مناسب سی تعلیم رکھنے والا شخص بھی یہ فیصلہ کر سکتا تھا کہ اس ممبر اسمبلی کی ایم اے کی ڈگری جعلی ہے۔ لیکن کس قدر بے بس ہے ہمارا عدالتی نظام کہ موصوف کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے اس کے مضمون کے مطابق چند سوال پوچھ کر یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس کی ڈگری جعلی ہے۔اس کا یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر ہم نے ایسا کرنا شروع کر دیا تو پھر ایک لائن لگ جائے گی۔ یعنی آپ اس خوف سے درست فیصلہ نہیں کرتے کہ آپ کو ایسے ہزاروں درست فیصلے کرنا پڑ جائیں گے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ڈگری تصدیق کرنے والے محکمے کے پاس بھیجو، تصدیق کر دے تو مان لو بے شک سامنے کھڑا شخص جاہل مطلق ہی کیوں نہ نظر آرہا ہو۔ایسا بہت کچھ روز عدالت کے سامنے ہو رہا ہوتا ہے۔ قانون میں ایک لفظ ”alibi“ ایلی بائی ہے جس کا مطلب ہے کہ فلاں شخص جس پر قتل یا کسی اور جرم کے ارتکاب کا الزام ہے وہ تو موقع پر موجود ہی نہیں تھا۔روزانہ عدالتوں میں جعلی سرٹیفکیٹ پیش ہوتے ہیں، جعلی جہاز کی ٹکٹیں اور بورڈنگ پاس دکھائے جاتے ہیں، کئی دفعہ تو یوں ہوتا ہے کہ کسی کرائے کے پیشہ ور قاتل کی گرفتاری ڈالی جاتی ہے، پھر اسے خاموشی سے چند گھنٹوں کے لیے حوالات سے نکالا جاتا ہے۔وہ قتل کر کے واپس حوالات آجاتا ہے۔ موقع پر دس لوگ موجود ہوں، وہ سب کے سب گواہی دیں، لیکن کس قدر بے بسی ہے عدالت کی کہ وہ صفحۂ مثل پر آئی ہوئی اس alibi پر خود تحقیق کا آغاز نہیں کر سکتی۔

روزانہ عدالت کے روبرو پیش ہونے والے گواہوں کو کہیں پیسے دیکر اور کہیں ڈرا دھمکا کر بیان بدلنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔اسے بیرون از عدالت تصفیہ بھی کہتے ہیں۔اکثر بااثر قاتل گھرانے کے لوگ مقتول کے گھرانے کو دھونس، جبر یا پھر ان کی غربت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سرمائے کا استعمال کر کے گواہوں کو بٹھاتے ہیں اور عدالت کس قدر بے بس ہو جاتی ہے کہ اس کو علم بھی ہو کہ اس شخص نے قتل کیا ہے، وہ اسے باعزت بری کر دیتی ہے۔ پاکستان کی جیلوں میں روزانہ ایسے ہزاروں افراد قید کر دیے جاتے ہیں جن کا نام دشمنی کی بنیاد پر ایف آئی آر میں لکھا جاتا ہے۔ چالان پیش ہونے تک یہ عدالت کی دسترس میں نہیں آپاتے، البتہ عدالتیں ہی انہیں ریمانڈ بھی دے رہی ہوتی ہیں۔اگر کسی طرح ان بے گناہوں کے خلاف چالان بھی مکمل ہو جائے تو مقدمے کی آخری عدالت کی فیصلے کی بنیاد پر پھانسی پر بھی جھول جاتے ہیں۔ایک دندناتے ہوئے مجرم کا عدالت کے ہاتھوں سے نکل جانا اور ایک بے گناہ کا سزا پا جانا ہمارے عدالتی نظام پر ایک سوال ہے جس کا جواب کوئی تلاش نہیں کرتا۔البتہ اس عدالتی نظام کو مضبوط کرنے کے خواہش مند آپ کو ہر طبقۂ خیال میں ملیں گے۔عدلیہ کی آزادی پر گھنٹوں دلائل دینے والوں میں وکیلوں کی فوج ظفر موج سے لے کر دانشور، سیاست دان اور صحافی سب شامل ہیں۔ان سب کے سامنے گزشتہ دنوں سرمایہ اور طاقت کے نشے میں دھت بااثر لوگوں کی اولادوں نے قتل کیے۔ میڈیا کی چکا چوند روشنی میں مائیں اپنے لخت جگر کا ماتم کرتی نظر آئیں۔لوگ باقاعدہ قاتلوں کی نشاندہی کرتے رہے۔کراچی میں شاہ زیب اور لاہور میں زین کا قتل ایسے روز روشن کی طرح واضح حقیقتوں میں سے تھے کہ ان میں مجرم کا بچ نکلنا کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ حیرت کی بات ہے زین کے قتل کے وقت وہ تمام گواہان جو انگلیاں اٹھا کر صدیق کانجو کے بیٹے مصطفٰی کانجو کی فائرنگ کو زین کے قتل کی وجہ بتاتے تھے عدالت میں پلٹ گئے جیسے یہ سب ہوا ہی نہیں تھا۔اب فیصلہ یوں ہے کہ وہاں گولیاں بھی چلیں، آپس میں لڑائی بھی ہوئی، سنسناتی گولی زین کے سینے میں اتری لیکن ان تمام لوگوں کی موجودگی کے باوجود عدالت کے سامنے یہ ثابت نہ ہو سکا کہ کس کی گولی زین کو موت کے گھاٹ اتار گئی۔سب باعزت بری۔یہ ہے ہمارے عدالتی نظام کی بے بسی۔

لیکن میرا المیہ یہ نہیں ہے کہ اس عدالتی نظام کا ماتم کروں جسے اینگلو سیکسن قانون کہتے ہیں اور جسے ہمارا آئین تحفظ دیتا ہے۔ میرا ماتم یہ ہے کہ یہی آئین اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ اس ملک میں کوئی قانون قرآن وسنت کے منافی نہیں بنایا جاسکتا۔اس اینگلو سیکسن قانون کے تحت اگر روز گواہ بیٹھ جائیں اور مجرم عدالت سے باعزت بری ہو جائے تو کوئی اس نظام پر انگلی نہیں اٹھاتا۔ لیکن اس ملک میں اللہ کے بتائے ہوئے اس اصول قصاص و دیت کے تحت اگر کوئی وارث اپنے مقتول کے قاتل کو معاف کر دے تو اخبارات کے صفحے اس قانون کے خلاف کالے ہونے لگتے ہیں۔رات کو ٹاک شوز میں دانشور اسلام کے اس قانون کے خلاف آستین چڑھا لیتے ہیں، صدیوں سے پاکستان کے قبائلی معاشرے میں یہ اصول رائج ہے کہ جب جرگہ کسی قتل کا فیصلہ کرنے بیٹھتا ہے تو وہ یہ طے کر لیتے ہیں کہ ہم قتل کے بدلے قتل کروا کر دشمنی کو مزید ہوا نہیں دینا چاہتے۔اس لیے خوں بہا لے کر صلح اور امن کی رسم کا آغاز کیا جائے۔ اسلام کے اس بنیادی اصول کو اپناتے ہوئے انہوں نے صدیوں پرانی دشمنیوں کو ختم کیا۔ لیکن ہم وہ بد قسمت ”پڑھے لکھے“ لوگ ہیں جو ایسے عدالتی نظام کا دفاع کرتے ہیں جہاں دھونس، دباؤ اور لالچ سے عدالت کے سامنے جھوٹ بول کر قاتل کو چھڑا لیا جائے لیکن اسلام کے اصولوں کے تحت کسی کو معاف کر کے دنیا میں امن اور آخرت میں اجر عظیم کا سودا نہیں کرنے دیتے۔

ہماری منافقت اور اسلام سے دشمنی کا یہ عالم ہے کہ روزانہ ہزاروں بے گناہ غلط ایف آئی آر درج ہونے کی وجہ سے جیل میں پھینک دیے جاتے ہیں لیکن کسی وکیل، انسانی حقوق کے چیمپئن یا این جی او کے کرتا دھرتا نے یہ آواز نہیں اٹھائی کہ پاکستان کے ضابطہ فوجداری میں ترمیم کی جائے اور اس وقت تک کسی کو گرفتار نہ کیا جائے جب تک تفتیش مکمل نہ ہو جائے۔انسانی حقوق کے علمبرداروں کو آج تک ایسے ہزاروں لوگ نظر نہیں آئے جو صرف ایف آئی آر میں نام درج ہونے کی وجہ سے سالوں جیل میں سڑتے رہتے ہیں۔ لیکن جیسے اسی ضابطۂ فوجداری کی وجہ سے توہین رسالت کا مقدمہ درج ہوتا ہے تو سب کی آنکھیں غصے سے ابلنے لگتی ہیں۔ہر کوئی الفاظ کے تیر لے کر سامنے آجاتا ہے۔ کسی میں اتنی جرأت تو ہے نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی توہین کو جرم قرار نہ دے، اسے کبھی آمر کا بنایا ہوا قانون کہہ کر بات کی جاتی ہے اور کبھی کہا جاتا ہے کہ ضابطہ فوجداری کا قانون بدل دیا جائے۔ ہزاروں بے گناہ مجرم جیل کی سلاخوں کے پیچھے اس نظام کی بھینٹ چڑھ رہے ہوتے لیکن سب کو توہین رسالت کے مجرم ہی مظلوم نظر آتے ہیں لیکن جیلوں میں موجود ہزاروں بے گناہ یاد نہیں آتے۔ صرف وہی لوگ یاد آتے ہیں جن پر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی توہین کا الزام تھا۔کیا ایسا کرنا بذات خود توہین رسالت کی سزا کا تمسخر اڑانا نہیں ہے۔ کس نے قانون کو ہاتھ میں لیا اور کون بے گناہ مارا گیا، کس پر الزام جھوٹا اور کون عالمی ایجنڈے پر اس قانون کے خلاف بول رہا تھا، یہ سب کچھ سپریم کورٹ اور پاکستان کے بے بس عدالتی نظام میں زیر بحث آتا ہے۔ فیصلے ہوتے ہیں لیکن ایک عدالت اس سے بالاتر ہے۔ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم و آلہ وسلم بازار سے گزر رہے تھے کہ مکہ کے لوگوں نے اشارہ بازی شروع کی اور کہا یہ شخص کہتا ہے کہ اس کے پاس جبریل آتا ہے (نعوذ باللہ) جبرائیل علیہ السلام خود شریف لائے اور ان کی جانب انگلی کا اشارہ کیا تو ان کے جسم سے خون بہنے لگا اور ایسی بدبو آئی کہ ان کے قریب کوئی نہ جاتا تھا (طبرانی الاوسط)۔ قبیلہ بنو نجار کا ایک شخص مسلمان ہوا، کاتب وحی مقرر ہوا، پھر نصرانی ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مذاق اڑاتا کہ میں نے وحی میں بہت سی ایسی باتیں لکھ دیں جن کا انہیں پتہ نہ چلا۔ کچھ دن بعد اس کی گردن ٹوٹ گئی۔لوگوں نے دفن کیا، لاش کو زمین نے قبول نہ کیا۔ صبح باہر پڑی تھی، اگلی صبح اور نیچے دفن کیا، پھر ایسا ہوا، پھر کیا، آخر لاش ویرانے میں پھینک دی گئی (مسلم) آپ فیصلے کرتے جاؤ، اینگلو سیکسن قانون کا تحفظ اور اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں کا تمسخر اڑاتے جاؤ لیکن جان رکھو کہ اس کائنات کی آخری عدالت وہ قادر مطلق کی ہے جو جب، جہاں، جس وقت چاہے اپنے فیصلے کا اعلان کر دے اور ہماری چیخ و پکار سننے والا بھی کوئی نہ ہو۔

عدلیہ کا ضابطہ اخلاق اور توہین عدالت

عدل کی کرسی ایسی ہے کہ جس پر بیٹھنے والے شخص سے جہاں عزت واحترام وابستہ ہے،اس پر اعتماد اور اس کے انصاف سے معاشرے کو دوام اور امن میسر آتا ہے،وہیں دنیا کے ہر معاشرے نے عدل کرنے والوں کے لئے کڑے معیار مقرر کیے ہیں۔ان کے کردار‘ اخلاق‘ حسن سلوک‘ انصاف پسندی اور دوست دشمن کی پرواہ کئے بغیر عدل کرنے کو ہی جج کی صفات گردانا ہے۔یوں تو دنیا کا ہر شعبہ عدل کی بنیاد پر قائم ہے، گھر کے نظام سے لے کر کاروبار تک اور معاشرتی میل جول سے لے کر حکومتی انتظام تک اگر عدل نہ ہو تو ایسے معاشرے تباہ برباد ہو جایا کرتے ہیں۔دنیا کی تاریخ میں جن قوموں پر زوال آیا ان میں ایک عیب ضرور تھا کہ انہوں نے عدل کو خیر آباد کہہ دیا تھا۔یہاں تک کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم صرف اس بات پر بدترین عذاب کا شکار ہوئی کہ وہ ناپ تول میں عدل نہیں کرتے تھے۔ عدالتوں کا نظام دنیا میں اس لیے وجود میں لایا گیا کہ اگر زندگی کے کسی بھی شعبے میں عدل نہ ہو رہا ہو‘ ناانصافی کی شکایت ہو تو لوگ عدالت کے پاس جائیں اور عدالت اس ناانصافی کرنے والے کو سزا دے اور حق دار کو انصاف فراہم کرے۔عدل دراصل عدالت میں نہیں ہوتا‘ وہاں تو ناانصافی یا عدل کی عدم فراہمی کو اپنے فیصلوں سے درست کیا جاتا ہے اور سزاوار کو سزا سنائی جاتی ہے۔عدل تو تھانے‘ پٹوار خانے‘ ٹیکس کے دفتر‘ کاروباری مرکز یا خاندان میں ہوتا ہے۔اگر تھانیدار مجرم کو پکڑے‘ صحیح تفتیش شروع کرے تو عین ممکن ہے کہ مدعی عدالت میں نہ جائیں‘ اگر لین دین میں انصاف کا اصول ہو تو لوگ عدالتوں کے دروازے نہ کھٹکھٹائیں۔اگر خاندان میں وراثت‘ جائداد اور دیگر معاملات میں گھر کے لوگ انصاف سے کام لیں تو عدالت کو عدل کی ضرورت ہی نہ پڑے۔عدالت بنیادی طور پر حق دار کو حق دلانے‘ ناانصافی کو روکنے‘ مجرم کو سزا دینے اور ایسے قوانین کے خاتمے کے لئے وجود میں آتی ہے جو لوگوں کو انصاف فراہم کرنے سے روکتے ہیں۔

اسی لیے دنیا کے ہر معاشرے میں عدالت کا احترام لازم قرار دیا گیا ہے۔توہین عدالت ایک ایسا قانون ہے جو صدیوں سے انسانی معاشرے میں نافذ ہے۔یہ قانون کبھی بھی یک طرفہ نہیں رہا ہے۔جہاں عوام کو عدالت کی کردار کشی کی اجازت نہیں‘ انہیں عدلیہ کے خلاف نازیبا زبان استعمال کرنے اور بے بنیاد الزامات سے روکا جاتا ہے وہیں عدلیہ کے اعلیٰ مقام اور مرتبہ کے ججوں سے بھی یہ توقع ہی نہیں بلکہ لازم قرار دیا جاتا ہے کہ وہ عدلیہ کا احترام کریں۔یہ احترام نہ صرف ان کے رویے‘ ان کے کردار اور ان کی گفتگو سے نظر آنا چاہیے بلکہ عدلیہ کے اعلیٰ ترین ججوں پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ بہترین لباس زیب تن کر کے آئیں۔ایسا لباس جو عدالت کی عزت و توقیر کے مطابق ہو۔بلوچستان کے ایک جج صاحب عموماً عدالت میں آنے کے بعد جوتے اتار کر چپل پہن لیتے تھے کہ پاؤں ذرا آرام سے رہیں۔ان کے سامنے ایک وکیل پیش ہوا تو بحث ذرا گرما گرم ہو گئی جس سے لہجے میں تلخی آ گئی۔جج نے کہا کہ میں تم پر توہین عدالت لگا دوں گا۔اس پر وکیل فوراً بول اٹھے، آپ توہین عدالت کیسے لگا سکتے ہیں جبکہ آپ خود عدالت کی توہین کر رہے۔آپ نے سوٹ کے نیچے چپل پہن رکھی۔ایسا لباس اور چپل پہن کر آپ کسی عزت دار محفل میں نہیں جا سکتے لیکن آپ عدالت میں موجود ہیں۔بھلے زمانے تھے جج صاحب کو غلطی کا احساس ہوا اور پھر بلوچستان کے لوگ گواہ ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ مناسب اور مکمل لباس پہنا کہ کہیں ان کے اس رویہ سے عدالت کی توہین نہ ہو جائے۔

ہندوستان کے صوبے کیرالہ کی ہائی کورٹ کا 2005ء کا ایک کیس توہین عدالت کے ایک ایسے مقدمے کی نشاندہی کرتا ہے جس میں توہین عدالت کا مرتکب ایک معزز جج قرار دیا گیا۔ کیرالہ ہائی کورٹ کے اس معزز جج کے بارے میں ایک صحافی نے کچھ خبریں لگانا شروع کیں جو ان کے فیصلوں کے بارے میں تھیں۔ فیصلوں پر تبصرہ کرنا چونکہ توہین عدالت کے زمرے میں نہیں آتا،اس لئے جج صاحب اس کو کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔اچانک ایک شخص نے اس صحافی کے خلاف ہتک عزت اور بلیک میلنگ کا دعویٰ کر دیا۔ صحافی ایک دو پیشیوں میں حاضر نہ ہوا۔جج صاحب نے تھانیدار کو عدالت میں طلب کیا اور کہا وہ جہاں کہیں بھی ہے اس کو پکڑ کر ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ تھانیدار واپس آیا اور اس نے بتایا کہ صحافی تو ہسپتال میں بستر پر ہے کیونکہ دس دن پہلے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔جج صاحب نے حکم دیا کہ اس کو سٹریچر پر ڈال کر حاضر کرو۔ایک گھنٹے کے بعد ایک سٹریچر فاضل عدالت کے کمرے میں داخل ہوا اور اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے فاضل جج پر توہین عدالت کی سماعت کا اعلان کر دیا۔اور کہا کہ اس طرح ایک ملزم کو عدالت کے کٹہرے میں لا کر عدالت کی توہین کی گئی ہے۔پاکستان میں سندھ ہائی کورٹ کے جسٹس محمد علی سید اور شریعت کورٹ کے جسٹس شفیع محمدی کے کیسوں کی مثالیں بھی اسی زمرے میں آتی ہیں۔ججوں کو عدالت کے احترام کا پابند کرنے اور انہیں توہین عدالت سے روکنے کے لئے دنیا کے ہر ملک میں ایک ضابطہ اخلاق مقرر کیا جاتا ہے۔پاکستان کی عدلیہ کا بھی ایک ضابطہ اخلاق ہے۔اس کے ان چند نکات پر غور کریں تو آپ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ جج بننا تو زندگی بھر پل صراط سے گزرنے کے مترادف ہے۔

1-ایک جج خدا سے ڈرتا ہو‘ قانون پر عملدر آمد کرتا ہو‘ زبان کا سچا‘ رائے میں عقل مند‘ محتاط اور صبر سے کام لینے والا ہو۔وہ ہر الزام سے مبرا اور اسے لالچ چھو کر بھی نہ گزرا ہو۔

2-انصاف کرتے ہوئے اس کو مضبوط ہونا چاہیے، لیکن کھردرا نہیں‘ نرم خو ہونا چاہیے لیکن کمزور نہیں‘ اپنے الفاظ میں سچا اور پر اعتماد اور ہمیشہ اپنے سکون کو قائم رکھنے والا ہونا چاہیے۔

3-جج تک پہنچنا ناممکن ہو اور اس کا کردار اس چیز کا اظہار کرے۔اسے اس بات کو ممکن بنانا چاہیے کہ انصاف ہو رہا ہے بلکہ انصاف ہوتا نظر آنا چاہیے۔اسے ایسی تمام آراء سے دور رہنا چاہیے جس پر اس کے ذاتی فوائد کا شائبہ ہو۔

4-اس کے تمام افعال لوگوں کی نظر میں ہوتے ہیں اور اسے وہ تمام شہرت مل جاتی ہے جس کا وہ مستحق ہے لیکن اسے زیادہ کا طلبگار نہیں ہونا چاہیے۔

5-تحائف صرف رشتہ داروں اور قریبی دوستوں سے وصول کرنے چاہئیں اور وہ بھی رواج کے طور پر۔اگر کوئی چیز جس کا تصور بھی آجائے کہ یہ دفتری امور میں حائل ہو گی اس کا انکار کر دیا جائے۔

6-جج کو مختصر ترین مدت میں فیصلے کرنا چاہئیں۔جتنی جلد ممکن ہو سکے لوگوں کی مشکلات میں جلد انصاف فراہمی میں اپنے فیصلوں کے ذریعے کمی لانا چاہیے۔یہ اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے ضابطہ اخلاق کے چند نکات ہیں۔کوئی جج جو ان نکات پر عمل در آمد نہیں کرتا وہ دراصل توہین عدالت کا مرتکب ہو رہا ہوتا ہے۔اس لئے کہ اس کے اس عمل سے عوام میں عدلیہ کا وقار مجروح ہوتا ہے اور عدالت زیر بحث آجاتی ہے۔یہ سب اس لیے یاد آرہا ہے کہ سپریم کورٹ کے معزز جج سرمد جلال عثمانی صاحب جو اب سپریم کورٹ سے رخصت ہو گئے ہیں، سود کے بارے میں اپیل نامنظور کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ ہم عدالت میں مدرسہ نہیں لگا سکتے‘ جو سود نہیں لیتا نہ لے‘ جو لے گا اسے اللہ پوچھے گا۔اللہ نے آئین پاکستان کے توسط سے آپ کو عدل کی کرسی پر سرفراز فرمایا تھا۔ آپ کے پاس آئین کی دفعہ 190 کے تحت یہ اختیار بھی موجود تھا کہ ملک کی تمام انتظامی اور عدالتی مشینری آپ کا حکم ماننے کی پابند تھی۔آپ سوئس عدالت کو خط نہ لکھنے پر وزیر اعظم کو گھر بھیجنے تک جیسا اختیار رکھتے تھے۔ آپ نے اٹھارہ کروڑ عوام کو سود کے معاملے میں عدالتی بے بسی کا اظہار کر کے کہیں توہین عدالت تو نہیں کی۔کیا واقعی سپریم کورٹ اسقدر بے بس ہے کہ لوگوں کو اب صرف اللہ سے انصاف کی توقع اور امید رکھنا چاہیے۔یہ سوال پاکستان کے چیف جسٹس کے سامنے رکھ رہا ہوں۔کیا عدالت کے بارے میں عوام کو ایسا تاثر دینے سے توہین عدالت نہیں ہوئی۔کوئی سوؤ موٹو اس ضمن میں بھی مائی لارڈ۔

نوٹ:ایک مستحق شخص جگر کے ٹرانسپلانٹ کے مرحلے میں ہے،ڈونر موجود لیکن آپریشن کی استطاعت نہیں۔ کوئی صاحب آپریشن کی صورت مدد فرمانا چاہیں تو 0344403219 پر رابطہ کر کے خود تسلی کر لیں۔ بہتر ہے امداد اس ہسپتال یا ڈاکٹر کو دی جائے جو یہ آپریشن کرے۔

آفتیں اور بلائیں کیوں نازل ہوتی ہیں

گھر بناتے وقت ان لوگوں نے وہ تمام تدابیر کی تھیں جو سیلاب، آندھی اور طوفان میں گھروں کو محفوظ رکھتی ہیں۔ یہ سب صاحبِ حیثیت لوگ ہیں جو گھروں، دفتروں، دکانوں، پلازوں اور دیگر عمارتوں کو بنانے کے لئے ایسے ماہرین کا انتخاب کرتے ہیں جنہوں نے جدید علم کی روشنی میں عمارتوں کو اس طرح ڈیزائن کرنا سیکھا ہوتا ہے جو زلزلے، طوفان اور سیلاب وغیرہ میں قائم رہیں۔ یہ تو اکیسویں صدی کے سائنس پروردہ انسان ہیں۔ زلزلے سے محفوظ عمارات بنانے کا فن تو انسان صدیوں سے جانتا ہے۔ کوئی حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے آثار مدائن صالح میں جاکر دیکھے کہ کیسے انہوں نے پہاڑ تراش تراش کر گھر بنائے تھے جو آج بھی صحیح سالم ہیں، ان پر ہزاروں سال سے آنے والے زلزلوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اللہ فرماتا ہے "ہم نے ان کو اور ان کی قوم کو ہلاک کر ڈالا، اب یہ گھر ان کے ظلم کے سبب خالی پڑے ہیں"۔ (النمل 52-51) دنیا میں عبرت کے طور پر موجود جتنے بھی مقام ہیں ان کی ساخت ایسی ہے کہ زلزلوں اور سیلابوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تاج محل کی پوری عمارت کی بنیادیں نوے فٹ گہری ہیں اور ان کے نیچے 40 فٹ ریت ہے تاکہ اگر کبھی زلزلہ آئے تو پوری کی پوری عمارت ریت کے اندر گھوم جائے اور زلزلہ اس پر اثر انداز نہ ہو۔ انسان جب سے پیدا ہوا ہے قدرتی آفات کے مقابلے میں احتیاطی تدابیر کرتا چلا آیا اور اس میں کامیاب بھی ہے۔ لیکن جس وقت یہ آفت اسے گھیر لیتی ہے، اسوقت اسے سوائے اللہ کی ذات کے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ سارے لوگ جو آج سائنس کی منطقیں بگھار رہے ہیں، ان سب کو اپنی عمارتوں کے مضبوط ہونے کا مکمل یقین تھا، لیکن گزشتہ زلزلے کے وقت یہ سب کے سب کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے گھروں، دکانوں، پلازوں اور دفتروں سے ایسے بھاگ رہے تھے جیسے سیلاب میں چوہے بلوں سے نکل کر بھاگتے ہیں۔ اس وقت نہ کسی کو سائنس کی دنیا یاد آئی، نہ اس بات پر بھروسہ اور ایمان قائم رہا کہ یہ عمارت تو زلزلہ پروف ہے۔ اللہ کی بدترین نافرمانی اور گناہ میں مشغول افراد بھی اسی کا ورد کرتے گھروں اور علاقوں میں موت کے خوف سے بھاگتے پھر رہے تھے۔ لیکن جیسے ہی یہ آفت تھمی ہے فوراً ارضیات اور فزکس کی کتابیں کھول کر ہر کسی سے بحث کرنے لگے کہ یہ سب تو ایک معمول کی کاروائی ہے جو وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اس کا تعلق اللہ کے غصے اور ناراضی سے کیسے ہو گیا۔

موجودہ سیکولر علم کی بنیاد دو اصولوں پر ہے۔ پہلا ہر وہ چیز جسے تجربے اور مشاہدے کے بعد درست ثابت کر دیا جائے اسے سچ مان لیا جاتا ہے۔ جسے وہ سائنسی سچائی (ScientificTruth) کہتے ہیں اور دوسرا اصول یہ ہے کہ اس دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعہ کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ اس تصور کو علت و معلول (Cause and Effect) کہتے ہیں۔ سائنسی تحقیق زلزلے کے بارے جو منطق پیش کرتی ہے، وہ سائنسدانوں کے مشاہدے پر مبنی ہے کیونکہ زمین کی بالائی سطح جسے Crest کہتے ہیں ابھی تک انسان اس کے رازوں سے بھی آشنا نہیں ہو سکا جبکہ اس کے نیچے آگ کا کھولتا ہوا سمندر ہے جس تک رسائی یا اس کے اندر آنے والی تبدیلیوں تک پہنچنا تو ایک خواب لگتا ہے۔ مشاہدات اور سائنسی منطق کی بنیاد پر زمین کی بالائی سطح جو چند کلومیٹر موٹی ہے اس کے بارے میں ایک سائنسی کہانی (Theory) مرتب کی گئی ہے کہ اس بالائی سطح کی مختلف بڑی بڑی پلیٹیں ہیں جو آہستہ آہستہ سرک رہی ہیں اور صدیوں سے سرکتی چلی آرہی ہیں۔ ایک دن ہندوستان کی پلیٹ چین اور یورپ کی بڑی پلیٹ سے ٹکرائی تھی تو اس کے نتیجے میں ہمالیہ اور دیگر پہاڑ وجود میں آگئے تھے۔ ظاہر ہے ان پلیٹوں کو مناسب طریقے سے کاٹا تو نہیں گیا تھا اس لئے اوپر سے تو سب مل گئے، لیکن نیچے خلا باقی رہ گئے۔ ان خلاؤں کو جیالوجکل فالٹ کہا جاتا ہے۔ چونکہ پلیٹیں مستقل حرکت کر رہی ہیں اس لئے جب کبھی یہ حرکت تیز ہوتی ہے تو زلزلہ آجاتا ہے۔ اس تھیوری کو سچ ثابت کرنے اور اس حرکت کو ناپنے پر ابھی کام جاری ہے۔ سب مفروضے ہیں۔ سیکولر علم کا ایسے موقع پر ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ یہ نیچر کی بھول بھلیاں (Mystry) ہے اور ہماری جستجو جاری ہے۔ سیکولر علم کی بنیاد پر سوچنے والا ایک تصور بنا لیتا ہے کہ اللہ بھی اپنے کسی ارادے کو تکمیل دینے کے لئے اسباب کا محتاج ہے۔ جبکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا دعویٰ ہے کہ وہ خالق اسباب ہے۔ وہ "باری" ہے یعنی ایسا مصور اور تخلیق کار جس کے پاس اسباب نہ ہوں، تو بھی وہ خلق کرتا ہے۔ اسی لئے نہ تو ہمیں اللہ کے تصورِ عذاب کی سمجھ آتی ہے اور نہ ہم سے اس کی اس دنیا پر آفتیں اور مصیبتیں نازل کرنے کی گتھی سلجھائی جاتی ہے۔ اللہ کے نزدیک یہ دنیا جزا و سزا کی دنیا نہیں ہے۔ یہ تو ایک امتحان کا عرصہ ہے۔ جزا و سزا کے لئے تو ایک دن مقرر ہے جسے روزِ محشر کہتے ہیں۔ اسی لئے اللہ زمین پر نازل کی جانے والی آفت یا عذاب کا مقصد خود بیان کرتا ہے۔ "اور ہم انہیں لازماً مزہ چکھائیں گے چھوٹے عذاب کا بڑے عذاب سے قبل، شاید کہ یہ رجوع کر لیں"۔ (السجدہ 21)۔ یہاں وہ کسی فرد پر عذاب نازل نہیں کرتا بلکہ پورے گروہ یا قوم میں سے کسی کو استثنیٰ نہیں دیا جاتا۔ وہ فرماتا ہے: "اور ڈرو اس وبال سے جو تم میں سے صرف ظالموں کو ہی لاحق نہیں ہوگا"۔ (الانفال: 25) یہ بھی اسی کا اختیار ہے کہ وہ کبھی کبھی نیک لوگوں کو اپنے عذاب سے خاص طور پر محفوظ رکھتا ہے اور اس میں بھی صرف ایسے لوگوں کو اللہ بچاتا ہے جو لوگوں کو برائی سے روکتے رہے تھے۔ "ہم نے بچا لیا ان لوگوں کو جو برائی سے روکتے تھے"۔ (الاعراف: 165) اس آیت کے آغاز میں اللہ ان لوگوں کا بھی ذکر کرتا ہے جو لوگوں کو کہتے تھے: "تم ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا سخت عذاب دینے والا ہے"۔ (آلِ عمران: 164) اللہ نے برائی پر خاموش رہنے والوں کو بھی عذاب میں مبتلا کر دیا۔ برائی سے روکنے والوں کا استثنیٰ بھی اللہ کا اپنا فیصلہ ہے، وہ چاہے تو بچائے اور چاہے تو ہلاک کر دے، اس لیے کہ موت صرف ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقلی کا نام ہے اور روزِ قیامت عذاب کے دوران ہلاک ہونے والے فرداً فرداً پیش ہوں گے۔ جس کے اعمال اچھے ہوں گے وہ جنت میں جائے گا اور جس کے اعمال برے ہوں گے وہ جہنم کا مزہ چکھے گا۔ یہ ہے وہ فلسفہ جس کے تحت اللہ لوگوں کو جھنجھوڑنے اور اپنی جانب لوٹ آنے کے لیے عذاب نازل کرتا ہے۔ وہ تو کسی ظالم بادشاہ کو بھی اپنا عذاب ہی کہتا ہے اور پھر قوموں کو یاد دلاتا ہے کہ میں نے اس ظالم سے تمہیں نجات دلائی "جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دی جو تمہیں بڑا عذاب دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے، یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر بڑی بلا (امتحان) تھی"۔ (البقرہ: 49) لیکن علت و معلول اور سائنسی سچائی کو حرفِ آخر سمجھنے والے اس سب کو دنیا کے عوامل سمجھتے ہیں۔ اسی لیے جب کہا جاتا ہے کہ عذاب میں اللہ کی طرف رجوع کرو، اس سے اجتماعی استغفار کرو تو اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ لیکن میرا اللہ تو حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی مثال دے کر شدید خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ قومیں اس سے اجتماعی توبہ کریں۔ یونسؑ کی قوم اجتماعی طور پر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئی تھی اور اللہ نے عذاب ٹال دیا تھا۔ اللہ فرماتا ہے: "بھلا کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی کہ ایسے وقت ایمان لے آتی کہ اس کا ایمان اسے فائدہ پہنچا سکتا۔ البتہ صرف یونسؑ کی قوم کے لوگ ایسے تھے۔ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے دنیوی زندگی میں رسوائی کا عذاب ان سے اٹھا لیا اور ان کو ایک مدت زندگی کا لطف اٹھانے دیا"۔ (یونس: 98) یہ ہے قوموں اور نبیوں سے اللہ کی شدید خواہش۔ لگتا ہے ہم اللہ کی خواہش پر، اس کے سامنے جھکنے پر ابھی تک راضی نہیں۔ زلزلے کے بعد ایک صاحبِ نظر سے درخواست کی کہ اس قوم کے لئے رحم کی دعا فرمائیں، فرمانے لگے یہ اللہ کے سامنے جھکنے کو تیار ہیں۔ شاید نہیں، ہر کوئی خوفزدہ ہے، صاحبانِ نظر کانپ رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے یہ زلزلہ تو ایسے تھا جیسے چوٹ لگانے کے لئے ہتھوڑے کی نشانی لی جاتی ہے اصل چوٹ سے اللہ ہمیں محفوظ رکھے۔ کاش ہم حضرت یونس کی قوم جیسے ہو جائیں اور اللہ ہمیں زندگی سے لطف اٹھانے کا موقع فراہم کر دے۔

اگر ریحام خان صرف اینکر رہتی

مونیکا لیونسکی کی یہ تقریر دنیا بھر کے میڈیا کی اخلاقیات پر اتنا بڑا سوال ہے جس کا جواب میڈیا سے وابستہ کسی فرد کے پاس نہیں ہے۔ مونیکا ہماری موجودہ تاریخ کا وہ "مہذب" چہرہ ہے جس پر بدنامی کی کالک عالمی سطح پر ملی گئی اور اس کالک کو ملنے کے جملہ حقوق صرف اور صرف امریکی میڈیا کے پاس تھے۔ یہ خاتون گزشتہ دس سال سے خاموش تھی۔ اس نے اپنی دس سالہ خاموشی چند ماہ قبل توڑی اور ایک پر ہجوم ہال میں گفتگو کی جس کا عنوان تھا "شرمندگی کی قیمت (The Price of Shame)۔ تقریر کا ایک ایک لفظ نپا تلا اور معنی خیز تھا جبکہ حسن بیان اس کا سترہ سالہ کرب اور اذیت کا آئینہ دار اور درد سے نکھرا ہوا۔ اس نے آغاز اس فقرے سے کیا کہ آپ ایک ایسی عورت کو دیکھ رہے ہو جو گزشتہ دس سال سے خاموش تھی۔ کچھ عرصہ پہلے جب میں نے اپنی خاموشی توڑی تو ایک شخص مجھ سے متاثر ہو کر میرے قریب ہوا۔ مجھے بھی وہ اچھا لگا۔ اس نے مجھے ایک دفعہ یہ محسوس کرانے کی کوشش کی میں ایک بائیس سالہ نوجوان لڑکی ہوں۔ اس رات مجھے یہ احساس ہوا کہ میں شاید دنیا کی وہ واحد عورت ہوں جو چالیس سال سے زیادہ عمر کی ہونے کے باوجود بھی بائیس سالہ زندگی کی طرف لوٹنا نہیں چاہتی۔

اس کے بعد مونیکا نے پورے ہال سے کہا کہ وہ شخص ہاتھ کھڑا کرے جس نے بائیس سال کی عمر میں کوئی غلطی نہ کی ہو۔ پورا ہال ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ اس نے کہا میں نے بھی بائیس سال کی عمر میں ایک غلطی کی تھی کہ میں اپنے باس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ لیکن میری طرح کسی کا باس امریکہ کا صدر نہیں تھا۔ زندگی ہمیشہ آپ کو حیران کرتی ہے لیکن دو سال بعد 1998ء میں میرے اس معاشقے کی بنیاد پر مجھے ایک عام سی لڑکی کی بجائے دنیا بھر کی رسوا ترین عورت میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اطلاعات ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے ملتی تھیں لیکن میری اس رسوائی کا سلسلہ آج تک چل رہا ہے اور لوگ آج بھی سوشل میڈیا، ای میلز اور تقاریر میں میرا ذکر کرتے ہیں۔ تقریباً بیالیس ریپ گانے ایسے ہیں جن میں میرا نام ذلت و رسوائی کے لیے لیا گیا ہے۔ مجھے بہت کم لوگ جانتے اور بہت زیادہ لوگ دیکھتے ہیں۔ دیکھنے والے جو میرے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں وہ ایک بری عورت کا ہے جسے وہ طرح طرح کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ 1998ء میں میں نے اپنی عزت و وقار بلکہ سب کچھ کھو دیا۔ آئیں میں آپ کے سامنے ایک منظر پیش کرتی ہوں۔ ایک بغیر کھڑکیوں کے کمرہ جس میں خاص طور پر روشنی کا اہتمام کیا گیا تھا جہاں مجھے میری ٹیلیفون پر کی جانے والی گفتگو کو سنوانے کے لیے بلایا گیا تھا جو خفیہ طور پر ریکارڈ کی گئی تھی۔ میری اور صدر بل کلنٹن کی گفتگو۔ یہ بیس گھنٹوں پر مشتمل تھی جس میں جذبات بھی تھے اور محبت بھی تھی۔ میرے سر پر سارا لمحہ ایک تلوار لٹکتی رہی۔ کچھ عرصے بعد یہ گفتگو کانگریس کے ریکارڈ کا حصہ بنادی گئی۔ لیکن ذلت و رسوائی کا آغاز اس وقت ہوا جب چند ہفتوں بعد یہ گفتگو ٹیلیویژن پر چلادی گئی اور اس کے مخصوص حصے آن لائن بھی میسر ہو گئے۔ یہ رسوائی ناقابل برداشت تھی۔ رسوائی اور ذلت کا یہ سفر اب دنیا بھر میں بہت سے غلطی کرنے والوں کے لیے اذیت ناک ہوتا جا رہا ہے۔ اس واقعے کے بارہ سال بعد میری ماں نے مجھے فون پر بتایا کہ کس طرح ٹیلر کلیمنٹ نامی اٹھارہ سالہ لڑکے نے جارج واشنگٹن پل سے کود کر خودکشی کر لی تھی کیونکہ اس کی ایک خفیہ ویڈیو کسی نے بنائی اور پھر اسے سوشل میڈیا پر ڈال دیا۔ ٹیلر تو مر گیا۔ میں، میری ماں اور آپ اس کے ساتھ بھی ہوں گے لیکن اس کے گھر والوں پر ذلت و رسوائی کا جو پہاڑ ٹوٹا ہو گا وہ ناقابل برداشت ہے۔ آج اس دنیا میں بہت سارے ایسے والدین ہیں جو اپنی اولادوں کو میڈیا کی اس ذلت و رسوائی سے نہیں بچا پاتے۔ وہ ان کی غلطیوں سے درگزر کرنا اور انہیں چھپانا چاہتے ہیں۔ لیکن میڈیا انہیں ذلت کا لباس پہناتا رہتا ہے۔ آج دن بدن نیٹ کے ذریعے لوگوں کو خوفزدہ اور شرمندہ کرنے کا دور ہے۔ صرف ایک سال یعنی 2012ء سے 2013ء کے درمیان لوگوں کی فون کی گفتگو وغیرہ سے ہراساں کرنے میں 87 فیصد اضافہ ہوا۔ بلکہ ہالینڈ کی تحقیقات کے مطابق عام وجوہات کی بجائے نیٹ یا سوشل میڈیا سے ذلت اور سراسیمگی کے بعد خودکشیاں زیادہ ہونے لگی ہیں۔ آپ صرف ایک Chat سروس سے اندازہ لگائیں جو نوجوان استعمال کرتے ہیں۔ یہ گفتگو اور تصاویر تھوڑی دیر کے لیے محفوظ رکھتی جاتی ہیں' لیکن اچانک چوری ہو جاتی ہیں اور ایک لاکھ لوگوں کی ذاتی گفتگو مستقل طور پر سوشل میڈیا کے ذخیرے میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس سب کی ایک قیمت ہے جو صرف وہ ادا کرتا ہے جو رسوا ہو رہا ہوتا ہے۔ رسوائی کے دوران آپ سے کوئی ہمدردی نہیں کرتا۔ ایسے میں آپ کو کسی اجنبی کی تسلی بھی بہت اچھی لگتی ہے۔ لیکن وہ میسر نہیں آتی۔ میں نے زندگی کے نازک ترین ایام ایسے گزارے ہیں جب ان الفاظ کو ترستی تھی جو میری غلطی پر مجھے معاف کر دینے والے ہوں۔ ہم آزادی اظہار کے قائل ہیں لیکن کیا اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ کیا ہم ایسے شخص کے ساتھ ہمدردی اور تسلی کے لفظ میڈیا یا سوشل میڈیا پر نہیں بول سکتے جب وہ رسوا کیا جا رہا ہو۔

مونیکا لیونسکی کا معاشرہ' مغرب کا معاشرہ، ذمہ دار میڈیا، جہاں ہتک عزت کا قانون اس قدر موثر مگر وہ کس قدر بے بس اور مجبور۔ ایسے میں پاکستانی معاشرے کی ریحام خان ہو یا ایسی کوئی اور آپ اس کے ذاتی کرب اور دکھ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ پاکستان کا میڈیا اس قدر ظالم، بے رحم اور جانبدار ہے کہ کسی دوسرے معاشرے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر ریحام خان صرف اور صرف ایک اینکر پرسن رہتی اور عمران خان سے شادی نہ کرتی تو کس قدر عزت دار زندگی گزار رہی ہوتی۔ کیا کبھی کوئی ٹی وی چینل اس کے پہلے خاوند کے گھر پہنچتا اور اس سے انٹرویو کرتا۔ کرید کرید کر سوالات پوچھتا اور اسے بدنام کرنے کی کوشش کرتا۔ اگر وہ صرف اینکر ہوتی تو کیا کوئی ٹی وی چینل اس کی ڈانس والی ویڈیو اور مختصر لباس والی تصویریں دکھا کر تبصرے کرتا۔ اگر وہ ایک اینکر ہوتی، اس کی طلاق ہو جاتی تو کیا یہ خبر نہ ہوتی۔ لیکن شاید اس خبر کو کوئی بھی نشر نہ کرتا۔ اسے چھپایا جاتا، اسے ذاتی معاملہ سمجھا جاتا، کوئی یہ دعویٰ نہ کرتا کہ میں کسی قیمت پر خبر نہیں چھپا سکتا کیونکہ خبر بہت اہم ہوتی۔ کہا جاتا ہے سیاست دان عوامی شخصیات ہیں اس لیے ان کا کوئی معاملہ ذاتی نہیں۔ کیا ہمارے اینکر اور کالم نگار عوامی شخصیات نہیں۔ ان کو سننے اور دیکھنے کے لیے لوگ ہزاروں سیاست دانوں سے زیادہ جمع ہوتے ہیں۔ یہ روزانہ لاکھوں لوگوں کے ذہن بدلتے ہیں، ان کی رائے بناتے ہیں۔ یہ عوامی شخصیات کیوں نہیں، ان کی ذاتی زندگی اور کردار کیوں لوگوں کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔ یہی سوال جو مونیکا لیونسکی نے کیا تھا۔ کیا کسی اینکر، کالم کالم نگار یا صحافی نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی۔ کیا ان سب کی ذاتی زندگی میں کہیں کوئی طوفان نہیں آیا، کیا ان کے معاشقے لوگوں کو دکھا کر انہیں ان کی اولادوں اور گھر والوں کے سامنے شرمندہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہم سب میڈیا والوں کو رسوا کرنے کے لیے کسی اور گھر اور جھانکنے کے لیے کسی اور کا گریبان چاہیے۔ روزانہ ہمارے ٹیلیویژن چینلز پر غلط انگریزی اور بے سروپا اردو بولنے والے بڑے بڑے نیوز اینکر، اینکرز اور رپورٹر نظر نہیں آتے۔ لیکن ہم تمسخر اڑانے کے لیے اداکارہ میرا کو پکڑ لیتے ہیں اور پھر ہمارا دھندا چلنے لگتا ہے۔ صحافت میں یہ روش ٹیلی ویژن چینلز کے آنے کی وجہ سے عام نہیں ہوئی۔ یہ مدتوں سے چلی آ رہی ہے۔ آپ چھوٹے شہروں کے محدود اخبارات اور ہفت روزوں اور بڑے اخبارات کے نمائندوں کے بارے میں سوال کر کے دیکھیں، ہر کوئی ان سے خوفزدہ اور پریشان نظر آئے گا۔ اکثر چھوٹے جرائد جو بہت محدود تعداد میں چھپتے ہیں ان کا مقصد ہی رنگینی، سکینڈلز کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کیا ان سب کے بارے میں اخبارات کے ایڈیٹر، میڈیا کے کرتا دھرتا اور ٹیلی ویژن چینل پر چمکتے دمکتے اینکر نہیں جانتے۔ یہ سب جانتے ہیں۔ 1980ء میں جب میں بلوچستان یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا تو ایک دن طلبہ کو لے کر مچھ جیل دکھانے گیا۔ وہاں پھانسی کی کوٹھریوں میں ایک بہت موٹا سا شخص پھانسی کی سزا کا منتظر تھا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے ایک صحافی کو قتل کیا ہے۔ میرے ساتھ طلبہ اس سے طرح طرح کے سوال کر رہے تھے۔ ہر کسی کو پڑھا لکھا ہونے کے ناطے صحافی سے ہمدردی تھی۔ وہ جواب میں یہی کہتا رہا بس غلطی ہو گئی۔ پھر ایک دم پھٹ پڑا اور تیز تیز بولنے لگا۔ آپ کی بہن کے بارے میں کوئی ایک خبر بار بار لگائے، آپ اس کی صوبے سے باہر شادی کر دیں تاکہ وہ چین سے زندگی گزار سکے۔ کوئی وہ اخبار بھی اس کے سسرال پہنچا دے، وہ طلاق لے کر گھر آ بیٹھے اور خبر لگانے والا چائے خانے میں بیٹھ کر اسے اپنی فتح قرار دے تو آپ اس چھوٹے سے شہر کوئٹہ جس کی آبادی ایک لاکھ ہے جہاں آپ کی رسوائی کو سب جانتے ہیں تو ایسے میں آپ کیا کریں گے۔ طلبہ چپ رہے۔ وہ بولا آپ جیسے پڑھے لکھے لوگ خودکشی کرتے ہیں اور میرے جیسے جاہل قتل کر کے پھانسی پر جھول جاتے ہیں۔ انجام دونوں صورت میں موت ہے اور وجہ صرف ایک ہے کہ صحافت میں کچھ لوگ خبر کو انسانوں کی عزت، توقیر اور احترام سے زیادہ اہم قرار دیتے ہیں۔

ایک اور جوڈیشل کمیشن

انگریز سے ورثے میں ملے ہوئے پاکستان کے اینگلو سیکسن عدالتی نظام کی بدقسمتی یہ ہے کہ پورے ملک، صوبے، شہر، قصبے یا گاؤں میں جرم اور مجرم دونوں کی اس قدر واضح پہچان موجود ہوتی ہے، بچے بچے کی زبان پر مجرم کا نام اور گلی گلی میں اس جرم کے قصے سنائی دیتے ہیں، لوگ مجرم کے خوف سے تھر تھر کانپ بھی رہے ہوتے ہیں، انہیں اس مکان، عمارت یا پناہ گاہ کا بھی ٹھیک ٹھیک پتہ ہوتا ہے جہاں سے جرم پروان چڑھتا ہے، لیکن لوگوں کا یہ تاثر، ان کی آنکھوں کے سامنے موجود یہ حقیقت اکثر اوقات عدالتی فیصلوں میں دکھائی نہیں دیتی۔ اکثر فیصلے اس موہوم سے فقرے پر آکر ختم ہو جاتے ہیں کہ "مجرم کے خلاف صفحہ مثل پر ثبوت ناکافی ہیں" یا پھر یہ کہ "استغاثہ اپنا کیس ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے"۔ اس عدالتی نظام کے حامیوں اور وکیلوں سے سوال کرو کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ وہ شخص جسے پوری دنیا بددیانت، چور، ڈاکو، قاتل، سمگلر، منشیات فروش، بھتہ خور یا بدمعاش کے طور پر ایک مسلم حقیقت کے طور پر جانتی ہو بلکہ اس کے مقدمے کے فیصلے کرنے والے جج کو بھی ایمان کی حد تک یقین ہو کہ یہ شخص ایسا ہی خوفناک مجرم ہے مگر جج اسے چھوڑنے یا بری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، تو اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ جج کے سامنے جو ثبوت اور جو گواہی پیش کی جائے گی وہ اسی کے مطابق فیصلہ کرے گا، اپنے ذاتی علم اور ذاتی گواہی کی بنیاد پر تو نہیں کرے گا۔ یعنی کسی تھانے کا تفتیشی آفیسر، یا کسی ادارے کا وکیل مجرم یا جرم کے بارے میں جیسا کیس پہلے دن بنا کر ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں لائے گا، جو چالان، گواہوں کی جو فہرست، فرد جرم کی جو نوعیت آغاز میں موجود ہو گی، سپریم کورٹ تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یعنی مجرم اور استغاثہ اگر پہلے دن گٹھ جوڑ کر لیں تو اس عدالتی نظام میں انصاف کا اور کوئی راستہ باقی نہیں بچتا۔ پھر جب کوئی مجرم حکومت کی سرپرستی میں آجاتا ہے تو اس سے زیادہ خوفناک اور ہیبت ناک عفریت کوئی نہیں ہوتی۔ اس کے مقابل کھڑے ہونا، اسے مجرم کہنا، اس کے خلاف گواہ بننا یہ سب ایک خواب بن جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگر مجرم خود حکومت بن جائے، منتخب نمائندہ کہلانے لگے، اقتدار کے ایوانوں میں بسیرا کر لے تو اس کے خلاف صفحہ مثل پر ثبوت فراہم کرنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایان علی سے پانچ لاکھ ڈالر برآمد کرنے والا کسٹم کا اہلکار دن دہاڑے قتل کر دیا جاتا ہے اور عدالت بے بسی سے اس بات کا انتظار کرتی رہ جاتی ہے کہ چالان نہیں آیا، فرد جرم نہیں عائد ہو سکتی اور باہر جرم اور مجرم کی خوبصورت "کیٹ واک" میڈیا کے ہوس زدہ ماحول کو رنگین بنا رہی ہوتی ہے۔

اسی اینگلو سیکسن عدالتی نظام کا ایک روپ جوڈیشل کمیشن ہیں۔ ان کی رپورٹوں سے پاکستان کے دفاتر اور لائبریریوں کی الماریاں بھری پڑی ہیں۔ ان کمیشنوں کی ایک عجیب و غریب تاریخ ہے۔ یہ ہمیشہ اس وقت قائم کیے گئے جب عوام کی اکثریت کسی خاص مسئلے پر جذباتی سطح پر پہنچ چکی ہو، معاشرہ ایک ہیجان کا شکار ہو، لوگ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچتا دیکھنا چاہتے ہوں، حالات دن بدن قابو سے باہر اور لوگوں کا غصہ اپنے عروج پر ہو تو پاکستان کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ایک عدالتی کمیشن قائم کر دیا جاتا ہے اور پھر وہاں عدالتی نظام کی وہ ازلی ابدی بحث شروع کر دی جاتی ہے، ثبوت لاؤ، صفحہ مثل پر کچھ نہیں ہے اور آخر میں کئی سو صفحات پر طویل ایک فیصلہ یا ایسی رپورٹ تحریر کر دی جاتی ہے جس میں نہ جرم کا تعین ہو اور نہ ہی مجرم کا پتہ چلے۔ بس ایک تحقیقاتی مضمون مرتب ہو جائے اور اگلے کئی سالوں کیلئے لکھنے والوں کو موضوع ملتا رہے۔ جوڈیشل کمیشن بنانے کا آغاز 1953ء میں ہوا جب یکم فروری کو پنجاب اور خصوصاً لاہور میں قادیانیوں کے خلاف تحریک کا آغاز ہوا جو دیکھتے ہی دیکھتے شہروں، قصبوں اور گلیوں محلوں میں پھیل گئی۔ تشدد اور انتظامی ناکامی نے مارشل لاء کو راہ دکھائی اور بالآخر 19 جون 1953ء کو 23 چیف جسٹس پاکستان جسٹس منیر کی سربراہی میں ایک عدالتی کمیشن بنا جس نے یکم جولائی 1953ء سے جنوری 1954ء تک سماعت کی اور دس اپریل کو اس کی رپورٹ جاری کر دی گئی۔ یہ واحد رپورٹ ہے جو انگریزی، اردو اور بنگالی میں شائع ہوئی اور اس قدر کثیر تعداد میں شائع ہوئی کہ آج بھی فٹ پاتھ پر موجود کباڑیوں کے پاس مل جاتی ہے۔ اس رپورٹ اور اس کمیشن کا بظاہر مقصد لوگوں کی توجہ اصل معاملے سے ہٹا کر انہیں اسلام اور تصور پاکستان کے بارے میں مشکوک کرنا تھا۔ مدتوں اس رپورٹ کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا، صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ پاکستان تو ایک سیکولر بنیادوں پر تیار ہوا ملک تھا اور قائداعظم کا تصور بھی ایسا تھا۔ لوگ کمیشن سے یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ وہ اس سطح پر اپنی رپورٹ میں مبالغہ شامل کریں گے اور دانستہ طور پر مواد کو اپنے حق میں بدل لیں گے، لیکن بھلا ہو سی لنہ کریم کا کہ وہ برطانوی آرکائیوز میں موجود قائداعظم کے مغربی پریس کو دیئے گئے انٹرویو کے اصل متن تک جا پہنچی تو حیران رہ گئی کہ کوئی اعلیٰ سطح کا عدالتی کمیشن بھی قائداعظم کے انٹرویو کی عبارت کو توڑ مروڑ نہیں بلکہ بدل کر اپنی رپورٹ میں شامل کر سکتا ہے تاکہ ثابت ہو سکے کہ قائداعظم ایک سیکولر پاکستان چاہتے تھے۔ اس کی یہ تحقیق Pakistan(WhatNationdontknow) SeeularJinnahand کے نام سے چھپ چکی ہے اور پاکستان کے اس پہلے جوڈیشل کمیشن کا جھوٹ اور فریب واضح ہو چکا ہے لیکن دکھ کی بات یہ کہ اسے ظاہر ہونے میں 50 سال لگ گئے۔ اتنی دیر تک لوگ منیر رپورٹ پر سچ کی حد تک یقین کرتے رہے۔ اس کے بعد 1971ء کا سانحہ ہوا، ملک دولخت ہو گیا۔ پورا ملک رنجیدہ اور غمزدہ تھا۔ عوام دھڑوں میں تقسیم تھے، ایک حصہ سمجھتا تھا کہ ملک فوجی قیادت کی نااہلی کی وجہ سے ٹوٹا، جبکہ دوسرا سیاسی قیادت کو بھی برابر کا ذمہ دار ٹھہراتا تھا۔ اس بحث کے طوفان میں جوڈیشل کمیشن ہی واحد راستہ تھا۔ حمود الرحمٰن کمیشن بنا لیکن چونکہ کمیشن کا مقصد صرف وقتی ابال کو ٹھنڈا کرنا تھا، اس لیے اس کمیشن کی رپورٹ کو سرد خانے میں ڈال دیا گیا جو تیس سال بعد برآمد ہوئی تو وہی تاریخی حقائق کی بحث، محرومیوں کے رونے، نہ جرم کی نوعیت کا تہ پتہ اور نہ مجرم کی واضح نشاندہی۔ اس کے بعد یہ دستور چل نکلا کہ جب بھی عوامی غیظ و غضب کو ٹھنڈا کرنا ہو، کسی واضح حقیقت اور جرم کو شک کی قبا پہنانا ہو تو جوڈیشل کمیشن بنا دو، مرضی کے مطابق ہو تو رپورٹ جاری کر دو ورنہ سرد خانے تو سجتے ہی ایسی رپورٹوں سے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے سانحات سے لے کر اسامہ بن لادن تک عدالتوں کے ججوں نے لاتعداد رپورٹیں جمع کروائیں۔ اس ملک کے انتظامی ڈھانچے اور عدالتی نظام کو درست کرنے کے لیے بھی کمیشن بنے، ان کی موٹی موٹی رپورٹیں آج بھی الماریوں میں مل جائیں گی۔ کارنیلس رپورٹ بہت مشہور ہے لیکن وہی تاریخی دستاویز، وہی گول مول جوابات، "آفیسر اچھے کیوں نہیں آتے کیونکہ مراعات بہت کم ہیں، مراعات کم کیوں ہیں کیونکہ آفیسر اچھے نہیں آ رہے۔" اخباروں کے مضامین اور یونیورسٹیوں میں جمع کرائے جانے والے تحقیقی مقالوں کی طرح لکھی جانے والی جوڈیشل کمیشنوں کی ان رپورٹوں کے بعد حکومتیں اور مقتدر قوتیں مطمئن ہو جاتی ہیں کہ ہم نے طوفان کا راستہ روک دیا ہے۔ ہم نے غبارے میں سے ہوا نکال دی ہے لیکن انہیں اس بات کا اندازہ تک نہیں ہوتا کہ جب تک جرم اور مجرم ایک حقیقت کی طرح موجود رہیں گے غبارے میں ہوا بھرتی رہتی ہے۔ جسٹس منیر نے 1954ء میں لوگوں کو مسلمان کی تعریف اور نظریہ پاکستان کے تصور میں الجھا کر یہ سمجھ لیا تھا کہ طوفان ختم ہو گیا لیکن ٹھیک بیس سال بعد 1974ء میں وہ طوفان پاکستان کی اسمبلی تک جا پہنچا اور جو تعریف جسٹس منیر نہ کر سکا تھا اسے اسمبلی کے ارکان نے کر دکھایا۔ جو ثبوت عدالتی کمیشن کے سامنے نہ آ سکا وہ ایک گونجتے ہوئے سچ کی طرح اسمبلی کی راہداریوں میں نظر آ گیا۔

پاکستان کی تاریخ کا ایک اور جوڈیشل کمیشن ایک رپورٹ مرتب کر کے ابھی ابھی رخصت ہو گیا اور اپنی رخصتی سے پہلے یہ تحریر کر گیا کہ ہم تک جو ثبوت پہنچے ہم نے ان کے مطابق فیصلہ کیا۔ لیکن گوادر سے گلگت تک ہر آنکھ گواہ ہے کہ کیسے قصبوں، دیہاتوں اور گوٹھوں پر قابض بندوق بردار، خاندانی اثر و رسوخ اور جرم کے بادشاہ لوگوں کو ہانکتے ہوئے پولنگ سٹیشنوں تک لاتے ہیں۔ کس طرح معمولی استاد جو پریزائیڈنگ آفیسر ہوتا ہے وہ خوف کے سائے میں ہوتا ہے، کیسے بیوروکریسی آئندہ مستقبل کے لیے اپنے منظور نظر سیاستدانوں کے الیکشن کی راہ ہموار کرتی ہے، سرمایہ کیا کرشمے دکھاتا ہے۔ کیسے الیکشن مکمل ہونے کے بعد ایک اجتماعی جھوٹ بولا جاتا ہے ہر جیتنے والا حلفاً کہتا ہے کہ اس نے صرف چند لاکھ روپے خرچ کیے۔ لوگ سب جانتے ہیں اور حقیقت ان کے سامنے روز روشن کی طرح واضح ہے لیکن جیسے نامی گرامی چور، ڈاکو، بھتہ خور، دہشت گرد اور سمگلر عدالت سے عدم ثبوت کی بنیاد پر باعزت بری ہو کر باہر نکلتا ہے ویسے ہی ہماری جمہوریت بھی آج باعزت طور پر بری ہو گئی۔ طوفان تھم چکا ہے لیکن طوفان تھما نہیں کرتے ایک ایسے خول میں بند ہو جاتے ہیں جہاں ان کی چاپ تک سنائی نہیں دیتی اور پھر وہ ایک دن دھماکے سے خول توڑ کر باہر نکل آتے ہیں۔ جیسے جسٹس منیر کے عدالتی کمیشن کی رپورٹ دھری کی دھری رہ گئی تھی اور لوگوں نے 1974ء میں خود فیصلہ نافذ کروا دیا تھا۔

ایک ایماندار جج کے چھ سوالات

آج ایک ایسے شخص کی وکالت میں مجھے قلم اٹھانا ہے' ایسے فرد کے کردار کی گواہی دینا ہے کہ جس کے بارے میں میرا یقین ہے کہ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو روز حشر مجھ سے ضرور سوال کیا جائے گا۔ مجھے سید الانبیاء ﷺ کی حدیث میں درج اس انجام کا بھی خوف ہے جو ہادی بر حق ؐ نے اس شخص کے بارے میں فرمایا۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے "اگر کسی نے اپنے مومن بھائی کی اس وقت مدد نہ کی جب اس کو بے آبرو کیا جارہا تھا تو اللہ اس کو ایسے وقت میں تنہا چھوڑ دے گا جب اسے بے آبرو کیا جارہا ہو اور وہ مدد کے لئے لوگوں کی جانب دیکھ رہا ہو"۔ مجھے پاکستان کی عدلیہ کے ایک ایسے باکردار' منصف مزاج' ایماندار اور صالح شخص کے حق میں ایسے وقت میں گواہی دینے کا شرف حاصل ہو رہا ہے جب جمہوری اقدار کے پروانے اور آزادی اظہار کے دیوان اس کی کردار کشی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اللہ مجھے اس ذمہ داری کا حق ادا کرنے کی توفیق دے کہ مجھ سے دہرا سوال ہوگا۔ مجھے اللہ نے قلم کی طاقت عطا فرمائی اور پھر اسی اللہ نے اس طاقت کو پذیرائی بخشی۔ اللہ میری خطاؤں کو معاف فرمائے اور اس دوران میں جو لکھوں اس پر فیصلہ کرتے ہوئے میرے حسن ظن اور نیک نیتی کو سامنے رکھے۔

آج سے تقریباً دو دہائیاں قبل گوجرانوالہ میں ایک سیشن جج کے خلاف وہاں کے وکلاء نے ہڑتال کر دی اور اس کے تبادلے کے لئے سرگرم ہو گئے۔ پنجاب ہائی کورٹ کی سربراہی اس وقت جسٹس فلک شیر کے پاس تھی۔ وکلا تنظیموں کا بڑا گٹھ جوڑ ہوتا ہے اور انصاف تو بنچ اور بار کا یرغمال ہے۔ کس کو کب' کیسا' کتنا مہنگا اور کتنی دیر میں انصاف ملے گا اس کا فیصلہ بنچ اور بار مل کر کریں گے۔ اس جج نے اس روایت کو توڑنے کا اعلان کیا اور کہا کہ بحیثیت سیشن جج میری ذمہ داری سستا اور فوری انصاف فراہم کرنا ہے۔ پنجاب کے موجودہ انسپکٹر جنرل پولیس اس وقت گوجرانوالہ میں ڈی آئی جی تھے۔ تمام تھانوں کے سربراہوں کو بلایا گیا اور جج صاحب نے ان سے کہا کہ آپ بلاوجہ تعمیل میں دیر نہیں کریں گے اور گواہوں کو غیر ضروری طور پر پیشی سے نہیں بھگائیں گے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی وکیل کو بلاوجہ تاریخ نہیں دوں گا۔ اس کے بعد کیسوں کے فیصلے ہونا شروع ہوئے۔ گوجرانوالہ کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ ایک قتل کے کیس کا فیصلہ کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ چار دن میں کیا جانے لگا۔ صرف چند مہینوں کے اندر تمام وکلا اپنے چیمبرز میں ہاتھ پہ ہاتھ ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہڑتال شروع ہوئی۔ جسٹس فلک شیر تک اس ہڑتال کی گونج پہنچی۔ پوچھا مسئلہ کیا ہے۔ وکیلوں کی زبان میں کہا' یہ سیشن جج ہمیں "ریلیف" نہیں دیتا۔ "ریلیف" ایک ایسا لفظ ہے جو پاکستان کے عدالتی نظام میں سکہ رائج الوقت ہے۔ وکیل عدالت سے پیشیاں اور تاریخیں لیتے جب تک اپنے موکل کو ہلکانہ کر لیں' ان کو مقروض نہ بنالیں' ان کی جائیداد بکوالیں نہ ان کی وکالت کا رعب پڑتا ہے اور نہ ہی ان کی زندگی خوشحال ہوتی ہے۔ فلک شیر بھی خوش قسمتی سے ایسے چیف جسٹسوں میں سے تھا جن پر بار کا ناجائز رعب نہیں چلتا تھا۔ کاظم علی ملک نے کہا میں نے گزشتہ پندرہ سال سے التواء کا شکار مقدمے ختم کر دیئے۔ لوگوں ایک جانب ہو گئے۔ جو مطمئن تھے وہ چین سے سو گئے اور جو غیر مطمئن تھے وہ اپیل میں چلے گئے۔ فلک شیر کا اگلا سوال وکلا سے تھا' اب صاف صاف بتاؤ' کچھ صاف گو وکلا نے کہا ہم چیمبر بند کر کے چابیاں آپ کو دے دیتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ کاظم علی ملک نے کہا کہ جتنے لیڈر میرے خلاف ہڑتال کر رہے ہیں وہ مجھے پہچانتے تک نہیں۔ وہ آج تک میری عدالت میں پیش تک نہیں ہوئے۔ یہ میرا اس انسان سے ایک غائبانہ تعارف تھا۔ ان دنوں میں خود ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت پر فائز تھا۔ یوں لگا جیسے کسی نے میرے راستے کے آگے آگے مشعل رکھ دی ہو اور اس مشعل کو کاظم علی ملک نے تھاما ہوا تھا۔ میں اس شخص کی ٹوہ میں لگ گیا۔ اسے جاننے کی کوشش کرنے لگا۔

ضلع خوشاب کے قصبے نور پور تھل میں یکم اکتوبر 1949ء کو پیدا ہونے والے کاظم علی ملک نے جوہر آباد ڈگری کالج سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ یہ زمانہ طلبہ یونینوں کا زمانہ تھا۔ وہ 1968ء میں کالج یونین کا صدر بھی منتخب ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی سے قانون کا امتحان پاس کرنے کے بعد اس نے جوہر آباد اور سرگودھا میں وکالت شروع کر دی۔ 1987ء میں اسے ایڈیشنل سیشن جج مقرر کیا گیا۔ یہاں سے ماتحت عدلیہ میں ایک قابل فخر سپوت کی آمد ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے شہروں میں اس کا مقدمات کو فیصلے کرنے کا انداز وہی تھا جو گوجرانوالہ میں تھا۔ پنجاب میں بھلوال ان تحصیلوں میں سے ہے جہاں جرائم کی کثرت ہے۔ تین ماہ بعد بھلوال کے تمام زیر التوا مقدمات کے فیصلے ہو چکے تھے۔ انہیں کہا گیا آپ سرگودھا کا بھی چارج ساتھ ہی رکھ لیں۔ یہ اور ایسی کہانیاں میانوالی اور لیہ میں بھی عوام آپ کو سنائیں گے۔ 2008ء میں وہ منزلیں طے کرتے ہوئے ہائی کورٹ کے جج بن گئے۔ عدلیہ کی آزادی کا غلغلہ تھا۔ مشرف اور پھر زرداری کے بنائے ہوئے ڈوگر عدالت کے جج ایک ہی فیصلے سے ختم کر دیئے گئے۔ کاظم علی ملک کا یہ سوال آج بھی جواب طلب ہے کہ کیا یہ اس کے بس میں تھا کہ وہ اس سال اپنی پرموشن کی سطح پر پہنچتا کہ جب ڈوگر چیف جسٹس تھا۔ واپس سیشن جج بنے' ریٹائر ہوئے اور پنجاب میں ڈائریکٹر جنرل اینٹی کرپشن لگا دیئے گئے۔ یہاں بیوروکریسی سے ان کی ٹھن گئی۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا عہدہ جسے بیوروکریسی نے اس لیے تخلیق کیا ہو کہ ان کی مرضی کی کارروائیاں ہوں' لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی جائے کہ ہم کرپشن کے خلاف بہت کچھ کر رہے ہیں۔ ایک ایسا چیف سیکرٹری ان کے خلاف ہوا جو ہمیشہ سیاست دانوں کی آنکھ کا تارا رہا ہے اور جس کے ہاں اطاعت گزاری ہر اصول پر فوقیت رکھتی تھی۔ صرف ایک فقرہ کافی تھا کہ اگر کاظم علی ملک اینٹی کرپشن کے محکمے میں رہا تو جس طرح بیوروکریسی پر وہ ہاتھ ڈال رہا ہے' آئندہ الیکشنوں میں آپ اپنا انجام سوچ لیں۔ یہ فقرہ کسی بھی وزیر اعلیٰ کے پاؤں تلے سے زمین نکالنے کے لئے کافی تھا۔ ہٹا دیئے گئے کہ اس تباہ حال سسٹم میں ایماندار اور با اصول شخص کا یہی انجام ہوتا ہے۔

میں ٹیلی ویژن پر ایک پروگرام متبادل کے نام سے کرتا ہوں۔ جس میں موجودہ نظام کی ناکامی پر بحث کے بعد ایک متبادل دیا جاتا ہے۔ عدلیہ کے حوالے سے کاظم علی ملک میرے مہمان تھے۔ ان کا ایک ایک فقرہ عدلیہ کی تاریخ بدل سکتا ہے۔ کہا اگر واقعی ہمارے جج ایمانداری سے کام کریں اور وکیلوں کے رزق میں اضافہ کرنے کے لئے تاریخیں نہ دیں تو عدالتوں پر اتنا کم بوجھ ہے کہ آدھے جج فارغ کرنا پڑیں گے۔ آدھے سے زیادہ سول کیس صرف ایک پیشی پر ختم کیے جاسکتے ہیں اور قتل جیسا مقدمہ بھی تین دن لگاتار شنوائی کے بعد فیصلے تک جا پہنچتا ہے۔ کہا' دیکھو لوگوں کو عدالتوں میں بلاؤ فیصلوں کے لیے' اپنے برآمدوں کی رونق بڑھانے کے لئے نہیں۔ اللہ جس کو عدل کی کرسی پر بیٹھ کر انصاف کی توفیق دے' اس کا اپنے کردار پر اعتماد دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ میں نے آج سے چھ ماہ قبل اسی پروگرام میں این اے 122 کے بارے میں سوال کیا۔ میں نے اتنا کہا کہ میرے ماں باپ کی تربیت' اور میرے اللہ کا کرم یہ ہے کہ اللہ نے مجھ سے غلط کام کرنے کی توفیق ہی چھین لی ہے۔ فیصلے پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ لیکن فیصلہ آنے کے بعد مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ فیصلہ کیا آیا۔ مجھے اس فیصلے کے آغاز میں جسٹس کاظم علی ملک نے جو چھ سوال خود سے کیے ہیں وہ اس قوم کے سامنے رکھنا ہیں۔ ان سوالات میں ایک درد بھی چھپا ہے اور آپ اس دباؤ کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں جو اس صاحب ایمان جج پر تھا۔ کاظم علی ملک لکھتے ہیں۔ فیصلے سے پہلے میں نے اپنے ضمیر سے چھ سوال کئے۔ 1- کیا میں صرف خورونوش کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ 2- کیا میں کھونٹے پر بندھے اس جانور کی طرح ہوں جسے اپنے چارے کی فکر ہوتی ہے۔ 3- کیا میں ایک بے لگام درندہ ہوں جسے کھانے کے سوا اور کسی چیز سے سروکار نہیں ہوتا۔ 4- کیا مجھ میں دین' ضمیر یا اللہ کا خوف نہیں ہے۔ 5- کیا مجھے اس کائنات میں بلا روک ٹوک ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ 6- کیا مجھے یہ حق ہے کہ میں صراط مستقیم کو چھوڑ کر باطل قوتوں کی راہوں میں بھٹکتا رہوں۔ یہ چھ سوال پاکستان کے ہر اس فرد کو اپنے آپ سے ضرور کرنا چاہئیں جو اس مکروہ اور گلے سڑے نظام میں اس بات پر جھک جاتا ہے' حق کی راہ میں ہٹ جاتا ہے کہ اقتدار پر قابض افراد اس کی اور اس کے خاندان کی جانوں کے دشمن ہو جائیں' انہیں کی زندگیاں مشکل کر دیں گے' انہیں بے موت ماردیں گے۔ اگر ان کا ضمیر ان کا جواب نفی میں دے تو سمجھو وہ اس دنیا میں بھی سرخرو اور آخرت میں بھی۔ جسٹس کاظم علی ملک نے لکھا میرے ضمیر نے ان سوالوں کا جواب نفی میں دیا تو میں نے نظریہ ضرورت کو پس پشت ڈال کر تلخ سچ بول دیا۔ سچ کی تلخی وہ کڑوی دوا ہے جو اس قوم کی تمام امراض کا علاج ہے۔

ایک ہی خاندان

برصغیر پاک وہند پر اپنی حکمرانی کو مسلط اور مستحکم کرنے کے لیے انگریز نے دو ادارے قائم کیئے۔ ایک سول سروس اور دوسرا فوج۔ یہ دونوں ادارے شروع دن ہی سے کسی نہ کسی شکل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں اور علاقائی فتوحات کے لیے سرگرم رہے۔ 1757 میں بنگال کی فتح کے ساتھ ہی انتظامی امور کے لیے ایک مختصر سا نظام وجود میں آیا۔ آہستہ آہستہ یہ دونوں ادارے یہاں کے حالات، ماحول، تہذیب وثقافت اور انگریز کی حکمرانی کے اہداف کے مطابق بنتے اور سنورتے رہے۔ ان دونوں اداروں میں انگریز نے کچھ اداراتی اخلاقیات اور ایک مخصوص گروہی تہذیب کو فروغ دیا۔ سول سروس اور فوج، دونوں کے افسران اپنے رہن سہن، بول چال، تہذیبی اقدار، اخلاقی سوچ، لباس، یہاں تک کہ بہت حد تک بولنے کے انداز تک سے پہچانے جاتے تھے اور آج بھی ان کا یہ نقش اور ٹھپہ قائم نظر آتا ہے۔ سول سروس تو اس قدر سیاسی اور انتظامی تبدیلیوں کی زد میں آئی کہ اپنا وہ حلیہ برقرار نہ رکھ سکی، لیکن فوج نے چونکہ پہلے دن سے لے کر آج تک انگریز کے بنائے ہوئے قواعد وضوابط میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی، اسی لیئے آپ کو انگلستان کا ریٹائرڈ جنرل، کرنل یا بریگیڈیر اور بھارت، پاکستان یا بنگلہ دیش کا ریٹائرڈ آفیسر ایک طرح کی عادات وخصائل کا حامل نظر آئے گا اور آپ اسے فوراً اس کی چال ڈھال سے پہچان لیں گے کہ یہ ایک ریٹائرڈ فوجی ہے۔ آج سے تیس سال قبل تک یہ پہچان سول سروس کے ساتھ بھی وابستہ تھی اور ان سول افسران کی بھی دوران ملازمت اور بعد از ملازمت زندگی پہچانی جاتی تھی۔

ان دونوں اداروں کو انگریز نے سرکار کا وفادار بنانے اور انگریزی تہذیب وثقافت سے مرعوب رکھنے کے لیے انہیں چند سبق ازبر کروائے۔ ان میں سب سے پہلا سبق انگریزی تھی۔ غلط بولو، بری بولو، لیکن انگریزی بولو۔ اسی لیے پورے برصغیر کی فوج کی ایک مخصوص انگریزی نکل کر سامنے آئی۔ دوسری جانب سول سروس میں چونکہ عام آدمی سے تعلق پڑتا تھا اس لیے علاقائی زبان کو ایک اختیاری ذمہ داری کے طور پر سیکھنا ان کیلیئے لازمی قرار دیا گیا، لیکن افسران کی دفتری اور ماحولیاتی زبان انگریزی ہی رہی۔ یوں وہ کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، خواب دیکھتے اور گفتگو کرتے اس بات کا خیال رکھتے کہ کہیں انہیں عام آدمی نہ تصور کر لیا جائے۔ علاقائی زبان سیکھنے پر علیحدہ الاؤنس دیا جاتا۔ تمام ضلعی انتظامیہ کے دفاتر میں ایک شعبہ انگریزی کا ہوتا اور دوسرا علاقائی زبان کا جسے ورنیکلر کہتے۔ اس ورنیکلر میں بھی زیادہ تر فارسی زبان استعمال ہوتی اس لیئے کہ صدیوں سے برصغیر کی دفتری زبان فارسی تھی اور قدیم ریکارڈ اسی زبان میں تھا۔ ان دونوں اداروں کے افسران کو زندگی گذارنے کے جو اصول سکھائے گئے وہ خالصتاً سیکولر اور ریاستِ انگریز سے وابستہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک مقامی ڈپٹی کمشنر اپنے ہی قبیلے، قوم یا مذہب کے افراد پر لاٹھی چارج کر لیتا، جیل بھیج دیتا، یہاں تک کہ گولی بھی چلا دیتا۔ اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ سامنے والا شخص کس قدر حق پر ہے، یہ جلوس، جلسہ یا پھر لوگوں کا علم بغاوت دراصل حاکم کے خلاف ہے، جس کا وہ ملازم ہے خواہ وہ انگریز قابض ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے نزدیک امن عامہ کا قیام اس کی بنیادی ذمہ داری تھی اور باغی کو کچلنا فرض اولین خواہ وہ اس کی طرح کلمہ پڑھتا ہو یا بھگوت گیتا۔ اس کے جذبات ہو سکتا ہے ہجوم کے ساتھ ہوں لیکن نوکری کرنے کی ایسی غلامانہ صفت اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف ان پر گولی تک چلانے کے احکامات صادر کر دیتا تھا۔ یہی حال فوج کا تھا۔ اس کے نزدیک سرحدی تحفظ، علاقائی سالمیت اور بغاوت کا قلعہ قمع سب سے اہم تھا اور یہی ذمہ داری اس کے وجود کا جواز تھی۔ اسی لیے مسلمان کو مسلمان پر، ہندو کو ہندو اور سکھ کو سکھ پر گولی چلانے یا اس سے جنگ کرنے میں ذرا سا بھی تامل نہ ہوتا۔ تاجِ برطانیہ سے وفاداری اس وقت کے ایک فوجی کی معراج تھی۔ اور وہ اپنی زبان بولنے والوں، بلکہ اپنے قبیلے والوں سے بھی لڑنے کے لیے میدان میں اتر آتا۔ اس لیے کہ اسے اس بات کا درس دیا گیا تھا کہ وردی پہننے کے بعد تم نے ایک نیا قبیلہ، گروہ یا برادری کو اختیار کر لیا ہے، اب تمہارا مرنا جینا انہیں کے ساتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آہستہ آہستہ سول سروس اور فوج کے افسران کی آپس میں ہی رشتے داریاں ہونے لگیں۔ وہ جو برادری، نسل رنگ سے باہر نہیں نکلتے تھے انگریز کی غلامی کے بالادست رشتے میں پیوست ہونے لگے۔

ان دونوں اداروں نے اس برصغیر میں اپنے اور عوام کے درمیان مناسب فاصلہ رکھنے کے لیے ایک اور طبقہ ”زرعی اور سیاسی اشرافیہ“ کو تخلیق کیا۔ وہ لوگ جنہیں ہزاروں ایکڑ زمینیں عطا کی گئیں۔ یہ زمینیں خالصتاً وفاداری کے صلے میں دی گئیں۔ جس نے جنگوں میں جتنے زیادہ کڑیل جوان انگریز کی فوج میں بھرتی کروائے تھے، وہ اتنا ہی بڑا، خان، نواب، چودھری، وڈیرہ اور تمن دار بنا دیا گیا۔ ان سب کی اولادوں کو انگریزی تہذیب اور سول سروس اور فوج کی طرح اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے لاہور میں چیف کالج کھولا گیا جسے ایچیسن کالج کہا جاتا ہے۔ یہاں اس سیاسی اشرافیہ کو وہی سب کچھ سکھایا گیا جو سول سروس اور فوج کو سکھایا جاتا تھا۔ یوں ان لوگوں کا رہن سہن، عادات واطوار اور سوچ سب کی سب ایک جیسی ہو گئی۔ کتنے ایسے عہدے تخلیق کیے گئے جو انتظامی امور میں سول سروس کی مدد کرتے اور مراعات یافتہ زندگی گذارتے۔ آنریری مجسٹریٹ سے لے کر نمبردار تک ان سب پر اس سیاسی اشرافیہ کے فرزندان فائز ہوتے اور ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے دفتر اور گھر پر لہرائے جانے والے برطانوی پرچم کی بالادستی کے لیے کام کرتے۔ انہیں بھی انگریز سرکار کی حکومت کی رٹ قائم کرنے کے لیے اپنی قوم، اپنی نسل یہاں تک کہ اپنے ہم مذہب لوگوں کو دبانے، انہیں انگریز کا وفادار بنانے اور یہاں تک ان کے خلاف مخبری کر کے سزا دلوانے میں بھی کوئی شرم محسوس نہ ہوتی۔ یہ سب وہ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے کر رہے ہوتے جسے ریاست یا حکومت کی رٹ کہا جاتا ہے۔ یہ تیسرا طبقہ جسے سیاسی اشرافیہ کہا جاتا تھا اقتدار کے ایوانوں میں ان دونوں طبقات کا شریک ہو گیا، لیکن اس کی حیثیت مرعوب سی رہی۔ ڈپٹی کمشنر کی ایک رپورٹ کسی خان، وڈیرے یا چودھری کی ساری وفاداریوں پر پانی پھیر سکتی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس طبقے نے جب اپنی وسیع جائیدادوں اور سرکاری دفاتر میں اثر ورسوخ سے لوگوں کو اپنا مطیع بنا لیا اور انگریز کو یہ یقین ہو گیا کہ اب اس سیاسی اشرافیہ نے عوام کو اچھی طرح جکڑ لیا ہے اور عوام انہیں چھوڑ کر ادھر ادھر نہیں جا سکتے، تو اس نے لوکل کونسل، لیجس لیٹیو کونسل وغیرہ کے انتخابات شروع کروا دیئے، تاکہ لوگوں کو اس فریب میں مبتلا کیا جائے کہ یہ جو وزیر اعلیٰ ہے، یہ تمہارے ووٹ سے برسر اقتدار آیا ہے۔ یہ سیاسی اشرافیہ، فوج اور سول سروس کے ساتھ رشتے داریوں کے بندھن میں بندھنے لگی اور یوں اس برصغیر میں ایک ایسا وسیع خاندان وجود میں آ گیا جو سید، مرزا، جاٹ، گجر، خٹک، آرائیں، گبول وغیرہ تو نسلاً تھے لیکن ان کی رشتے داریاں اسی اشرافیہ سے باہر نہیں ہوتی تھیں۔ باپ جرنیل تو بیٹا ڈپٹی کمشنر اور داماد اسمبلی کا رکن۔ عرب انساب کے بہت ماہر ہوا کرتے تھے۔ برصغیر میں یہ کام مراثی کرتے تھے جو لوگوں کے شجرۂ نسب کو یاد رکھتے۔ آج اگر کوئی انساب کا ماہر اس ملک میں ان تینوں گروہوں کا شجرہ نسب ترتیب دے تو حیران رہ جائے، یہ سب تو ایک ہی دوسروں میں نسلوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے دکھ سکھ سب مشترک ہیں۔ یہ ایک دوسرے کا تحفظ کرتے ہیں۔ ان سب کا مفاد ایک ہے۔ ان سب کی صفوں میں اگر کوئی نیچ ذات کا کمی کمین اپنی محنت سے آ ملے تو چند ہی سالوں میں ایسا کندن بن کر نکلتا ہے کہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے، اور ایک دو نسلوں بعد تو وہ اشرافیہ کی ویسی ہی علامت بن جاتا ہے۔ ڈیڑھ سو سالوں سے یہی ایک خاندان ہے جس کی اس ملک پر حکومت ہے۔ گنتی کے یہ چند لوگ اٹھارہ کروڑ عوام پر آج بھی حکمران ہیں۔

علاقائی بالادستی کیلئے مسلک کا تڑکا

کیا یہ معرکہء حق وباطل ہونے والا ہے جس کی جانب پوری مسلم امت دو واضح گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ایک جانب چونتیس ملکوں کا اتحاد ہے جس کی قیادت سعودی عرب کر رہا ہے اور جسے پاکستان خوش آمدید کہہ چکا ہے اور دوسری جانب ایران، عراق اور شام۔ یہ دونوں گروہ واضح تو اب ہوئے ہیں لیکن ایک دوسرے کو قتل کرنے، شہروں کو برباد کرنے اور ظلم و تشدد روا رکھنے کا سلسلہ تو گزشتہ ایک دہائی سے جاری ہے۔اس معرکے کو دونوں گروہ حق وباطل کا معرکہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ علاقائی بالادستی کی اس جنگ کے شعلوں کو مسلکی نعروں سے جس طرح ہوا دی جا رہی ہے اس سے یہ معرکہ پوری دنیا میں پھیلتا نظر آرہا ہے۔یوں تو اس آگ کی تپش مشرقِ وسطیٰ کے ممالک ہی سہہ رہے ہیں لیکن فرقہ واریت کے اس طوفان کی افغانستان اور پاکستان میں بھی آنچ اب پہنچنے لگ گئی ہے۔ بلند و بالا مقدس نعروں کی گونج ہے، جس میں لوگوں کو جہاد کا راستہ دکھا کر ایک ایسے میدانِ جنگ میں اتارا جا رہا ہے جہاں صرف اور صرف مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں۔ افغانستان اور پاکستان میں طویل عرصے سے القاعدہ اپنے محاذوں کے لئے نوجوانوں کو ترغیب دیتی تھی اور کتنے افراد اس کے ہمراہ افغانستان میں لڑنے بھی نکل گئے تھے۔ لیکن القاعدہ کی لڑائی تو روس یا امریکہ کے خلاف تھی جہاں اس میں حصہ لینے والوں کو کم از کم یہ تسلی رہتی کہ وہ کافروں کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔اسی طرح افغانستان اور عراق میں لڑنے والے مجاہدین بھی کم از کم اخلاقی طور پر یہ جواز ضرور رکھتے تھے کہ کہ ان کے ملک پر غیر ملکی افواج نے حملہ کیا ہے اور لبرل سیکولر اخلاقیات کے نزدیک بھی ان غیر ملکی افواج سے لڑنا جائز بنتا ہے جبکہ اسلام کے حوالے سے تو ہزار ہا دلیلیں روس اور امریکہ سے لڑائی کے حق میں دی جا سکتی تھیں جو لوگوں کو لڑنے پر مجبور کر سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دلیلوں نے وہاں مستقل جنگیں لڑیں۔ لیکن موجودہ عراق و شام میں جاری لڑائی میں کونسی ایسی دلیل ہے جو باقی تمام ممالک خصوصاً افغانستان اور پاکستان سے لوگوں کو وہاں جانے پر مجبور کر رہی ہے۔ یہ دلیل بہت خوفناک ہے اور اس دلیل کو پیش کرنے والے یہی دو گروہ ہیں۔امت کو اس بنیاد پر تقسیم کرنے کا کام گزشتہ ربع صدی میں بہت تیزی سے آگے بڑھا ہے۔اس لئے کہ جب روس افغانستان میں داخل ہوا تو شیعہ سنی دونوں اس کے خلاف لڑنے کے لئے متحد تھے۔اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں ایرانی وزیرِ خارجہ نے اپنے وفد کے تمام ممبران کی جگہ افغان مجاہدین کو بٹھایا تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔یہاں تک کہ طالبان کے زمانے میں بھی انکی شیعوں پر مشتمل ایک ڈویژن تھی جو سنی طالبان کے ساتھ شانہ بشانہ مخالفین سے لڑتی تھی۔ بلکہ طالبان کی انفنٹری ڈویژن کا سربراہ ایک بدخشانی فارسی خوان تھا جو پشتون اکثریتی صوبے کا گورنر بھی تھا اور شیعہ مسلک سے تعلق رکھتا تھا۔عالمی استعماری مغربی طاقتوں کے مقابلے میں ایسا اتحاد کس کو گوارا تھا۔اسی لئے گیارہ ستمبر کے واقعہ کے بعد جب افغانستان اور عراق پر حملہ کر کے ان ممالک پر قبضہ کیا گیا تو سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا کہ کیسے مسلمانوں میں شیعہ اور سنی کی اس خلیج کو گہرا کیا جائے۔

چودہ سو سال کا تجربہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ خلیج اس وقت تک گہری نہیں ہو سکتی جب تک اسے علاقائی بالادستی اور علاقائی تہذیب و ثقافت کے نعروں کے ساتھ نہ جوڑا جائے۔اسی لئے ہمیشہ عرب و عجم کے قدیم جھگڑے کو مسالک کا تڑکا دے کر ابھارا گیا۔اس لئے کہ اگر صرف عرب اور ایران کا جھگڑا ہی رہتا تو یہ دونوں ممالک یا فارسی اور عربی زبان بولنے والے گروہ ہی آپس میں لڑتے۔ لیکن اگر ایک مسلک یعنی شیعہ کا نمائندہ ایران کو بنا دیا جائے اور دوسرے مسلک کی سرپرستی عرب ممالک کرنے لگیں تو پھر عربی، اردو، پنجابی اور پشتو بولنے والا شیعہ ایران کے ساتھ اور فارسی بولنے والا ایرانی، تاجک، ازبک سنی عرب ممالک کے ساتھ خود بخود کھڑا ہو جائے گا۔یہی وجہ ہے کہ اس علاقائی بالادستی کی اس جنگ کو دونوں گروہ ارفع اور اعلیٰ جہاد بنا کر پیش کر رہے ہیں۔

اس لڑائی میں امریکی اور مغربی طاقتوں کی ایک منصوبہ بندی شامل تھی۔القاعدہ اور دیگر گروہوں کے حوالے سے دنیا بھر سے مسلمان اس خطے میں لڑائی لڑنے کے لئے پہلے ہی سے پہنچے ہوئے تھے۔عراق پر جب امریکہ نے قبضہ کر لیا، اپنی مرضی کا آئین تحریر کر کے، اپنی مرضی کے الیکشن کروائے تو ایک وسیع البنیاد حکومت بنانے کی بجائے اس نے حکومت قائم کی جو شیعہ سنی اختلاف کو ابھارے۔2006ء سے لے کر 2008ء تک سنی اکثریتی علاقوں میں ایک جنگ شروع ہوئی جسے القاعدہ کا نام دے کر عام آبادی کا شدت کے ساتھ ایسا قتل عام کیا گیا کہ شہر کے شہر ویران ہو گئے۔اس قتل و غارت نے شیعہ سنی خلیج کو عراق میں بہت واضح کر دیا۔ آپ صرف اس بات سے اندازہ لگائیں کہ 2003ء سے 2005ء تک عراق جنگ میں مرنے والوں کی تعداد پہلے سال 8 ہزار، دوسرے سال 16 ہزار اور تیسرے سال 20 ہزار کے قریب تھی۔ لیکن جیسے ہی عراقی منتخب حکومت نے سنی علاقوں میں القاعدہ کے نام پر ایکشن شروع کیا تو 2006ء میں 35 ہزار، 2007ء میں 36 ہزار اور پھر 2008ء میں یہ مزاحمت دم توڑ گئی اور صرف 8 ہزار افراد قتل کیے گئے۔ لیکن اس مزاحمت کی کوکھ سے داعش نے جنم لیا اور اس کے چند ہزار سپاہی صرف انہی علاقوں میں کامیاب ہوئے جہاں گزشتہ سات سالوں سے عراقی حکومت یہ ظلم روا رکھے ہوئے تھی اور نفرت کی خلیج واضح ہو چکی تھی۔ عراق کی اس منتخب حکومت کے ساتھی شام اور ایران تھے۔ لیکن داعش سے بہت پہلے عرب ممالک نے مختلف سنی تحریکوں کو شام میں جیش الاسلام، حرکت و احرار الشام اور جبتہ النصرہ کے نام پر منظم کیا اور بشار الاسد کے خلاف بغاوت کا آغاز کرایا۔دوسری جانب عراق کے سنی گروہوں کو مالی اور دیگر امداد بھی عرب ممالک سے ملتی رہی۔ایران جو امریکی حملے سے لے کر امریکیوں اور اس کی کاسہ لیس حکومت کا مددگار تھا، بلکہ بعد کی حکومت کا سرپرست بھی تھا، اس نے تصور کیا کہ اب وہ اگر میدان میں نہ کودا تو اس کی علاقائی بالادستی ختم ہو جائے گی۔یوں وہ جنگ جو چھپ کر لڑی جا رہی تھی اب واضح ہو گئی۔داعش کے بعد دونوں گروہ کھل کر میدانِ عمل میں نکل آئے۔دونوں علاقے میں اپنے پالتو گروہوں کا قبضہ چاہتے ہیں۔ دونوں داعش کے خلاف متحد ہیں لیکن داعش کو ختم کر کے عراق اور شام کے کھنڈرات پر اپنا اپنا جھنڈا لہرانے کے لئے میدانِ عمل میں کود چکے ہیں۔ایک نے اس علاقائی بالادستی کا پرچم امریکہ کو تھما دیا ہے اور دوسرے نے علاقائی کنٹرول کا خواب روس کو دکھایا ہوا ہے۔

اگر ان دونوں گروہوں کی افواج آپس میں لڑ رہی ہوتیں تو شاید یہ خوفناک بات نہ ہوتی لیکن دونوں جانب سے مسلم امہ کے تمام ممالک میں مسلک کے نام پر گروہوں کو منظم کیا جا رہا ہے اور بھرتیاں شروع ہیں۔ ان بھرتیوں کا سب سے بڑا نشانہ پاکستان اور افغانستان کے شیعہ اور سنی نوجوان ہیں۔نومبر کے آخری ہفتے میں ایران میں دو پاکستانیوں کے جنازے کی تصاویر ایران میں بہت عام ہوئیں جو شام میں مارے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں پاراچنار سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ پاکستانی جو ایرانی پاسداران کے تحت ٹریننگ حاصل کرتے ہیں ان کے گروہ کا نام زی نبیون ہے۔ جبکہ افغانستان سے بھرتی کئے جانے والوں کا نام لیواء فاطمیون ہے۔ افغانستان سے بھرتی کئے گئے افراد کی تعداد 15 ہزار کے قریب ہے جو بشار الاسد کے لئے لڑ رہے ہیں جن میں سے سات سو کے لگ بھگ حلب اور دیرہ میں مارے جا چکے ہیں۔پاکستان سے زی نبیون کے نام پر بھرتی کئے جانے والوں کی تعداد دو ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے جن میں سے 20 کے قریب جاں بحق ہو چکے ہیں۔اسی طرح مشرقِ وسطیٰ میں بسنے والے شیعہ مسلک کے افراد بھی اس پکار پر لبیک کہہ رہے ہیں جبکہ بھارت سے تیس ہزار لوگوں نے نجف اور کربلا میں لڑنے کے لئے اس وقت درخواستیں جمع کروائیں تھیں جب داعش کا آغاز ہوا تھا۔ دوسری جانب مغربی ممالک سے سنی مسلمانوں کا داعش کے لئے آنے کا سلسلہ دھڑا دھڑ جاری ہے۔ تقریباً پانچ ہزار لوگ وہاں سے داعش کے لئے لڑنے پہنچے ہوئے ہیں۔ یعنی شام اور عراق میں ان دونوں گروہوں نے امتِ مسلمہ کا مسلک کی بنیاد پر خون بہانے کا سب سامان فراہم کر دیا ہے۔ سنی گروہوں کو یہ سبق پڑھایا گیا ہے کہ بشار الاسد کی حکومت کو ختم کر کے وہاں سنی اکثریت کی حکومت اسلام کے سنہری اصولوں کے مطابق قائم کرنا ہے۔ جبکہ شیعہ نوجوانوں کا المیہ عجیب ہے انہیں مزاراتِ مقدسہ کے تحفظ کے نام پر یہاں سے بھرتی کیا جاتا ہے اور وہ ایسے شہروں میں جا کر لڑ رہے ہیں جہاں کوئی مقدس مزار ہی نہیں ہے۔ زی نبیوں کی بھرتی کی جانے والی ویب سائٹ اور فیس بک پر لکھا ہے "پاکستانی مجاہدین کی فوج جو صرف اور صرف دفاعِ حرم کے لئے لڑ رہے ہیں اور نہ بشار سے کوئی تعلق ہے اور نہ ایران سے"۔ یہ ہے وہ مسلک کا تڑکا جو علاقائی بالادستی کی جنگ کو لگا کر امت میں فساد کا بیج بویا جا رہا ہے۔ صرف ایک سوال دونوں کے لئے چھوڑے جا رہا ہوں۔ کیا بشار الاسد کی حکومت بچ گئی تو سیکولر بشار الاسد فقہ جعفریہ کے مطابق اسلامی نظام نافذ کر دے گا، یا اگر سنی گروہوں کی اکثریت جیت گئی تو وہ اسلام کے درخشاں اصولوں پر حکومت قائم کریں گے ہرگز نہیں، وہ جو صرف مسلک کے اختلاف پر گردنیں کاٹتے ہوں وہ اس امت کو کبھی امن نہیں دے سکتے۔ایران ہو یا عرب ممالک۔

اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو

فیصلہ تو آپ نے اس دن کر لیا تھا کہ آپ اس رزمِ خیر و شر اور معرکۂ حق و باطل میں کس جانب ہیں جب 14 نومبر 1991 کو وفاقی شرعی عدالت کے جج جسٹس تنزیل الرحمٰن نے طویل سماعت کے بعد فیصلہ دیتے ہوئے بینکوں کے سود کو حرام قرار دیا تھا۔ آپ اس وقت اس مملکت خداداد پاکستان کے وزیراعظم تھے۔ ہو سکتا ہے آپ کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ تصور موجود ہو کہ یہ وزارت عظمیٰ آپ کو پاکستان کے عوام اور عالمی طاقتوں کی آشیرباد سے ملی ہے لیکن میرے جیسے "دقیانوس" اور آپ کے موجودہ لبرل خیالات کے حامل لوگ جنہیں "فرسودہ" اور ازکار رفتہ تصورات کا حامل گردانتے ہیں، ان کے نزدیک یہ فیصلہ کہ کس کو زمین پر اختیار دیا جائے اور کس سے چھین لیا جائے خالصتاً اللہ سبحان و تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں "کہہ دو کہ اے اللہ اے بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے چھین لے اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے۔ ہر طرح کی بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے اور بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے" (آل عمران۔26)۔ اللہ کسی کو بادشاہی' حکومت یا اختیار اس لئے عطا کرتا ہے کہ زمین میں اللہ کے احکامات کو نافذ کرے۔ اللہ فرماتا ہے "اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور لوگوں کو نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔ اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے قبضے میں ہے (الحج 41)۔ لیکن آپ نے 14 نومبر 1991 کو ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ نے عملی طور پر ایک ایسے گروہ کا حصہ بننا ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اعلان جنگ کرتا ہے۔ آپ نے وفاقی شرعی عدالت کے سود کے خلاف فیصلے کو بحیثیت وزیراعظم سپریم کورٹ میں چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا۔ سپریم کورٹ نے وقت کے حاکم کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو کالعدم قرار دے کر بحث کا آغاز کیا۔ کچھ عرصے بعد اللہ نے آپ سے وزارت عظمیٰ اس طرح چھینی کہ آپ کے حق میں آیا ہوا سپریم کورٹ کا فیصلہ بھی آپ کو وزارت عظمیٰ پر برقرار نہ رکھ سکا۔ شاید آپ سمجھتے ہوں کہ آپ سے استعفیٰ لینے کی سازش کا تانا بانا تو یہاں کی مقتدر قوتوں نے بنایا تھا اس کا اللہ تبارک و تعالیٰ سے کیا تعلق۔ لیکن میرے جیسے "دقیانوس" اور "فرسودہ' خیال لوگ تو یہی تصور کر کے اللہ پر اپنا ایمان مضبوط کرتے ہیں کہ اللہ نے آپ کو اس غلطی کی سزا دی۔ آپ کے بعد محترمہ بینظیر حکمران ہوئیں۔ انہوں نے ایک طریقہ ڈھونڈا کہ اس لڑائی میں براہ راست شریک نہ ہوا جائے بس دائیں بائیں ہو کر نکل جایا جائے۔ انہوں نے شریعت بنچ ہی مکمل نہ ہونے دیا۔ ظاہر بات ہے جب بنچ ہی مکمل نہ ہوگا تو شنوائی کہاں اور فیصلہ کہاں۔ آپ کو محترمہ بینظیر کی یہ روش اور ادا اس قدر پسند آئی کہ جب اللہ نے آپ کو دوبارہ اقتدار عطا کیا تو آپ نے بھی اپنے پورے عرصہ اقتدار میں سپریم کورٹ کا شریعت بنچ مکمل نہ ہونے دیا۔ آپ کو یہ حیلہ کرنے کا گر یقیناً آپ کے "مرشد اول" حضرت ضیاء الحق سے ملا تھا۔ شریعت اور شرعی قوانین کے نفاذ کے علمبردار ضیاء الحق نے جب 1981 میں وفاقی شرعی عدالت قائم کی تو اس پر ایک پابندی لگا دی کہ وہ دس سال تک مالی و معاشی معاملات کے متعلق کوئی درخواست وصول نہیں کرے گی۔ اللہ نے ضیاء الحق کو دس سال تک جانے کی مہلت ہی نہ دی۔ اللہ دلوں کے حال اور نیتوں کو خوب جانتا ہے۔ اسے ہی علم ہوگا کہ ضیاء الحق دس سال بعد اس مدت میں توسیع چاہتے تھے یا سود کے خلاف فیصلہ کرنے کی اجازت دینا چاہتے تھے۔ بہر حال وہ 1988 میں اس کے دربار میں جا پہنچے ہیں جہاں کوئی بہانہ کارگر نہیں اور کوئی مکر و فریب نہیں چلتا۔ وہ اعمال پر نیتوں کے حساب سے سزا دیتا ہے کہ صرف وہی ہے جو نیتوں اور دلوں کا حال جانتا ہے۔ میرے جیسے اللہ سے ڈرنے اور خوف رکھنے والے لوگ بھی آپ کو نیک نیتی کا فائدہ دیتے رہے۔ ہم لوگ سمجھتے رہے کہ آپ گزشتہ پینتیس سالوں سے سیاست کے میدان میں اللہ کے قوانین کے علمبردار بنے رہے' آپ نظریہ پاکستان کی چھتری تلے پناہ لیتے رہے۔ آپ کی تقریریں اور آپ کے چھوٹے بھائی کا علامہ اقبال کے شعروں کو دہرانا یہ ثابت کرتا رہا کہ ہو سکتا ہے آپ اس ملک میں اس خواب کی تکمیل چاہتے ہوں جو علامہ اقبال کی شاعری اور راتوں کی اشکباری میں جھلکتا تھا۔ جو آئین پیغمبر کا اس مملکت خداداد میں نفاذ چاہتے تھے۔ میں یہاں علامہ اقبال کے کئی سو اشعار تحریر کر سکتا ہوں لیکن شاید اب آپ انہیں سننا پسند نہ کریں۔ یہ سادہ دل لوگ یہ بھی سمجھتے رہے کہ آپ قائداعظم کے اصولوں کے مطابق ایک اسلامی پاکستان اور اسلامی معاشی نظام چاہتے ہیں کیونکہ آپ نے پینتیس سالہ سیاست میں اسلام اور نظریہ پاکستان کے سوا اور کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ وہی قائداعظم جنہوں نے گیارہ اگست کی تقریر کو جب لوگوں نے غلط معنی پہنانے کی کوشش کی کہ قائداعظم ایک لبرل اور سیکولر پاکستان چاہتے تو انہوں نے 25 جنوری 1948 کو کراچی بار میں ان سیکولر اور لبرل دانشوروں کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے کہا تھا"

"Princiles to day are as applicable to life as thy were 1300 years ago thattheconsitutionofPakistanwouldnotbemadeonSharialaw.Islamic ofthepeoplewhodeliberatlywantedtocreatemischiafandpropoganda IcouldnotunderstandThatasection"

"میری سمجھ نہیں آتی کہ لوگوں کا ایک طبقہ جان بوجھ کر یہ شرارت اور پراپیگنڈا کر رہا ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت کے قوانین پر مبنی نہیں ہوگا۔ اسلامی اصول آج بھی اسی طرح نافذالعمل ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے"۔ یہی نہیں بلکہ قائداعظم نے ان سیکولر لبرل شرارت پسندوں کا جواب فروری 1948 میں امریکی ریڈیو سے اپنے ایک خطاب میں دیا۔ انہوں نے امریکی عوام کو بھی واضح کیا کہ ہم شرعی قوانین چاہتے ہیں۔

"these are as applicable in actual life as these were 1300 years ago beofdemocratictype,embodingtheessentialPrincipalsofIslam,Today the ultimate Shape of the constitutionisgoingtobe,butiamsure,itwill yettobeframmedbypakistanConstituentAssembly.Idonotknowwhat TheconstitutionofPakistanis"

"پاکستان کا آئین ابھی پاکستان کی آئین ساز اسمبلی نے بنانا ہے۔ مجھے نہیں علم کہ اس کی کیا حتمی شکل و صورت ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ ایک جمہوری آئین ہوگا جو اسلام کے بنیادی اصولوں پر مبنی ہوگا۔ اسلامی اصول آج بھی زندگی میں اسی طرح نافذالعمل ہیں جیسے تیرہ سو سال پہلے تھے"۔ یہ تھا اقبال اور قائداعظم کا پاکستان جس کے آپ پینتیس سالہ سیاست میں وکیل بنے رہے اور اس ملک کے سادہ لوح عوام اور راسخ العقیدہ دانشور آپ کو سنتے رہے۔ جو صاحبان نظر تھے انہیں علم تھا کہ آپ عملی طور پر اسی دن سے اس صف میں آکر کھڑے ہو گئے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کا اعلان کرنے والوں کی صف ہے جس دن آپ نے فیڈرل شریعت کورٹ کے بنکوں کے سود کو حرام کرنے کے فیصلے کے خلاف اپیل کی تھی لیکن میرا اللہ تو مہلت دیتا ہے۔ فرد جرم اسی وقت عائد ہوتی ہے جب کوئی واضح دو ٹوک اعلان کرے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ کو یہ توفیق دی کہ آپ یہ اعلان کریں کہ پاکستان کا مستقبل لبرل اور جمہوری پاکستان سے وابستہ ہے۔ یہ اعلان آپ نے بحیثیت نواز شریف نہیں بلکہ بحیثیت وزیراعظم پاکستان کیا ہے۔ وہ وزارت عظمیٰ جو ہمارے نزدیک اللہ کی عطا ہے۔ میرے سامنے ان صاحبان نظر کے چہرے بھی گھوم رہے ہیں جن سے آپ نے دعا کی استدعا کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ اگر تیسری دفعہ وزیراعظم بن کر میں نے تاریخ رقم کر دی تو اللہ کے قانون کو اس ملک میں نافذ کر دوں گا۔ مجھے مدینہ منورہ میں بیٹھے رسول اکرم ﷺ کے جاروب کش اس صوفی صاحب کی وہ بات یاد آ رہی ہے جن سے آپ نے جلاوطنی کے دوران ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی تو انہوں نے کہا تھا کہ مجھے حکم ملا ہے کہ آپ ایک دروازے سے آؤ تو میں دوسرے دروازے سے نکل جاؤں۔ آپ سے صاحبان نظر اسقدر ناراض تھے اس لیے کہ انہیں اللہ کی ناراضگی کا بخوبی علم۔ آپ کو اقتدار ملا' آپ کو مہلت دی گئی۔ یہ مہلت آپ نے گنوا دی۔ اس ملک کی روحانی اساس عاشق رسول اور دربار رسالت کے عندلیب باغ حجاز" علامہ اقبال سے وابستہ تھی۔ آپ نے لبرل اور سیکولر بننے کے شوق میں یوم اقبال کی تعطیل بھی منسوخ کر دی۔ اچھا ہوا آج آپ کا اقبال سے یہ تعلق بھی ختم ہوا۔ حیرت ہے کہ اب یہ اعزاز اس صوبے کے مردان افغان کو حاصل ہوا جن سے علامہ اقبال کی امیدیں وابستہ تھیں۔ اللہ نے اپنی تفریق واضح کر دی ہے۔ اس کے دھڑے کے لوگ ایک جانب اور مخالف دھڑے کے لوگ دوسری جانب۔ آپ کو اپنا دھڑا مبارک لیکن میری نظر میں ان صاحبان نظر کے آنسو گھوم رہے ہیں جو بار بار ڈبڈبائی آنکھوں سے آسمان کی جانب صرف انصاف طلب نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اللہ اپنے فیصلے نافذ کر دے تو پھر اس زمین پر پناہ نہیں ملا کرتی۔ نشان عبرت بنا دیے جاتے ہیں وہ لوگ جو اس سے عہد کر کے مکر جاتے ہیں۔

"اللہ کے غضب کو دعوت دینے والے"

یہ ایک دردناک کہانی ہے جس کے خوفناک انجام کی طرف یہ قوم انتہائی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ایسا خوفناک کہ جس کے تصور سے ہی اہلِ نظر کانپ رہے ہیں۔ آئین پاکستان، جس کے تحفظ کی قسم صدرِ پاکستان،وزیرِ اعظم، گورنرز،وزرائے اعلیٰ،اراکین اسمبلی، مسلح افواج کے اراکین،اعلیٰ عدلیہ کے جج اور ہر آئینی عہدہ رکھنے والا شخص اللہ کو حاضر و ناظر جان کر اٹھاتا ہے،اسی آئین پاکستان کی شق نمبر 38 (ایف) کہتی ہے۔"حکومت جس قدر جلد ممکن ہو سکے ربا(سود) ختم کرے گی"۔گزشتہ روز ربا(سود) کے بارے میں آئینی درخواست مسترد کر دی گئی۔ اللہ سورۃ بقرہ میں فرماتا ہے "اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اگر تم واقعی مومن ہو تو سود کا وہ حصہ جو باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو،اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اسے کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو"(البقرہ 79-278)۔یہ اعلانِ جنگ امریکہ، حکومتِ پاکستان یا مسلح افواج نہیں کر رہیں،وہ قادرِ مطلق کر رہا ہے جو اعلان کرتا ہے کہ اس کی پکڑ بہت شدید ہے۔ یہ اللہ کا دستور ہے کہ وہ ہر فرد کو اس کے اختیار کے مطابق پکڑتا ہے اور اس کی استطاعت کے مطابق سزا دیتا ہے۔

سود کے معاملے میں ہماری کہانی دردناک ہے اور ہم خوفناک انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔بانیءِ پاکستان قائدِ اعظم رحمتہ اللہ علیہ نے یکم جولائی 1948ء کو سٹیٹ بینک کا افتتاح کیا اور تقریر کی۔یہ ان کی زندگی کی آخری تقریر تھی۔انہوں نے فرمایا۔

"systemofthewesthascreatedalmostinsoluableproblemsforhuminity with Islamic ideas of social and economic life. The economic ofyourresearchorganizationinevolvingbankingpoliciescompatable Ishallwatchwithkeenessthework"

(میں بینک کے تحقیقی شعبے کے کام کو ذاتی طور پر باریک بینی سے دیکھوں گا کہ وہ ایک ایسا بینکنگ نظام وضع کریں جو اسلام کے معاشرتی اور معاشی نظامِ زندگی کے ہم آہنگ ہو۔ مغرب کے معاشی نظام زندگی نے انسانیت کے لئے لاینحل مسائل پیدا کیے ہیں)

میں نے انگریزی متن بھی درج کر دیا ہے کہ کسی کو قائدِ اعظم کی سود کے خلاف اس تقریر اور ان کے جذبے پر کوئی شک نہ رہے۔اس تقریر کے تقریباً ڈھائی ماہ بعد قائدِ اعظم انتقال کر گئے۔ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد سترہ سال طویل خاموشی کا زمانہ ہے۔یوں تو ہر آئین میں اسلامی نظریاتی کونسل موجود رہی لیکن کسی کو سود کے بارے میں کبھی کوئی خیال نہ آیا۔ایوب آمریت کے دوران 1964ء سے 1966ء تک اسلامی نظریاتی کونسل نے بینکنگ نظام کا جائزہ لیا اور اسے خلافِ اسلام قرار دیا۔3 دسمبر،1969ء میں کونسل نے اپنی رپورٹوں کا اعادہ کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری حکومت میں آئین میں 38 (ایف) تحریر ہوئی جس میں حکومت کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ سود کو جلد از جلد ختم کیا جائے۔"حضرت ضیاءالحق "کا زمانہ آیا تو 1977ء میں سود کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل سے دوبارہ رجوع کیا گیا۔ کونسل نے 25 جون 1980ء کو سود کے خاتمے کے لئے ایک متبادل نظام تجویز کر دیا۔اب ٹال مٹول شروع ہو گئی۔ایک عالمی سیمینار بلایا گیا جس میں کونسل کی تجاویز زیرِ بحث آئیں۔ سپریم کورٹ نے ضیاءالحق کو آئین میں ترمیم کا اختیار دیا۔اس نے وفاقی شرعی عدالت قائم کی اور سپریم کورٹ میں شریعت اپیل بنچ بنایا۔ لیکن سود سے محبت کا یہ عالم تھا کہ 1980ء میں بننے والی وفاقی شرعی عدالت پر یہ پابندی لگا دی کہ دس سال تک مالی معاملات میں شریعت کے حوالے سے کوئی کیس نہیں سنے گی۔اس وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ کار کا یہ عالم تھا کہ اس کے فیصلے کے خلاف اگر ایک عام آدمی بھی سپریم کورٹ میں اپیل لے کر جائے گا تو بغیر پیشی یہ اپیل منظور ہو جائے گی اور حکم امتناعی بھی جاری ہو جائے گا۔ جیسے ہی دس سال کی پابندی ختم ہوئی تو سود کے مخالف ایک دم 1990ء میں درخواستیں لے کر جا پہنچے۔روزانہ سماعت ہوئی اور اکتوبر 1991ء میں وفاقی شرعی عدالت نے 157 صفحات کا فیصلہ تحریر کیا جس کے تحت 30 جون 1992ء سے بینک کے سودی کاروبار کو حرام قرار دے دیا۔اس وقت سودی نظام کے ایک اور پروانے نواز شریف وزیرِ اعظم تھے۔وہ اس فیصلے کے خلاف فوراً سپریم کورٹ جا پہنچے۔ حکم امتناعی جاری ہوا اور ٹال مٹول شروع۔نواز شریف اور بے نظیر کے زمانے میں کبھی بھی شریعت بنچ پورا نہیں ہونے دیا گیا۔ مشرف نواز شریف کا تختہ الٹ کر دیگر کاموں میں مصروف تھا اور اسے اندازہ تک نہ ہو سکا کہ شریعت بنچ مکمل ہے۔یہ بنچ وجیہہ الدین احمد، خلیل الرحمٰن، منیر اے شیخ، مولانا تقی عثمانی اور محمود احمد غازی پر مشتمل تھا۔یہ لوگ خاموشی سے اپنی کاروائی میں مصروف رہے اور دنیا بھر سے ماہرین کو بلوا کر فیصلے کے قریب پہنچ گئے۔ فیصلے پر دستخط کا وقت آیا تو سازشیں شروع ہو گئیں۔بنچ نامکمل کرنے کے لئے محمود احمد غازی کو سیکورٹی کونسل کا حلف اٹھوا دیا گیا۔وہ معصومانہ طور پر اس چال کا شکار ہو گئے لیکن ایسا کرنے سے وہ جج نہ رہے۔ لیکن آئین کے مطابق تو ایک عالم دین سے بھی کام چل سکتا تھا اور بنچ مکمل رہا اور اگلے ہی دن انہوں نے فیصلہ دے دیا۔23 دسمبر 1999ء کو پاکستان کی سپریم کورٹ کے فل بنچ نے ایک تاریخ ساز فیصلہ دیا اور یہ اعزاز حاصل کیا کہ تمام اسلامی ممالک میں واحد پاکستان ہے جس کی سپریم کورٹ نے سود حرام قرار دیا۔ یہ بہت طویل فیصلہ ہے جو ایک ہزار صفحات سے زیادہ ہے۔پھر چال چلی گئی مشرف نے ایک پرائیوٹ بنک سے سپریم کورٹ میں نظرِ ثانی کی درخواست داخل کروائی۔اس دوران پی سی او آ گیا۔وجیہہ الدین اور خلیل الرحمٰن نے حلف نہ اٹھایا۔ قانون کے مطابق نظرِ ثانی صرف وہی جج کر سکتے ہیں، لیکن یہاں یہ اصول بھی توڑ دیا گیا ۔چیف جسٹس شیخ ریاض کی سربراہی میں بنچ بنایا گیا جس نے چند صفحات پر مشتمل یہ فیصلہ تحریر کیا کہ سپریم کورٹ کا سود حرام قرار دینے کا فیصلہ کالعدم ہے۔ یہاں ایک چال چلی گئی۔اگر فیصلہ کالعدم ہے تو اس کے مقابل میں سپریم کورٹ کو نیا فیصلہ تحریر کرنا چاہیے تھا۔ سپریم کورٹ کی تاریخ میں یہ پہلا مقدمہ ہے جسے ماتحت عدالت کو واپس بھجوایا گیا۔ مقصد صرف یہ تھا لوگوں کو واپس وہاں لے جایا جائے جہاں سے جدوجہد کا آغاز ہوا تھا۔وفاقی شرعی عدالت میں یہ کیس 15 سال سے سرد خانے میں ہے اور اگر کوئی سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو اپیل مسترد کر دی جاتی ہے۔

ہمارا کام یہی ہے کہ ہم دیواروں سے سر ٹکراتے رہیں۔ ہمیں ایسا کرنے میں کوئی عار نہیں۔ ہم تو اس صف میں کھڑے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے سود کے خلاف اعلانِ جنگ کے بعد ترتیب دی جا چکی ہے۔یہ تو ہر کسی کی مرضی اور منشا ہے کہ وہ جس طرف چاہے کھڑا ہو جائے۔ مدرسہ کھلے نہ کھلے، فیصلہ آئے یا نہ آئے، لیکن جس کو اللہ کے قادر ہونے پر یقین ہے، اسے اس بات پر بھی مکمل یقین ہے کہ یہ جنگ اللہ نے جیتنی ہے اور کوئی اس روئے زمین پر اتنا طاقتور نہیں جو یہ جنگ جیت سکے۔البتہ روز ہم اس کے غضب اور غیظ کو دعوت دے رہے ہیں۔ گزشتہ چند دنوں سے کبھی اہلِ نظر سے ملتا تو وہ اپنے خواب سناتے، کہتے زلزلے ہیں، سونامی کی لہریں ہیں۔اسلام آباد میں تو کچھ علاقے نظر ہی نہیں آ رہے۔پھر استغفار کرنے لگتے، سوچتا تھا ایسا کیوں ہو گا۔کالم تحریر کر رہا ہوں تو دس سال پہلے کا آٹھ اکتوبر کا زلزلہ یاد آ رہا ہے۔خوف کا ایک عالم ہے۔ بس یہی دعا دل سے نکل رہی ہے۔الٰہی ہم پر رحم فرما،ان لوگوں کی سزا ہم سب کو نہ دے جو تجھے للکارتے ہیں۔جو تیرے مقابل آ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ جو تیرے اعلانِ جنگ کے باوجود بھی خوف سے نہیں کانپتے۔ہم پر رحم فرما،اگر تو نے ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم بہت بڑے خسارے میں جانے والے ہیں۔

عذابِ الادنیٰ، عذابِ الاکبر

وہ جس کے قبضہ ء قدرت میں زمین و آسمان ، وسعت افلاک میں پھیلی کائناتیں، ہوائیں، بحر وبر حتیٰ کہ زمین کی تہوں میں رینگنے والوں سے لے کر افلاک کی بلندیوں پر آباد فرشتوں تک سب ہیں۔ جو سب پر محیط ہے۔ جو اس کائنات کا مالک اور مختارِ کل ہے۔ جو واحد ہے اور اس کی عظمتوں، طاقتوں، قوتوں اور فیصلوں میں کوئی شریک نہیں ۔ جو کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو فقط اتنا فرماتا ہے "کن" یعنی ہو جا اور وہ چیز ہو جاتی ہے۔ جو فاعلِ حقیقی ہے۔ اسے اپنے فیصلے نافذ کرنے ، اپنے ارادے کی تکمیل اور اپنی تخلیق کو جنم دینے کے لئے کسی سہارے ، کسی وسیلے ، کسی واسطے کی حاجت نہیں۔ وہ مصور اور خالق ہے لیکن اپنی تخلیق کے لئے رنگوں ، برش، کینوس کا محتاج نہیں۔ وہ صبح آسمان پر لمحہ بہ لمحہ بدلتی تصویریں دکھاتا ہے تو شام شفق کی رونمائی کرتا ہے۔ وہ جو اس دنیا ہی نہیں تمام دنیاؤں کے اقتدارِ اعلیٰ پر متمکن ہے اور اسے اس اقتدارِ اعلیٰ کے لئے کسی چند سو لوگوں کی اسمبلی کے آئین کی تصدیق کی ضرورت نہیں۔ وہ اس کائنات میں اپنی طاقت کے اظہار، اپنی قوت کی ہیبت اور اپنے فیصلوں کے نفاذ کے لئے بھی کسی انتظامی مشینری کا محتاج نہیں۔ البتہ وہ اپنے فیصلوں کے کچھ اصول ضرور بتاتا ہے۔ وہ اپنے خوش ہونے کے لئے اعمال بھی بتاتا ہے اور اپنی ناراضی کی وجوہات بھی کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ اس کے حکم سے لوگوں کو عزت میسر آتی ہے یا ذلت ، بادشاہت عطا ہوتی ہے یا چھین لی جاتی ہے۔ لیکن مصیبت، بلا، آفت یا عذاب کے بارے میں تو اس نے دوٹوک انداز میں وضاحت کرتے ہوئے، کھول کھول کر بیان کر دیا "کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی جب تک اللہ کا اذن نہ ہو جائے" (التغابن-11)۔ کس قدر وضاحت سے اللہ نے دنیا میں انسانوں پر نازل ہونے والی مصیبتوں ، آفتوں ، پریشانیوں اور عذابوں کے بارے میں حتمی طور پر کہا، کہ یہ سب اسی کے اذن اور اسی کے حکم سے ہوتی ہیں۔ انسانوں پر مصیبتیں ، آفتیں، پریشانیاں اور عذاب نازل کرنے کی بھی اللہ نے بار بار مصلحت بتائی ہے اور ساتھ یہ کلیہ اور قاعدہ بھی بتا دیا کہ ہم کبھی بڑی پریشانی ، بڑی آفت ، مصیبت یا بڑا عذاب "اچانک نہیں بھیجتے ، بلکہ اس سے پہلے چھوٹی پریشانی ، آفت یا مصیبت سے خبردار کرتے ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں۔ اور ہم ان کو بڑے عذاب سے پہلے چھوٹے عذاب کا مزہ چکھائیں گے تاکہ وہ ہماری طرف لوٹ آئیں" (السجدہ 21)۔ مصیبتوں ، پریشانیوں ، بلاؤں اور آفتوں کی بھی دو اقسام بیان فرمائی گئیں۔ ایک وہ جو کسی انسان کو ذاتی طور پر ملتی ہیں۔ یہ اصلاح ، تربیت اور وارننگ کا ایک ایسا قانون ہے جو مہربان اور کریم اللہ سبحان وتعالیٰ نے اپنایا ہے۔ یہ وہ کڑوی دوا ہے جس کے نتیجے میں اللہ انسانوں کی اصلاح چاہتا ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ بلاؤں، پریشانیوں، "بیماریوں اور مصیبتوں کی اس دوا کے پینے اور صبر کرنے کے بیش بہا انعامات ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " مومن کو اگر کانٹا بھی چبھتا ہے تو اللہ اس تکلیف کے بدلے اس کے گناہ جھاڑ دیتا ہے۔" ایک اور جگہ فرمایا۔ قیامت کے دن جب بیماریوں اور مصیبتوں کے وجہ سے لوگوں کے گناہ کم ہونا شروع ہوں گے تو وہ خواہش کریں گے کہ کاش ہم زندگی میں کبھی صحت مند نہ ہوتے"۔ یہ الگ بات ہے کہ جب بار بار کی تنبیہہ اور مصیبت سے وہ باز نہیں آتے تو پھر اللہ ایسے بدبخت لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے "اللہ ان سے ہنسی کرتا ہے اور انہیں مہلت دیئے جاتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی اور شرارت میں بھٹکتے رہیں۔" (البقرہ-15) یہ انسانوں کے ساتھ اللہ کا بحیثیت فرد معاملہ ہے۔ اس لئے کہ روزِ قیامت کسی گروہ ، کسی امت ، کسی خاندان ، کسی برادری یا کسی قبیلے نے اللہ کے حضور بحیثیت مجموعی یا اکٹھے پیش نہیں ہونا۔ اللہ نے کس قدر کھول کر بیان کیا ہے "اور سب قیامت کے دن اس کے سامنے اکیلے اکیلے حاضر ہوں گے" (مریم-15)۔ ہر ایک کو دنیا میں علیحدہ حالات، ماحول اور حیثیت دی گئی، ہر کسی کا امتحان اور پرچہ علیحدہ ہے۔ ایک صالح باپ اور ماں کے گھر پیدا ہونے والے اور ایک طوائف کے ہاں جنم لینے والے کا نہ امتحان ایک جیسا اور نہ ہی سختی کی پوچھ گچھ ایک جیسی۔ اسی لئے مہربان رب اس کمرۂ امتحان میں آنے سے پہلے ہر شخص کو تنبیہ اور وارننگ کرتا ہے تاکہ انہیں اس سے ہدایت حاصل ہو اور وہ اللہ کے سامنے سرخرو ہو سکیں۔

لیکن قوموں ، گروہوں ، قبیلوں اور امتوں کو سرکشی سے باز رکھنے کے لئے اللہ کا طریق کار تو ہی ہے کہ پہلے ایک چھوٹی آفت ، چھوٹی بلا اور مصیبت سے تنبیہ کی جاتی ہے اور پھر اگر یہ قوم ، گروہ ، قبیلہ یا امت نہ سنبھلے تو اللہ کا غیظ وغضب ان پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ لیکن قوموں کے معاملے میں وارننگ دیتے ہوئے اللہ ہر خاص وعام کو مصیبت میں مبتلا کرتا ہے اور عذاب بھی ہر خاص وعام پر نازل کرتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے "اس فتنے اور وبال سے ڈرو جو خصوصیت کے ساتھ انہی لوگوں پر واقع نہ ہو گا جو تم میں گنہگار ہیں اور جان رکھو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے (الانفال 25)۔ عموماً یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کا کیا قصور ہے جو اللہ کے احکامات پر عمل پیرا ہوتے ہیں مگر اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ اللہ دونوں جہانوں کا مالک ہے۔ یوں سمجھیں آپ کے گھر کے دو کمرے ہیں۔ آپ اپنی ایک قیمتی چیز اٹھا کر دوسرے کمرے میں رکھ دیتے ہیں تو آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ اس وارننگ کے دوران جو لوگ اللہ کے دوسرے جہان میں منتقل ہو جاتے ہیں ، وہ اللہ کی دسترس میں ہی رہتے ہیں۔ البتہ وہاں ان کا معاملہ اس طرح ہو گا یعنی اکیلے اکیلے اور اپنے اعمال کے مطابق۔ لیکن دنیا میں اس کے غیظ وغضب کا شکار بستی کا ہر خاص وعام ہو جاتا ہے۔

اللہ کے اس دستورِ عذاب و آزمائش کو سامنے رکھئے اور پھر سوچیئے کہ وہ حرم جہاں ایک مچھر کا مارنا بھی حرام ہے، وہاں تند و تیز ہوائیں چلتی ہیں ، طوفان آتا ہے۔ وہ کرین جو انتہائی مضبوط تصور کیا جاتا ہے اور جس کے حادثے کا تصور ہی نہیں کیا جاتا۔ صرف چند حادثات ہیں جو موجودہ تاریخ میں نمایاں ہیں جن میں 2008ء کا نیویارک اور 2015ء کا ہالینڈ کا واقعہ۔ ایسا کرین آسمان کی بلندیوں سے حرم میں عبادت میں مصروف لوگوں پر گر پڑتا ہے۔ کیا یہ صرف حادثہ ہے جس کی تحقیقات ہونا چاہیے تھیں۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ خانہ کعبہ کے مطاف اور اردگرد ، دنیا کی ہر زبان میں علمائے کرام لوگوں کو قرآن کا درس دے رہے ہوتے ہیں۔ کسی ایک عالم نے بھی اس طرح اشارہ تک نہ کیا کہ یہ اللہ کی جانب سے ایک وارننگ ، ایک تنبیہہ ہو سکتی ہے۔ آؤ ہم سب مل کر اس پوری امت کے لئے اجتماعی استغفار کر لیں۔ کس قدر بہتر وقت ہے کہ پوری امت سے لوگ یہاں جمع ہیں ، یہ اگر اللہ کے حضور گڑگڑا کر اپنے لئے نہیں بلکہ پوری امت کے لئے استغفار کریں تو شاید اللہ رحم فرما دے۔ لیکن یہ توفیق بھی تو صرف میرا اللہ ہی دیتا ہے۔ ہم بحیثیت امت جو کچھ کر رہے ہیں ، کیا ہم اللہ کی ناراضگی کو دعوت نہیں دے رہے۔ ستاون اسلامی ممالک میں سود کے نظام کو روا رکھتے ہوئے اللہ سے جنگ جاری ہے۔ مسلک کی بنیاد پر ایک دوسرے کا خون جتنا آج بہہ رہا ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ بشار الاسد کے قتلِ عام کی حمایت کرنے والے بھی اس امت میں سے ہیں اور داعش کے حمایتی بھی۔ نورالمالکی نے جو لاکھوں لوگ قتل کئے ان کا دفاع کرنے والے بھی ہیں اور جبتہ النصرہ کی حمایت والے بھی۔ قاتل، چور، ڈاکو، سود خور اور رزقِ حرام سے پیٹوں کا جہنم بھرنے والے حرم میں پہنچ جائیں تو کیا وہ رحمتیں سمیٹتے ہیں؟۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ایک شخص خانہ کعبہ سے لپٹ لپٹ کو رو رو کر دعائیں کر رہا تھا، لیکن اس کی دعائیں قبول نہیں ہونگی۔ اس لئے کہ اس نے جو لباس پہنا ہے وہ رزقِ حرام کا، جو کھانا اس نے کھایا وہ رزقِ حرام کا۔ اس کے جسم کی پرورش حرام سے ہوئی، ایسے شخص کی دعائیں کیسے قبول ہو سکتی ہیں۔ "کاش کوئی حکمران ، حرم میں موجود کوئی عالم دین اس کرین حادثے کے بعد لوگوں کو اجتماعی استغفار کے لئے پکارتا۔ کاش ہم پر رحم کیا جاتا ، ہم اللہ کو منا لیتے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایک خوف نے آن گھیرا ہے۔ قیامت کے نزدیک جب بڑی جنگ یعنی ملحمتہ الکبریٰ شروع ہونا ہے تو میرے آقا ﷺ کو بتائی گئی نشانیوں کے مطابق اس کا آغاز حج کے دوران قتلِ عام سے ہو گا۔ خوف ہے کہ چھوٹا عذاب تو ہم نے دیکھ لیا ، کہیں ہم بڑے عذاب کا شکار تو نہیں ہونے والے۔

بلوچستان: بہت کچھ جاننا ضروری ہے

سبی شہر سے جو راستہ مری قبائل کے ہیڈ کوارٹر کاہان کی طرف جاتا ہے، اس پر چند کلو میٹر کے بعد میدانی علاقہ ختم ہو جاتا ہے اور اونچے نیچے پہاڑ آجاتے ہیں۔ ان پہاڑوں کے دامن میں سیلاچی قبیلے کا مسکن تلی واقع ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے ایک راستہ کاہان کی جانب نکلتا ہے اور دوسرا راستہ کٹ منڈائی سے ہوتا ہوا ہرنائی کے سرسبز و شاداب علاقے تک جاتا ہے۔ انگریز نے جب ریلوے لائن بچھائی تو وہ سبی سے ہرنائی اور پھر وہاں سے کوئلے کی کانوں کے علاقے شاہرگ سے گزرتی کوئٹہ جاتی۔ اس ریلوے لائن پر کئی سو فٹ اونچا پل تھا جو دو پہاڑوں کے بیچ بنایا گیا تھا۔ ٹرین ایک پہاڑ کے اندر بنائی گئی سرنگ میں داخل ہوتی، باہر نکلتی تو وہ اسی پل پر آتی اور پھر دوسرے پہاڑ میں بنائی گئی سرنگ میں داخل ہو جاتی۔ 1896ء میں بنائے جانے والے اس پل کو انگریز انجینئرنگ کا ایک معجزہ تصور کرتے تھے۔ زلزلے نے یہ پل اور سرنگیں تباہ کیں تو پھر بولان کے علاقے میں نئی ریلوے لائن بچھائی گئی اور کوئٹہ کے راستے چمن (افغان بارڈ) اور تفتان (ایران بارڈر) تک آمدورفت کا سلسلہ شروع ہوا۔ پرانی ریلوے لائن تباہ ہو گئی لیکن سبی سے ہرنائی تک پٹڑی سلامت رہی اور یہی وہاں کے لوگوں کا واحد ذریعہ آمدورفت تھا اور آج بھی ہے۔ یہ دنیا کی چند خوبصورت ریلوے لائنوں میں سے ایک ہے جو ندی دریا کے ساتھ ساتھ پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ ہرنائی سے سبی تک زمینی راستہ تلی کے اسی مقام سے شروع ہوتا ہے جہاں سے کاہان کو راستہ جاتا ہے۔ ہرنائی بنیادی طور پر ایک پشتون آبادی کا شہر ہے۔ جبکہ پورا راستہ بلوچ مری قبائل سے آباد ہے۔ اسی علاقے میں نفجک کے مقام پر انگریزوں کی مری قبائل کے ساتھ جنگ ہوئی تھی۔ پہلی جنگ میں انگریزوں کو ذلت آمیز شکست ہوئی، پھر رابرٹ سنڈیمن کی فارورڈ پالیسی" (یعنی قبائل کو اپنا ہمنوا بنانا) کا نفاذ ہوا، تو مری قبائل کو بھی ساتھ ملا لیا گیا۔ 1880ء کے آس پاس انگریز نے اس علاقے میں اپنے قدم جمائے اور اس نے سبی ہرنائی کو ریل کے ذریعے تو منسلک کیا، لیکن سڑک نہ بنائی اور مریوں کو ان پہاڑوں کے درمیان محصور کیے رکھا۔ وہ اگر سبی میں اپنے مویشی بیچنے بھی آتے تو ان کو باقاعدہ عارضی رہائش کا پرمٹ جاری کیا جاتا۔ یوں وہ پہاڑ جنہیں کٹ منڈائی کا علاقہ کہتے ہیں، کئی سو سال قدیم تہذیب پر رکا ہوا ایک خطہ بن گیا جہاں نہ سڑک تھی، نہ بجلی، نہ سکول، نہ ڈسپنسری۔ ٹرین وہاں سے گزرتی تو ایسے لگتا جیسے انسانوں کے کسی سفاری پارک سے گزر رہی ہو جہاں تہذیب ایک ہزار سال پرانے ماحول پر ساکت و جامد ہو گئی ہو۔ انگریز چلا گیا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ سبی وہ واحد ضلع تھا جہاں ایک انگریز ڈپٹی کمشنر آرتھگٹن ڈیوی (ArthingtonDevi) جو آزادی کے کئی سال بعد تک اس عہدے پر فائز رہا۔

پاکستان بننے کے بعد جب کبھی بلوچستان میں حالات خراب ہوتے، سب سے پہلے سبی ہرنائی ٹرین نشانہ بنتی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جب بلوچستان حکومت ختم کر کے آرمی ایکشن شروع کیا تو اس ٹرین کو چلانا اور بھی مشکل ہو گیا۔ اس دوران کوشش کی گئی کہ سبی، ہرنائی روڈ کو تعمیر کر لیا جائے۔ فوجی انجینئروں کے ذریعے تھوڑی دور تک روڈ بنی اور پھر اس کا راستہ مری علاقے کو ہلو کی جانب موڑ دیا گیا اور ہرنائی کے پشتون سڑک کے رابطے سے محروم ہی رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مری بلوچ علاقوں میں بھی بنائی جانے والی روڈ چند سال ہی چل سکی۔ زیادہ تر آمدرفت سرکاری گاڑیوں کی رہی اور پھر مدتوں تک یہ خطہ پھر ایک محصور علاقہ بن گیا۔

1994ء میں جب میں وہاں ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے گیا تو مرحوم سکندر جمالی چیف سیکرٹری اور ذوالفقار مگسی چیف منسٹر تھے۔ اس دوران یہ بات زور شور سے زیر بحث آئی کہ ہرنائی جو ایک سرسبز علاقہ ہے اور جہاں دنیا بھر کے پھل اور سبزیاں کاشت ہوتی ہیں اگر انہیں سبی کے راستے بذریعہ سڑک ملایا جائے تو سندھ کے بازاروں تک انکو رسائی حاصل ہو جائے گی اور یوں یہ علاقہ بہت جلد ترقی کرے گا۔ یہ بلوچستان کا ایک چھوٹا سا اکنامک کاریڈور تھا۔ 114 سال کی بندش کے بعد، میں نے اس سڑک پر کام کا آغاز کرایا۔ نواب خیر بخش مری افغانستان سے واپس آچکے تھے۔ ان کے دونوں بیٹے سرکار میں وزیر تھے اور چونکہ یہ علاقہ بجارانی مریوں کا تھا اس لئے یہاں زیادہ مزاحمت نہ ہوئی۔ سڑک مری قبائل کے تعاون سے ہی بننا شروع ہوئی۔ تقریباً 80 کلو میٹر تک روڈ مکمل ہو کر سانگان کے علاقے تک پہنچی تو اچانک نواب خیر بخش مری کے گیزنی مری قبائل کے لوگوں نے اسے روک دیا، اس لئے کہ اس کے بعد پشتون علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ لیویز وغیرہ کی مدد سے سڑک تو بنا دی گئی اور اس پر چند سرکاری گاڑیوں نے سفر بھی کر لیا، لیکن مری قبائل کی بلوچ سرزمین سے ہرنائی کے پشتونوں کو راستہ نہ مل سکا اور وہ آج بھی برف پوش پہاڑوں سے ہوتے، کوئٹہ اور پھر بولان یا پھر مستونگ کے ذریعے ملک میں اپنے پھل اور سبزیاں لے جاتے ہیں۔

کوئٹہ میں ہمیشہ پانی کی قلت رہی ہے۔ زیر زمین پانی بہت نیچے ہے۔ اس لیے اسے پینے کا پانی مہیا کرنے کیلئے بار بار منصوبے بنائے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک منصوبہ برج عزیز ڈیم کا بھی تھا۔ پشتون علاقوں پشین، قلعہ عبداللہ اور چمن سے ایک برساتی نالہ کوئٹہ تک آتا ہے اور پھر کوئٹہ سے افغانستان میں داخل ہو جاتا ہے اور وہاں سے نوشکی کے علاقے کے قریب بلوچ قبائل مینگل، محالدینی اور بادینی کی زمینوں کو سیراب کرتا ہوا ایک بڑی جھیل زنگی ناوڑ میں ضم ہو جاتا ہے۔ برج عزیز وہ مقام ہے جہاں سے یہ نالہ افغانستان میں داخل ہوتا ہے۔ وہاں پر بند باندھ کر کوئٹہ کے شہریوں کو پینے کا پانی مہیا کرنے کا منصوبہ 80ء کی دہائی کے آخر میں بنایا گیا۔ اس منصوبے کے بعد اس قدر شور مچا کہ دونوں جانب آستینیں چڑھ گئیں، بیان بازی کا آتشیں سلسلہ ایسا جاری ہوا کہ کوئٹہ شہر آگ اور خون میں لت پت ہو گیا۔ اسی دوران یورپی یونین نے بلوچستان کیلئے امداد کے طور پر ایک زرعی کالج کی منظوری دی۔ کالج پشتون علاقے میں بنے یا بلوچ علاقے میں، اس پر اس قدر ہنگامہ کھڑا ہوا کہ کوئٹہ شہر بار بار کرفیو کی زد میں آنے لگا۔ لورالائی کے قریب چمالنگ ایک علاقہ ہے جس کا کوئلہ کوالٹی کے اعتبار سے انتہائی اچھا اور پنجاب کے نزدیک ہونے کی وجہ سے سستا پڑتا ہے۔ اس پر پشتون لونی اور بلوچ مری قبائل کا ایسا جھگڑا کھڑا ہوا کہ بیچارے ٹرک، ڈرائیور مارے جانے لگے۔ یہ تمام جھگڑے افغانستان میں روس کے آنے اور بلوچستان میں افغان مہاجر بن سے پہلے بھی سلگتے تھے لیکن بعد میں تو بھڑک اٹھے۔ افغانستان سے آنے والے مہاجرین کے بارے میں یوں تو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم انہیں پہچانتے ہیں لیکن انہوں نے جس طرح بلوچستان میں جائدادیں بنائیں، یہاں اپنے ہم قبیلہ پشتونوں سے شادیاں کیں۔ بلوچستان کے چپے چپے میں موجود باغات سنوارنے کا کام کیا، مزدوری کی، گھر بنانے کے کام سے لے کر تندور لگانے تک سب کام کیے۔ یوں وہ اس معاشرے کی ضرورت بن گئے۔ لیکن 80ء کی دہائی میں ایک زمانہ ایسا آیا کہ یہ سلگتی ہوئی آگ پورے بلوچستان میں پھیل گئی۔ وہ راستے جو بلوچ علاقوں سے گزرتے تھے وہاں سے پشتونوں کیلئے سفر مشکل ہو گیا اور وہ تمام مزدور جو باغات اور دیگر جگہوں پر بلوچ علاقوں میں کام کرتے تھے واپس اپنے پشتون علاقوں میں لوٹ گئے۔

دنیا بھر کی خفیہ ایجنسیوں کا ایک حربہ ہے اور یہ بہت ہی کامیاب نسخہ ہے کہ کسی بھی خطے میں موجود اختلافات جنہیں (FaultLines) کہا جاتا ہے ان کو ابھار کر خونریزی کروائی جائے اور مقصد پورا کیا جائے۔ جیسے شیعہ سنی اور عرب عجم کا جھگڑا عراق میں کامیاب رہا، اسی طرح پہلے پنجابی اور بلوچستان کی دیگر اقوام کے درمیان نفرت کا بیج کامیاب رہا، اب پشتون بلوچ "فالٹ لائن" کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس کو ابھارنے، اس کو شدید کرنے میں ایسے وہ تمام لوگ اکٹھے ہو چکے ہیں جو اس مملکت خداداد پاکستان کے آغاز ہی سے مخالف ہیں اور جن کو اسلام کے نام پر بنا ہوا یہ ملک ایک آنکھ نہیں بھاتا ہے۔ آپ کو بہت جلد اخبارات، رسائل اور ٹی وی ٹاک شوز میں ایسے لوگ نظر آنا شروع ہو جائیں گے جن کا تو اب اس ملک میں قومیتی "فالٹ لائن" پر سیاست کرنا اور رنگ، نسل اور زبان پر انسانوں کو تقسیم کرنا ہے، کہ یہی ایجنڈا ان تمام ممالک کا ہے جو پاکستان کی تباہی پر متفق ہیں۔ احتیاط لازم ہے اور بہت کچھ جاننا ضروری ہے امن و امان کے لئے اٹھایا گیا ایک چھوٹا سا غلط قدم اس آگ کو مزید ہوا دے سکتا ہے۔

بلوچستان میں [illegible] قوم کے [illegible] ہے

نسل‘ رنگ اور زبان کی عصبیت کو اجاگر کرنے کا فریضہ ایک خاص مقصد کے تحت اس مملکت خداداد پاکستان کے پچاس سال تک ترقی پسند اور سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد سیکولر کہلانے والے دانشور‘ انتہائی جانفشانی اور محنت سے ادا کرتے رہے ہیں۔ سیاسی محاذ پر ان ”عظیم دانشوروں“ کی آواز وہ سیاسی پارٹیاں اور گروہ بنتے رہے‘ جنہیں مسلمانانِ ہند نے قائداعظم کی سربراہی میں بدترین شکست سے دوچار کیا تھا۔ جب سے پاکستان تخلیق ہوا‘ ان تمام دانشوروں کی ایک مخصوص حکمت عملی تھی۔ کسی ایک قوم کو ظالم اور باقی تمام اقوام کو مظلوم ثابت کر کے نفرت کا بیج بویا جاتا۔ 1971ء سے پہلے اس نفرت کو علاقائی رنگ دیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں تاثر جاگزیں کرایا گیا کہ مغربی پاکستان ان کو لوٹ کر کھا رہا ہے۔ پھر پورے مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان اور وہاں کی فوج کو قابل نفرت بنا دیا گیا۔ بنگلہ دیش بھارتی فوج کی مدد سے بن گیا اور آپ آج بھی کسی سیکولر اور نسلی تعصب کے علمبردار دانشور کی تحریر اٹھا لیں‘ وہ معاشی تجزیے پیش کرے گا کہ دیکھو ہم سے آزاد ہو کر بنگلہ دیش کتنی ترقی کر گیا۔ کوئی ان سوالوں کا جواب نہیں دیتا کہ 1971ء کے بعد تقریباً دس لاکھ بنگالی عورتیں بھوک اور افلاس کے ہاتھوں دنیا بھر کے بازاروں میں بیچی گئیں‘ نوے لاکھ بنگلہ دیشی بھارت میں چند سو روپے کی مزدوری کرنے کے لئے دربدر ہیں۔ دنیا کے ساحلوں پر بھٹکتے اور امان تلاش کرتے روہنگیا مسلمانوں کے ساتھ پچیس فیصد بنگلہ دیشی بھی تھے۔ کیا یہ سب 1971ء سے پہلے بھی تھا۔ کوئی اس سوال کا جواب نہیں دے گا بلکہ وہ دوسرے صوبوں میں نفرت کا اگلا بیج بونے کی کارروائی میں لگا ہو گا۔

نفرت کا اگلا بیج پنجابیوں کو بحیثیت قوم ظالم اور باقی تین اقوام کو مظلوم ثابت کرنے کا بویا گیا۔ بلوچ‘ پختون اور سندھی مظلوم ہیں اور پنجابی ان کے حقوق غصب کر رہا ہے۔ نسل‘ رنگ اور زبان کے تعصب کا ایک لگا بندھا اصول ہے۔ یہ بڑے تعصب سے ہوتا ہوا چھوٹے سے چھوٹے تعصب کی صورت ظاہر ہو جاتا ہے۔ تعصب جس قدر چھوٹے گروہ تک پہنچے گا‘ اسی قدر خوفناک اور خونریز ہو جائے گا۔ مثلاً آپ اگر پنجابی اور سرائیکی کشمکش کا مسئلہ حل کر لیں تو پھر یہ برادری تک آ نکلتا ہے۔ آرائیں اور کشمیری لاہور میں لڑتے ہیں تو چیمے اور چٹھے گوجرانوالہ میں۔ یہاں تک کہ آخر کار چھوٹے سے چھوٹے گھرانے تک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ یہ تعصب وہاں زیادہ شدید اور خون آشام ہو جاتا ہے جہاں ایک سے زیادہ زبانیں بولنے والے اور ایک سے زیادہ نسلوں کے لوگ آباد ہوتے ہیں۔ بلوچستان اس نفرت‘ تعصب اور اس سے پیدا ہونے والے خونی تصادم کی بدترین مثال ہے۔ پشتون‘ بلوچ اور بروہی وہاں کئی سو سال سے اپنے اپنے مخصوص قبائلی علاقوں میں باہمی برداشت اور یگانگت کی بنیاد پر آباد چلے آ رہے ہیں۔ ایک بہت ہی قلیل تعداد کوئٹہ شہر میں ہزارہ قوم کی بھی تھی جو ایک صدی قبل وہاں آباد ہوئی اور پھر افغان جنگ کے دوران ہزاروں کی تعداد میں ہزارہ یہاں آ بسے۔ ان کے ساتھ ساتھ پنجابی اور یوپی کے اردو سپیکنگ افراد انگریز کے تعمیراتی کاموں‘ کوئلے کی کانوں اور چھاؤنیوں کے ساتھ منسلک کاروبار کی وجہ سے کوئٹہ‘ سبی اور لورالائی میں آباد ہو گئے۔ مدتوں سے یہ لوگ ایک ساتھ رہ رہے تھے۔ لیکن 1917ء میں جب سوویت یونین میں کمیونسٹ انقلاب آیا تو 1920ء میں آذربائیجان کا شہر باکو جو روس کا حصہ تھا‘ وہاں قومیتوں کی ایک عالمی کانفرنس بلائی گئی جس کا مقصد برصغیر پاک و ہند میں قومی تعصب کو ابھار کر انگریز حکومت کا خاتمہ کرنا تھا۔ اس کانفرنس میں جسے ”مشرقی عوام کی کانگریس“ "Congress of the People of East" کہا جاتا ہے۔ اس میں بلوچستان کے ایک وفد نے میر مصری خان بلوچ کی سربراہی میں شرکت کی۔ میر مصری خان کانگریس کے فوراً بعد افغانستان چلا گیا‘ تاکہ وہاں کی حکومت سے اپنے علاقے کی آزادی کی تحریک کے لئے مدد حاصل کر سکے۔ باکو کی یہ کانفرنس شدید اختلافات اور تکرار کا شکار رہی۔ آرمینیا کے عیسائیوں نے انور کمال پاشا کے خلاف تقریریں کیں اور مسلمان وفود جو یوں تو قومیت کے نام پر آئے تھے مگر انہوں نے سوویت یونین کے مسلمانوں کے قتل عام پر شدید احتجاج کیا۔ لیکن اس کانگریس کے بعد کمیونسٹ روس کی ایک پالیسی واضح ہو گئی کہ لوگوں کو نسل‘ رنگ اور علاقے کے تعصب میں الجھا کر ایک دوسرے سے دست و گریبان کرنا ہے۔ وہ جو طبقاتی کشمکش سے انقلاب کا نعرہ لے کر اٹھے تھے‘ جن کے ہاں مزدور ایک طبقہ ہوتا ہے‘ انہوں نے دنیا بھر اور خصوصاً برصغیر اور پھر پاکستان میں مظلوم قومیتوں کا نعرہ مستانہ دے کر ایک ایسی خونریزی کو جنم دیا جو آج تک قائم ہے۔ یہ وار چونکہ کاری تھا اور حربہ آزمایا ہوا تھا‘ اس لئے سوویت یونین کے خاتمے کے بعد نسل‘ رنگ اور زبان کے تعصب کا پرچم مغرب کے حکمرانوں کی ان کے پروردہ سیکولر دانشوروں‘ ان کی امداد پر پلنے والی این جی اوز اور ان کے ہم زبان سیاست دانوں نے اٹھا لیا۔

بلوچستان میں بیج بہت گہرا تھا۔ اس لئے کہ علاقے کی پسماندگی اور مرکز کی عدم توجہی نے اس نفرت کیلئے بہترین فضا مہیا کی تھی۔ بنگلہ دیش کی تخلیق کے بعد ایسی سیاست کو ایک کامیاب تجربہ سمجھا گیا اور پنجابی قوم کو بحیثیت ظالم اور غاصب بنا کر پیش کیا گیا جبکہ بلوچستان میں رہنے والے پختون‘ بلوچ اور براہوی کو ”برادر اقوام“ کا درجہ دیا گیا۔ ان برادر اقوام میں وہ پنجابی شامل نہ تھے جن کی تین نسلوں کی قبریں بھی وہاں تھیں اور جوان تمام زبانوں پر عبور رکھتے تھے جو وہاں بولی جاتی ہیں۔ مقصد صاف واضح تھا کہ پنجابی قوم سے نفرت کو اس حد تک آگے بڑھایا جائے کہ خونریزی کرنا یا کروانا آسان ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ 1974ء میں سندھ سے تعلق رکھنے والے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی ذاتی انا اور ہٹ دھرمی پر بلوچستان کی حکومت توڑی‘ آرمی ایکشن کیا‘ لیکن آپ اس زمانے میں کی گئی بلوچ رہنماؤں کی تقریریں اٹھا لیں‘ دیواروں پر وال چاکنگ دیکھ لیں آپ کو گالی صرف ”پنجابی استعمار“ کے خلاف ملے گی باقی سب برادر اقوام تھیں۔

”برادر اقوام“ کا یہ نعرہ بیچ چوراہے میں پھوٹ گیا جب افغانستان میں روسی افواج داخل ہوئیں اور پختون مہاجرین نے بلوچستان کا رخ کیا۔ عام بلوچ کیلئے تو یہ لوگ ایک نعمت سے کم نہ تھے۔ انہوں نے ان کی بے آباد زمین آباد کیں‘ انہیں اپنی محنت سے مالامال کیا لیکن وہ جن کی سیاست کا دارومدار تعصب پر تھا‘ انہوں نے ہر طرف نفرت کی آگ لگائی۔ کالاباغ کی طرح برج عزیز ڈیم پر لڑائی کا آغاز ہوا۔ یہ کوئٹہ کو پینے کا پانی مہیا کرنے کا منصوبہ تھا۔ اس پر ایسی لڑائی ہوئی کہ کوئٹہ شہر میدان جنگ بن گیا۔ کوئٹہ میں زرعی کالج بننا تھا جسے غیر ملکی امداد حاصل تھی‘ اس پر لڑائی ہوئی‘ کوئی کہتا بلوچ علاقے میں بناؤ اور کوئی پشتون علاقے میں۔ امداد رخصت ہو گئی اور کالج آج تک نہ بن سکا۔ 1988ء میں جب میں اسسٹنٹ کمشنر کوئٹہ تھا تو پورا شہر دو ٹرانسپورٹر رہنماؤں عبدالوہاب پیر علی زئی (پشتون) اور میر فیروز لہڑی (بروہی‘ بلوچ) میں اس طرح تقسیم ہوا کہ پورا ایک ماہ کرفیو لگانا پڑا۔ خوفزدہ پشتون بلوچ علاقوں سے کوچ کر گئے اور وہاں تندور جو پشتون چلاتے تھے بند ہو گئے۔ کوئٹہ شہر ایسا میدان جنگ بنا کہ دونوں جانب کے سیاسی رہنما قتل ہونے لگے۔ اب معاملہ پنجابی کا نہیں تھا۔ اقتدار جمہوری طور پر ”برادر اقوام“ کے پاس تھا اس لئے وہ آپس میں لڑ پڑیں۔ جب پرویز مشرف کے زمانے میں نواب اکبر بگٹی اور بگٹی قبائل کے خلاف مشرف کی ذاتی انا اور ہٹ دھرمی کی بنیاد پر ایکشن شروع ہوا تو ایک دفعہ پھر ”پنجابی استعمار“ کے نعرے کی گونج سنائی دینے لگی۔ کوئٹہ شہر سے خوفزدہ پنجابی ہجرت کرنے لگے۔ کتنے مارے گئے‘ کوئٹہ شہر میں بلوچ اور پشتون لڑائی کو وہاں پر موجود پنجابی آبادی پرامن رکھتی تھی۔ جب نواب اکبر بگٹی جاں بحق ہوئے‘ فساد پھیلا تو ہر خاص و عام جانتا ہے کہ کس طرح قندھار کے اندر بیٹھ کر کوئٹہ میں جائیدادیں خریدی گئیں اور آج کوئٹہ مکمل طور پر ایک پختون شہر بن چکا ہے جس کا میئر بھی پختون ہے۔ مستونگ کا لک پاس وہ راستہ ہے جو پشتون آبادی کو کراچی سے ملاتا ہے۔ ان کی ٹرانسپورٹ یہیں سے گزرتی ہے‘ پھل جاتے ہیں‘ ہوٹل چلتے ہیں۔ مستونگ کا سانحہ ایک خاص منصوبے سے کیا گیا ہے تاکہ اس راستے پر گزرنے والوں کو خوف میں مبتلا کیا جائے۔ یہ کسی ”ناراض بلوچ“ کا نہیں بلکہ ان قوتوں کا کام ہے جو 1920ء سے آج تک اس دھندے میں مصروف ہیں۔ کیا بلوچستان کے بچے بچے کو یہ حقیقت معلوم نہیں کہ بھارت 1974ء سے افغانستان میں موجود گروہوں کو مالی اور عسکری مدد فراہم کرتا ہے۔ پہلے یہ رہنما سوویت یونین میں شاہزادوں کی طرح رہتے تھے اور اگر شیر محمد مری بیمار ہوتا تو بھارت جا کر علاج کراتا۔ اب یہ انگلینڈ اور سوئٹزرلینڈ میں رہتے ہیں اور سب جانتے کہ سرمایہ کون دیتا ہے۔ نسل‘ رنگ اور زبان کے نام پر انسانوں کے گلے کاٹو‘ شناختی کارڈ دیکھ کر بولان کے علاقے میں لوگوں کو بسوں سے اتار کر قتل کرنے کی رسم کا آغاز کرو تو میرے ملک کے ”عظیم دانشور“ اور سیاسی لیڈر انہیں ”ناراض“ رکھتے ہیں‘ دہشت گرد نہیں۔ کیا دہشت گردی کی تعریف صرف یہی ہے کہ اس کے چہرے پر داڑھی ماتھے پر محراب اور ٹخنوں سے اونچی شلوار ہو۔

"بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے"

سیاسی پارٹی تو بہت بڑی بات ہے کہ اسے عوام کے سامنے اپنے ہر عمل کا جواب دہ ہونا پڑتا ہے، اگر کوئی چھوٹا سا عزت دار خاندان بھی ہوتا تو اس انٹرویو کے بعد شرم سے پانی پانی ہو جاتا۔ لیکن جمہوریت کا کمال یہ ہے کہ ایسا سب کچھ ہونے کے باوجود کمال ڈھٹائی سے لوگ اس کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ لودھراں سے کامیاب ہونے والے قومی اسمبلی کے ممبر صدیق بلوچ کے کالعدم قرار دیئے جانے والے فیصلے پر "عمل در آمد روکا جاتا ہے اور معزز رکن کی رکنیت اس وقت تک بحال کی جاتی ہے جب تک مکمل فیصلہ نہیں آجاتا۔ معزز "رکن اسمبلی کو الیکشن ٹربیونل نے جعلی ڈگری کی بنیاد پر تمام عمر کے لئے نااہل قرار دیا تھا۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ آتے ہی میڈیا میں بریکنگ نیوز کا طوفان مچ گیا۔ رات کے ٹاک شوز میں یہی سب کچھ موضوع گفتگو تھا۔ سیاسی پارٹیوں کی نوک جھوک جاری تھی۔ ایسے میں کوئی اس جانب نہیں آرہا تھا کہ معزز رکن اسمبلی جو اپنی اعلیٰ تعلیمی قابلیت یعنی "ایم اے" کے جعلی ہونے پر نااہل ہوئے ہیں ان سے سوال کر لیا جائے کہ آپ پر یہ الزام غلط تھا یا نہیں۔ ایسے میں ایک ٹیلی ویژن کے شو میں وسیم بادامی نے ان سے ایک معصومانہ سوال کر دیا۔ اس نے پوچھا کہ آپ نے کس مضمون میں "ایم اے" کیا ہے۔ موصوف جو نوے فیصد جواب آنکھیں بند کر کے دے رہے تھے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے بھی انہوں نے آنکھیں بند رکھیں اور فرمایا "یار تیرہ سال پہلے میں نے ایم اے کیا ہے؟ اب یاد تھوڑا ہے کہ کس مضمون میں کیا تھا" ایک ہلکی مسکراہٹ اینکر پرسن کے چہرے پر آئی اور اس نے پھر سوال کیا آپ کو وہ ادارہ تو یاد ہوگا جس سے آپ نے ایم اے کیا، فرمانے لگے "میٹرک میں نے ملیر کینٹ سے کیا، ایف اے بھی ملیر کینٹ سے کیا، بی اے بلوچستان سے اور ایم اے پنجاب سے۔ حصولِ تعلیم کے لئے شہروں شہروں دربدر ہونے والے معزز رکن اسمبلی سے۔ "اینکر پرسن" نے پھر پوچھا آپ یہ بتا ہی دیں کہ آپ "نے ایم اے کس مضمون میں کیا ہے۔ کہنے لگے "یاد تو نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ میں نے ایم اے آرٹس میں کیا ہے۔ اس کے بعد پروگرام ایک شرارتی سی مسکراہٹ پر اختتام پذیر ہو گیا۔ یہ شرارتی مسکراہٹ یقیناً توہین جمہوریت تھی۔ یہ طنز دراصل سسٹم کو ناکام بنانے کے لئے تھا اور ایسے سوال معزز اراکین اسمبلی سے پوچھنا دراصل میڈیا کی بہت بڑی سازش ہے جو مقتدر قوتوں کے اشارے پر ایسا کرتا ہے۔

صدیق بلوچ کے اس "عالمانہ "اور" مفکرانہ "جواب پر اس عوامی نمائندگی کے شاندار نظام کے کئی واقعات ذہن میں گونجنے لگے۔ تقریباً تیس سال قبل بلوچستان کی ایک وزیرِ تعلیم تھیں۔ ابھی میڈیا نے اس طرح الیکٹرونک پالنے میں جنم نہیں لیا تھا۔ اخباری انٹرویو ہوتے تھے جو بڑے انہماک سے پڑھے جاتے تھے۔ ایک صحافی نے محترمہ کا انٹرویو کیا۔ سوال و جواب کی نوعیت ملاحظہ کریں اور ذہانت و علمی استعداد پر سر دھنیں۔ میڈیم آپ کی تعلیم کیا ہے۔ "میں نے بی اے کیا ہے" ، اچھا آپ نے گریجویشن کی ہے، "نہیں میں نے بی اے کیا ہے"۔ آپ نے کہاں سے بی اے کیا ہے۔ "میں نے کانوینٹ سکول سے بی اے کیا ہے" مشرف دور میں جب بی اے کی ڈگری کو الیکشن لڑنے کے لئے لازمی قرار دیا گیا تو جہاں عام یونیورسٹیوں کی جعلی ڈگری میدان میں آئیں وہیں مدارس کے درسِ نظامی کی جعلی اسناد بھی پیش کی گئیں۔ ان اسناد کا پورے کا پورا متن عربی زبان میں تحریر ہوتا ہے۔ کوئٹہ شہر کے ایک حلقے سے ایک امیدوار ایسی ہی ایک سند لے کر ریٹرننگ آفیسر کے پاس گیا، جس نے اسے قبول کر لیا۔ مخالف امیدوار اس کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل میں چلا گیا۔ امان اللہ لیسین زئی جو ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے ان کی عدالت میں مقدمہ تھا۔ جج صاحب نے مدرسے کی درسِ نظامی کی عربی میں تحریر کردہ سند ہاتھ میں پکڑی اور فاضل امیدوار صوبائی اسمبلی سے کہا آپ اسے پڑھ کر سناؤ۔ اس سوال پر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے چالاک ذہن نے فوراً جواب دیا "سر اس وقت وضو میں نہیں ہوں"۔ جج صاحب نے کہا یہ ساتھ باتھ روم ہے، آپ جا کر وضو کر آئیں، وہ ایک دم بولا "وہ دراصل مجھے جلدی عدالت آنا تھا، اس لئے میرے کپڑے بھی ناپاک ہیں اور غسل بھی واجب ہے" عدالت کا پورا ہال مسکرا اٹھا۔ لیکن آپ اس جمہوری نظام کا کمال دیکھیں کہ اس شخص نے الیکشن لڑا بھی اور وہ جیتا بھی۔

جھنگ کے ایک امیدوار کی ڈگری بھی اسی طرح عدالت میں چیلنج ہوئی۔ جج نے اس کے سامنے کاغذ رکھا اور کہا اس پر اپنا نام انگریزی میں لکھ دیں۔ اس نے کہا گزشتہ رات سے میرے ہاتھ میں کوئی رعشہ سا ہے میں قلم نہیں پکڑ سکتا۔ جج مسکرایا اور بولا اچھا، آج آپ انگریزی کی ABC سنا دیں۔ "عظیم" قومی رہنما نے اپنی زبان میں کہا "جج صاحب نکی سناواں یا وڈی" (یعنی بڑی اے بی سی سناؤں یا چھوٹی)۔ لطیفوں کی یہ ایک طویل داستان ہے جو برصغیر پاک و ہند کی پارلیمانی تاریخ سے شروع ہوتی اور پاکستان کے موجودہ نظام تک تواتر کے ساتھ چلی آرہی ہے۔ یہ لطیفے صرف ڈگریوں کے جھوٹ تک محدود نہیں بلکہ اسمبلی کی کاروائی میں بھی ان تمام قانون ساز افراد کی عقل و دانش تک جا پہنچتے ہیں۔ ممتاز دولتانہ پاکستان کی تحریک اور مسلم لیگ کے اہم رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے والد یار محمد دولتانہ یونینسٹ پارٹی کے تحت پنجاب اسمبلی کے رکن تھے۔ یہ وہ اسمبلی ہے جس کے ارکان جب منتخب ہو کر اسمبلی پہنچے تو ان کی تواضع چائے اور پیسٹری سے کی گئی۔ یہ پیسٹریاں گول چھوٹی ٹرے نما کاغذی پیالیوں میں رکھی تھیں۔ ان میں سے کئی تھے جو پیسٹریاں کاغذ سمیت کھا گئے تھے۔ یار محمد دولتانہ کے ذمے انگریز سرکار نے یہ کام لگایا کہ ہم زمینداروں کے بارے میں ایک بل اسمبلی میں لا رہے ہیں اس پر بحث نہیں ہونا چاہیے۔ ایک رکن اسمبلی مصر تھا کہ میں یہ کروں گا۔ اسے لاکھ منانے کی کوشش کی گئی، مگر وہ نہ مانا۔ انگریز سرکار کا حکم بھی ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ یار محمد دولتانہ کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ اس کو روکو اور خصوصی طور پر ان کی نشست اس ممبر اسمبلی کے پہلو میں لگوا دی گئی۔ جیسے ہی بل اسمبلی میں پیش ہوا، تو وہ ممبر اسمبلی بحث کے لیئے کھڑا ہو گیا اور دولتانہ صاحب نے فوراً اس کی شلوار کا آزار بند کھینچ دیا جس سے شلوار نیچے گر گئی اور وہ اسے سنبھالنے میں لگ گیا۔ اتنی دیر میں بل پر ووٹنگ مکمل کر لی گئی اور بل منظور ہو گیا۔

پارلیمانی تاریخ کے شعبدے آج بھی اسی طرح قائم ہیں۔ ایسے لوگوں کا دفاع کرنے والوں کی بھی ایک فوجِ ظفر موج ہے جو کہتے ہیں یہ سسٹم کی پیداوار ہیں اور جیسے عوام ہیں ویسے ہی نمائندے ہوں گے۔ ان سب سے کوئی یہ سوال کرے کہ اگر آپ نے اپنا گھر بنانا ہو، کاروبار شروع کرنا ہو، بیٹی کی شادی کرنی ہو، کسی جگہ سرمایہ لگانا ہو تو آپ جانچ پرکھ کر بندہ دیکھتے ہیں ایسے شخص سے مشورہ کرتے ہیں جسے ان چیزوں کا علم اور تجربہ ہو۔ لیکن جمہوریت ایسا نظام ہے کہ اگر اکثریت جاہل کے ساتھ ہو تو جہالت، ناخواندگی اور کم علمی کا وزن علم، تجربے، کردار اور اخلاق سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا۔

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اسی نہ تولنے کے نتیجے کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

گریز از طرزِ جمہوری، غلامِ پختہ کارِ شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آئی

(جمہوری طرز سے گریز کرو اور کسی پختہ کار کے غلام ہو جاو، اس لئے کہ دو سو گدھوں کے دماغ سے انسانی فکر پیدا نہیں ہو سکتی)۔

برصغیر کے مسلمانوں میں سیکولرازم اور مادہ پرستی کی ابتداء

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاں جہاں نور ایمان اور ہدایت کا ذکر فرمایا ہے تو اسے اپنا خاص فضل کہا ہے۔ ہدایت کسی شخص کی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ اللہ ہدایت کسی کے مالی حالات اور دنیاوی جاہ وجلال کو دیکھ کر عطا نہیں کرتا۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اس کے لئے لڑنے والے' آواز بلند کرنے والے' اس کے نام کا غلغلہ چار دانگ عالم میں پھیلانے والے فاقہ مست' بے سروسامان ہیں یا ان کے پاس وسائل دنیا کی بھرمار ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ بہت سوں کو ہدایت بخشتا ہے اور بہت سوں کو گمراہی کے اتھاہ سمندر میں پھینک دیتا ہے۔ لیکن اس کے لئے اس کا ایک قاعدہ ہے اللہ فرماتا ہے ''اللہ کو اس بات سے عار نہیں کہ وہ مچھر یا اس سے بھی کمتر کسی چیز کی مثال بیان فرمائے۔ جو مومن ہیں وہ یقین کرتے ہیں کہ وہ ان کے پروردگار کی طرف سے سچ ہے اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ کی مراد ہی کیا ہے۔ اس سے اللہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت بخشتا ہے اور گمراہ بھی کرتا ہے تو صرف نافرمانوں کو (البقرہ 26) اسی آیت کے ساتھ ہی اللہ نے نافرمانوں کی تعریف کی ہے اور بتایا کہ ان کی نشانیاں کیا ہیں۔ اللہ فرماتا ہے ''جو اللہ سے اقرار کو مضبوط کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جس رشتہ قرابت کے جوڑے رکھنے کا اللہ حکم دیتا ہے اور اس کو قطع کردیتے ہیں اور زمین میں خرابی کرتے ہیں' یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں (البقرہ 27) اسی لیے اللہ نے نور ہدایت کو اسباب دنیا سے علیحدہ کر دیا اور کامیابی کو بھی اس دنیا کے جاہ وجلال اور کروفر سے مختلف چیز قرار دیا بلکہ ہر اس شخص کو اپنے غضب کا نشانہ بنایا جسے اپنے وسائل' طاقت اور قوت پر اسقدر بھروسہ تھا کہ اس پر گمان ہونے لگا کہ اسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ فرعون کے غرقابِ نیل ہونے کا قصہ اللہ کی ان نشانیوں میں سے ایک ہے جس میں وہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے بنی اسرائیل کو فرعون کے بدترین مظالم سے نجات دلائی۔ اس فرعون سے جو تمہارے بیٹوں کو قتل کر دیتا اور بیٹیوں کو زندہ رکھتا۔ اللہ نے انسانی تاریخ میں بار بار یہ ثابت کیا کہ وہ کیسے بے سروسامان لوگوں کو ہدایت دیتا ہے اور کیسے وسائل سے مالامال افراد کو گمراہی کی اتھاہ گہرائیوں میں چھوڑ دیتا ہے۔

برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں نے کئی سو سال حکومت کی۔ اللہ نے انہیں فتح ونصرت سے بھی سرفراز کیا اور پورے علاقے میں ان کی دھاک کو بھی قائم رکھا۔ مغلیہ سلطنت مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا سرمایہ' دولت' علم' اسباب سب ان کے پاس جمع تھے۔ مغلیہ دور کا سب سے مستحکم اور شاندار زمانہ جلال الدین اکبر کا طویل دور اقتدار سمجھا جاتا ہے۔ 13 سال کی عمر میں برسراقتدار آنے والا اکبر ایک سیدھا سادا خوش عقیدہ مسلمان تھا۔ نماز باجماعت کی پابندی تو ایک طرف وہ خود اذان دیتا' امامت کراتا اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا۔ صدرالصدور شیخ عبدالغنی کے علم کا وہ معتقد تھا اور اکثر حدیث سننے ان کے گھر جاتا' اپنے بیٹے شہزادہ سلیم کو ان کی شاگردی میں داخل کیا تاکہ عبدالرحمٰن جامی کی ''چہل حدیث'' ان سے پڑھے سلطان الہند خواجہ اجمیری چشتی سے ایسی روحانی عقیدت اس میں پیدا ہوئی کہ کئی دفعہ فتح پور سیکری اور آگرے سے پیدل اجمیر گیا۔ شیخ سلیم چشتی کی قربت کی خاطر تمام تخت وتاج فتح پور سیکری منتقل کیا اور وہاں ایک پرانے سے حجرے میں اکثر اوقات مراقبوں' دعاؤں اور عبادتوں میں گزارتا۔ یہیں اس نے ایک نئی عمارت تعمیر کی جس کا نام عبادت خانہ رکھا اور ہر جمعے کی نماز کے بعد وہ یہاں آکر بیٹھتا اور وقت کے مشائخ' علماء' فضلا اور مقربین مذہبی مسائل پر آزادانہ بحث کرتے۔ اس بحث کا دائرہ بہت وسیع ہوتا تھا۔ اس میں دنیا بھر کے مذاہب اور ادیان پر گفتگو ہوتی۔ انہی دنوں یورپ میں تحریک احیائے علوم چلی تھی جس نے وہاں کے رہنے والوں میں ترقی اور علم کی تلاش کی ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ سپین سے مسلمانوں کے علمی ورثے سے فیض یاب ہونے کے بعد یورپ نے اپنے اندر جو تبدیلی پیدا کی وہ انہیں مذہب سے آہستہ آہستہ دور لے گئی اور پھر انہوں نے اس بات پر کامل یقین کر لیا کہ دنیا کی تمام تر ترقی صرف اور صرف اسباب کی محتاج ہے اور یہ اسباب بھی انسان خود پیدا کرتا ہے۔ اس کے لئے کسی غیرمرئی یا بلند وبالا طاقت کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ نظریات اکبر کے دربار کی گفتگو میں بھی عام ہونے لگے' ابوالفضل اور فیضی جیسے نورتن جو اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے مشہور تھے اس کے قریب آتے گئے۔ سرتھامس رو نے 1613ء میں جو سفرنامہ مرتب کیا ہے اس میں دربار اکبری کی ان تمام بحثوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان تمام بحثوں کے نتیجے میں اکبر کے دل میں یہ خیال مضبوط ہو گیا کہ سچائی کسی ایک مذہب کا اجارہ نہیں بلکہ ہر مذہب میں اچھی باتیں موجود ہیں' اس لیے اسلام کو دیگر مذاہب پر کوئی برتری نہیں دی جا سکتی۔ بادشاہ کے دل میں اس تصور کے آتے ہی ہندو پنڈتوں اور عیسائی پادریوں نے اسلام اور شعائر اسلام پر آزادانہ گفتگو شروع کر دی۔ حیرت کی بات ہے کہ اس سب کا آغاز بے لاگ تحقیق اور آزادی اظہار کے نام پر ہوا۔ بادشاہ اور اس کے مشیر ہر مذہب کو اپنے علم اور اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھتے اور جو چیز ان کی عقل میں نہ آتی اسے فوراً رد کر دیتے۔ عقل کی اس کسوٹی پر رد ہونے والی چیزوں میں روزِ آخرت' حساب کتاب' وحی' رسالت اور سب سے بڑھ کر اللہ کی حاکمیت جیسے عقائد شامل تھے۔ یہ وہ صورت حال تھی جس سے برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں میں سیکولرازم اور مادہ پرستی کی بنیاد پڑی۔ سیکولرازم کا کمال یہ ہے کہ یہ دنیا کے ہر مذہب کو اپنے نظریات کے لئے اسقدر خطرہ تصور نہیں کرتا جس قدر اسلام کو تصور کرتا ہے۔ کیونکہ باقی تمام مذاہب ہیں جبکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی اور طرز معاشرت' سیاست اور معاشیات کا درس دیتا ہے۔ اس کے بتائے ہوئے نظام زندگی پر حملہ تو اتنا آسان نہیں کہ کوئی اور بہتر متبادل میسر نہیں۔ اسی لئے اس کے بنیادی عقائد اور شخصیات کو نشانہ بنا کر سیکولرازم اور مادہ پرستی کی راہ ہموار کی جاتی ہے۔ اس دربار کا نقشہ ایک مورخ اور بہت بڑے عالم دین نے یوں کھینچا ہے۔ ''اکبر کے دربار میں یہ رائے عام تھی کہ ملت اسلام جاہل بدوؤں میں پیدا ہوئی تھی' یہ کسی مہذب وشائستہ قوم کے لیے موزوں نہیں۔ نبوت' وحی، حشر ونشر' دوزخ جنت' ہر چیز کا مذاق اڑایا جانے لگا' قرآن کا کلام الٰہی ہونا مشتبہ' وحی کا نزول عقلاً مستعبد' مرنے کے بعد ثواب و عذاب غیر یقینی' البتہ تناسخ پر یقین ممکن' معراج کو علانیہ محال قرار دیا جاتا' ذات نبویؐ پر اعتراضات کیے جاتے۔ خصوصاً غزوات پر کھلم کھلا حرف گیریاں کی جاتیں۔ دنیا پرست علماء نے اپنی کتابوں کے نسخوں میں نعت لکھنی چھوڑ دی تھی۔ دیوان خانہ شاہی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ نماز پڑھ سکے''۔ یہی حالات تھے جب اکبر نے یہ حکم دے دیا تھا کہ نئی مسجدیں تعمیر نہ ہوں' پرانی مسجدوں کی مرمت نہ ہو' یہاں تک کہ اس کے آخری ایام حکومت میں لاہور شہر میں کوئی مسجد نہ رہی تھی اور مسجدوں کو اصطبل بنا دیا گیا تھا۔ یہ وہ تمام حالات اور ایسے سوالات ہیں جو آج بھی کسی مادہ پرست سیکولر محفلوں کے بحث مباحثے میں آپ کو نظر آئیں گے۔ کسی سیکولر دانشور کے مضمون کو اٹھایئے' کسی ویب سائٹ پر چلے جایئے۔ آپ کو اگر کسی مذہب پر اعتراض نظر آئیں گے تو صرف اور صرف اسلام پر۔ اکبر کے اسی سیکولر ماحول سے دین الٰہی نے جنم لیا۔ جس کے نظریات کو بیان کرنے کے لئے ایک الگ مضمون چاہیے لیکن اللہ اپنے بندوں کو ہدایت مہیا کرنے کا بندوبست ضرور کرتا ہے۔ اللہ نے اس طوفانی یلغار کے مقابلے میں ایک عظیم شخصیت کو کھڑے ہونے کی توفیق عطا فرمائی جن کا نام مجدد الف ثانی تھا۔ پورے برصغیر میں پیران طریقت بھی موجود تھے اور علمائے عظام بھی' لیکن یہ سب کے سب وقت کی مصلحت میں خاموش تھے۔ یہ سب بھی دنیا کے اسباب کو ترقی کی معراج سمجھنے لگ گئے تھے۔ صرف دو لوگوں کا ذکر ملتا ہے جو اس گمراہی کے خلاف سینہ سپر ہوئے۔ ایک مخدوم موسیٰ پاک شہید کے بھائی شیخ عبدالقادر گیلانی اور دوسرے اجمیر شریف کے متولی شیخ حسین اجمیری۔ دونوں کے نصیب میں قید کی صعوبتیں آئیں۔ مجدد الف ثانی کو اپنے زمانے میں علماء' شیوخ اور دانشوروں نے معاملہ شناسی سے عاری' دنیا کے حالات سے بے خبر' مصلحت کے مخالف اور عقل وہوش سے بے بہرہ قرار دیا۔ ان کا تمسخر اڑایا گیا۔ انہیں وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہونے کا طعنہ دیا گیا۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اللہ نے نصرت مجدد الف ثانی کے دست حق پرست پر رکھ دی تھی اور اکبر کا دین الٰہی اپنے تمام تر اسبابِ دنیا کے باوجود اس کی موت کے ساتھ اپنی موت مر گیا۔ اللہ کے بندوں کی ایک اور پہچان ہے جو مجدد الف ثانی کے کردار میں نظر آتی ہے۔ اللہ فرماتے ہیں ''اللہ کے راستے میں جو ملامت تمہیں ملتی ہے یہ تو اللہ کا فضل ہے''۔ اسی لئے وہ اس ملامت پر اور اپنا تمسخر اڑانے پر' اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اپنے راستے پر مستقل گامزن رہتے ہیں کہ انہیں اس بات پر یقین ہوتا ہے کہ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور کامیابی بھی اسی کی عطا ہے۔

بارھواں کامن جاوید نثار سید ۔ میڈی بینک

آج سے ٹھیک اکتیس سال قبل 18 اکتوبر 1984ء کو سول سروسز اکیڈمی کی راہداریوں میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ نوجوانوں نے قدم رکھا۔ ہر کوئی مستقبل میں بیوروکریسی کی اعلیٰ منازل طے کرنے کے خواب آنکھوں میں سجائے ہوئے تھا۔ ملک کا اعلیٰ ترین امتحان نہ صرف پاس کرنا بلکہ اس میں ایک ایسی پوزیشن حاصل کرنا کہ بیوروکریسی کی منزلِ اول کی نوکری آپ کو میسر آجائے، اس کا نشہ ہر کسی کے دماغ کو ساتویں آسمان پر جا بٹھاتا ہے۔ رشتے دار، دوست، اہلِ محلہ یہاں تک کہ عام لوگ بھی ان نوواردانِ سول سروس کو ایک مختلف نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ ایسے تکبر اور نخوت کا زہر بڑے بڑوں میں سرایت کرہی جاتا ہے۔ لیکن اکیڈمی میں یہ ایک برادری، ایک کنبہ اور ایک خاندان نظر آتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نوکری کی بھول بھلیوں، اقتدار کی کشمکش، آگے بڑھنے کی ہوس اور دیگر عوامل ان کو ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کر آگے بڑھنے کی لت ڈال دیتے ہیں۔ لیکن اس سب کا احساس انہیں اکیڈمی کے دنوں میں نہیں ہوتا۔ ملک بھر کے اعلیٰ ترین دماغ انہیں حکمرانی کے گر سکھانے آتے ہیں۔ عام آدمی سے الگ ان کی دنیا جیسی انگریز نے آباد کی تھی تھوڑے فرق کے ساتھ آج بھی ویسی ہی ہے۔ پاکستان میں بیوروکریسی کی تمام نوکریوں، دفترِ خارجہ، کسٹم، پولیس، انکم ٹیکس، انفارمیشن، اکاؤنٹس سے لے کر مشہورِ زمانہ سی ایس پی، پھر ڈی ایم جی اور آج کل پاکستان ایڈمنسٹریٹر سروس تک تمام گروپوں کے یہ افسران جب اکیڈمی میں اکٹھے آتے ہیں تو اسے "کامن ٹریننگ" کہا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ 1973ء میں شروع ہوا۔ اس سے پہلے تمام گروپ علیحدہ علیحدہ ٹریننگ کرتے تھے۔ 1984ء کا یہ گروپ "بارھواں کامن" کہلایا۔ ڈیڑھ سو کے اس ہجوم میں ایک میں بھی تھا۔ طبعاً افسری ماتحتی کے بکھیڑوں سے دور، ڈسپلن نام کی بلا سے بھاگا ہوا، قہقہوں میں عمر بھر کی پریشانیوں کو چھپاتا اس ماحول میں آنکلا تھا۔ کہتے ہیں ہر شخص کا ایک مقناطیسی دائرہ ہوتا ہے جو اپنے جیسے مقناطیسی مزاج رکھنے والے کے دائرے میں اڑ کر پہنچ جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ اکیڈمی میں جس شخص کے طلسم نے مجھے اپنا اسیر کیا وہ جاوید نثار سید تھا۔ ایک حیران کن شخص، ایک صنعت کار کا بیٹا جس کے پاس اس وقت نئے ماڈل کی گاڑی تھی، جب اکیڈمی میں صرف چند لوگ گاڑیاں رکھ پاتے تھے۔ میری طرح ڈسپلن کے بکھیڑوں اور افسری ماتحتی کے دائروں سے دور، مزاج جس کا اوڑھنا بچھونا کہ کہتے ہیں فیصل آباد کی مٹی ہی ایسی ہے، ہر طرح سے ایک کھلنڈرا اور متلون مزاج نوجوان، لیکن اس کی ایک صفت ایسی تھی جس نے اس کی شخصیت میں جاذبیت، کشش اور مقناطیسیت پیدا کی تھی۔ وہ تھی اس کی مہمان نوازی۔ میں نے زندگی میں اس سے وسیع دسترخوان کسی شخص نہیں دیکھا۔ ایک ایسا شخص کہ جس کا دل چاہتا ہو کہ اس کا دسترخوان ہر وقت بچھا رہے اور وہ لوگوں کو خوش خوش کھلاتا پلاتا رہے۔ یہ تو صوفیاء کا دستور تھا اور آج بھی ہے۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا آپس میں رنجش ہو جائے تو ایک دوسرے کی دعوت کرو (مفہوم)۔ ایسے شخص کا حلقۂ اثر تو وسیع ہونا ہی تھا۔ اس کی گاڑی اس کے "متاثرین" سے بھری رہتی اور اس کی محفل اس کے قہقہوں، لطیفوں اور بذلہ سنجیوں سے آباد رہتی۔ اکیڈمی کے دن پر لگا کر اڑتے چلے گئے۔ میری خوش نصیبی کہ میں بھی اسی کے ساتھ ڈی ایم جی میں تھا۔ اس لیے ہم لوگ مال روڈ پر سول سروسز اکیڈمی میں رہ گئے اور باقی تمام گروپ بکھر گئے۔ یوں مجھے مزید اس شخص کی معیت میسر آگئی۔ لیکن تقریباً نو ماہ بعد میں نے بلوچستان میں نوکری کے لیے اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور وہاں چلا گیا اور وہ پنجاب کے خالص افسرانہ ماحول کا حصہ بننے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ایسا شخص بیوروکریسی کے کاٹ دار اور ایک دوسرے کی لاش پر کھڑے ہو کر قد بلند کرنے والے ماحول کا حصہ نہیں بن سکتا۔ وہی ہوا، چند پوسٹنگ اور پھر اس شخص کو سول سروسز اکیڈمی کے علمی ماحول میں پناہ ملی جہاں اس نے آٹھ سال ٹریننگ کرواتے گزار دیے۔ لیکن اس شخص سے میرا رابطہ ایسے ہی قائم رہا جیسے پردیس میں آباد لوگوں کا اپنے علاقے کی ہواؤں سے رہتا ہے۔ وہ ایک خوشبو اپنے دامن میں لیے پھرتا ہے اور جو کوئی اس شہر لاہور میں آتا ہے اسے زبردستی اس خوشبو کی لپیٹ میں لیتا ہے۔ آج بھی اس کا دسترخوان وسیع بلکہ دن بدن وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

لیکن مجھے اس بات کا ادراک تک نہ تھا کہ میرا دوست جس سے میں ہر طرح کی بے تکلفی سے کلام کر لیتا ہوں، جس سے میرا دوستی کا ایسا رشتہ ہے کہ کسی حجاب اور مرتبے کا اس میں گزر نہیں، وہ شخص ایک دن کچھ ایسا کر گزرے گا کہ مجھے اس کی جانب ایسے دیکھنا پڑے گا کہ جیسے کسی بلند و بالا عمارت کو دیکھتے ہیں اور میں اس کے سامنے ایک بونا اور بالکل بے حیثیت سا ہو کر رہ جاؤں گا۔ میں اس کا دوست تھا لیکن اب میں اس کا مداح ہوں، اس سے مرعوب، اس کا ارادت مند اس کے حلقۂ اثر کا خوشہ چیں، حیران ہوں یہ وہی کھلنڈرا، متلون مزاج جاوید نثار سید ہے۔ لیکن یہ تو میرے اللہ کی عطا ہے، وہ جسے عطا کر دے، ہم تو بس فخر کر سکتے ہیں کہ ہم نے اس بہت بڑے شخص کے ساتھ چند دن گزارے ہیں اور وہ ہمیں اپنا دوست کہتا ہے۔

جاوید نثار سید کو ورثے میں اپنے والد کی طرف سے دوائیاں بنانے والی ایک بہت بڑی فیکٹری Pharma Helicon ملی۔ وہ خوشحال لوگوں میں سے ہے جو سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد سول سروس میں ڈی ایم جی گروپ کا ٹرک، کسی بھی شخص کو تکبر کی وادیوں میں بھٹکانے کے لیے یہ بہت سامان تھا۔ گزشتہ سال وہ حسبِ عادت "بارھویں کامن" کی ایک ملن پارٹی میں شریک تھا جو پنجاب کے گورنر ہاؤس کے سبزہ زار میں ہو رہی تھی۔ پارٹی کے دوران اسے سٹروک ہوا، وہ خود ہسپتال گیا، ڈاکٹروں نے کہا، معجزاتی طور پر بچ نکلا ہے، کچھ عرصے بعد اسے دل کا شدید دورہ پڑا، اللہ نے اسے صحت یابی عطا کی، لیکن اس سب کے بعد وہ بالکل بدل چکا تھا۔ ایک ایسا انسان جس نے اپنی باقی زندگی کو غنیمت جانا اور سوچا کہ یہ تو ایک وارننگ تھی اور باقی زندگی کو خلقِ خدا کی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ اس کی دوائیاں بنانے والی کمپنی 80 دوائیاں بناتی ہے۔ اس نے ان میں سے 40 اہم ادویات کو وقف کر کے 24 جولائی 2014ء کو "میڈی بینک" کے نام پر ایک ٹرسٹ قائم کر دیا۔ ان ادویات کی سالانہ آمدنی ایک ارب بیس کروڑ روپے ہے۔ یہ ٹرسٹ کسی بھی قسم کی امداد اور چندہ وصول نہیں کرتا۔ بڑے لوگ بھی کمال کے ہوتے ہیں۔ اس نے اس ٹرسٹ کو اپنے "بارھویں کامن" کے نام مسنون کر دیا۔ یوں میرے جیسے گناہگار اور ناکارہ شخص کے ہاتھ میں بھی ایک پرچی آگئی جو یقیناً اللہ کے حضور کام آئے گی لیکن وہ جاوید نثار جو یہ پرچی تقسیم کرتا ہے، میں سوچتا ہوں تو اس کے بلند مقام کا تعین ہی نہیں کر پاتا۔ بس اپنی کم مائیگی اور کوتاہیوں پر شرمندہ سا ہو جاتا ہوں۔ یکم رمضان کو قائم ہونے والا یہ میڈی بینک ٹرسٹ، ہسپتالوں میں میڈی بینک کھولتا ہے جہاں ڈاکٹروں کی تشخیص پر مستحق اور نادار لوگوں کو مفت دوائیاں فراہم کی جاتی ہیں۔ اس وقت بارہ ہسپتالوں اور چالیس سیٹلائٹ کلینک میں یہ بینک قائم کر دیے ہیں۔ جن میں اسلام آباد کا پمز، کراچی کے عباسی شہید، جناح پوسٹ گریجویٹ، ریلوے حسن ہسپتال، سروسز ہسپتال پشاور کا، ریلوے ہسپتال، ایبٹ آباد کا ایوب ہسپتال اور لاہور کا ریلوے ہسپتال شامل ہیں۔ سیٹلائٹ کلینک وہ ہیں جہاں ڈاکٹر یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی نسخہ لکھنے کی فیس نادار مریضوں کو معاف کر دیں گے تو ان کے کلینک پر میڈی بینک مفت ادویات فراہم کرے گا۔ میڈی بینک ان چالیس کلینکوں کو بڑھا کر پانچ سو ایسے کلینوں تک رسائی چاہتا ہے اور ملک کے ہر ہسپتال میں اپنا فری میڈی بینک قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ کوئی نادار اور غریب اس لیے علاج سے محروم نہ رہ جائے کہ وہ دوائی نہیں خرید سکتا۔ ان کے پاس موجود موجودہ رقم سے اندازہ ہے کہ پانچ سو سٹلائٹ کلینک اور 50 ہسپتالوں میں فری میڈیسن سنٹر قائم کیے جا سکتے ہیں اور اگلے پانچ سالوں میں پانچ ہزار کلینک اور 500 میڈیسن بینک قائم ہو جائیں گے۔ Helicon کمپنی پاکستان کی پانچ معیاری کمپنیوں میں شمار ہوتی ہے اور اس کی فراہم کردہ ادویات معیار کی ضمانت ہیں۔ میں میڈی بینک کے نمبر یہاں تحریر کر رہا ہوں کہ کوئی ڈاکٹر اگر اپنی نسخے کی فیس معاف کرکے یا کوئی ہسپتال اس کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہے، یا پھر کوئی اور ایسا شخص جو اس طرح کی ادویات کا بینک قائم کرنا چاہے وہ اس شمع سے روشنی لے سکے۔ Call:0300-4135120,0333-4172797,Medi

Ph:042-35726183 trust@gmail.com ,medibank

,BankTrust@facebook.com

یہ سب اس لیے لکھ رہا ہوں کہ میرے اس دوست نے مجھے راستہ دکھایا ہے، نجات کا، اپنے گناہوں کے کفارے کا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا "سخی اللہ کا دوست ہے کہ چاہے فاسق اور فاجر کیوں نہ ہو۔" میرا دوست تو اللہ کا دوست ہے اور کیسا عظیم دوست ہے جس نے پورے "بارھویں کامن" کو بھی اس دوستی میں شریک کر لیا ہے۔ اس کی سخاوت کی عادت نے اللہ سے دوستی میں بھی سخاوت کو ترک نہیں ہونے دیا۔ ایسے شخص کو میں دوست نہیں محبوب کہہ سکتا ہوں۔ ایک ایسا محبوب جس کے کردار کی روشنی نے سول سروس کے چہرے پر بھی روشنی بکھیری ہے۔

بنیادی ڈھانچہ

کس قدر بد قسمت ہوتی ہیں وہ قومیں جو سچ اور جھوٹ' حق اور باطل' اخلاق اور بد اخلاقی جیسے معاملات کا تعین عوام کی اکثریت کے ہاتھ میں دے دیں۔ سقراط کو جب موت کی سزا سنائی جا رہی تھی تو پورا ایتھنز شہر ایک جیوری تھا۔ وہ دنیا کی اولین جمہوری شہری ریاست تھی۔ ان کے جمہوری آئین کا کوئی بنیادی ڈھانچہ نہ تھا۔ ہر چیز جسے وہاں کے رہنے والوں کی اکثریت حق تصور کرتی وہ حق اور جسے باطل کہہ دیتی وہ باطل۔ اسی لئے سقراط نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا "اے ایتھنز والو! میں تمہاری عزت کرتا ہوں' مجھے تمہارا احترام ہے لیکن میں تمہاری جگہ خدا کی اطاعت کروں گا"۔ اس نے کہا یہ عدالت نہیں ایک ہجوم ہے اور ہجوم سے عقل اور انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی ۔ لیکن بنیادی ڈھانچے سے ماورا جمہوری آئین پر قائم شہری ریاست ایتھنز کی عدالت نے سقراط کو موت کی سزا سنائی تو اس کی دی گئی وارننگ تاریخ کا حصہ ہے۔ اس نے کہا "مجھے سزائے موت دینے کے بعد کیا تم اپنی زندگی کا حساب دینے سے بری ہو جاؤ گے؟ لیکن میں کہتا ہوں کہ تمہارے لیے یہ ایک بالکل برعکس نتیجہ ہو گا۔ بہت اشخاص ایسے ہوں گے جو تم سے حساب طلب کریں گے اور یہ وہ ہیں جنہیں میں نے دیکھ لیا ہے۔ مگر تم انہیں نہیں دیکھ پائے۔ وہ بہت تند مزاج ہوں گے"۔

گزشتہ ایک سو سال سے ہمیں یہ سبق بزور طاقت پڑھایا اور سکھایا جا رہا ہے کہ دنیا کی کوئی حکومت آئین کے بغیر نہیں چل سکتی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس سبق کو پڑھانے میں اولین ملک برطانیہ تھا جس کا اپنا کوئی آئین نہیں ۔ پوچھو تو ایک مضحکہ خیز جواب دیا جاتا ہے کہ ہمارا ایک غیر تحریری (UnWritten) آئین ہے۔ جو لوگ دس پاؤنڈ سے کم کا معاہدہ بھی تحریر میں لاتے ہوں۔ ہر معاملے کے لئے مفصل قانون بناتے ہوں اور قانون پر ان کی کتابوں کی کتابیں موجود ہوں' وہ چند سو صفحات کا آئین تحریر نہیں کر پاتے۔ جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہماری اقدار و روایات ہمارا آئین ہیں۔ یہ اقدار و روایات کس بلا کا نام ہے۔ دنیا کی ہر درس گاہ جس میں قانون کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے وہاں سب سے پہلے ایک مضمون پڑھایا جاتا ہے جسے Jurisprudence کہا جاتا ہے۔ اس مضمون کا پہلا سبق یہ ہے کہ "قانون لوگوں کی اقدار اور رسم و رواج سے جنم لیتا ہے"۔ یہ اقدار اور روایت دنیا کے ہر معاشرے کا بنیادی ڈھانچہ ہوتی ہیں۔ انہیں دنیا کی بڑی سے بڑی جمہوریت بھی تبدیل نہیں کر سکتی۔ جو جمہوریت یہ دعویٰ کرتی ہے وہ جھوٹ بولتی ہے۔ کیا پاکستان' برطانیہ' امریکہ یا فرانس کی کوئی پارلیمنٹ یا کانگریس اکثریت رائے سے یہ آئینی ترمیم کر سکتی ہے کہ عدالت کے روبرو جھوٹی گواہی دینا جائز ہے' انسان کو زندہ رہنے کا حق نہیں اس لئے قتل پر سزا نہیں دی جا سکتی۔ کاروبار میں دھوکہ دراصل ایک ہنر اور فن ہے اس لئے اس پر انعام دینا چاہیے نہ کہ سزا ۔ والدہ' بہن' بیوی اور بیٹی جیسے رشتوں کو خوامخواہ انسان نے مقدس بنایا ہوا ہے۔ ان سے نکاح جائز ہے اور یہ ایوان کثرت رائے کے ساتھ ان سے شادی کی اجازت دیتا ہے کیونکہ ہمارے آئین میں جو پہلے لکھا گیا تھا وہ بنیادی ڈھانچہ نہیں۔ ہم سب کچھ تبدیل کر سکتے ہیں۔

یہ ساری بحثیں صرف اس لئے ہیں کہ ایک سیکولر جمہوری ریاست میں آئین کی کتاب کو ملک کی سب سے مقدس دستاویز سمجھا جاتا ہے اور اس کا درجہ' مقام اور مرتبہ کسی بھی الہامی کتاب سے زیادہ ہوتا ہے۔ دنیا کے ہر آئین سے روگردانی اور غداری کی سزا موت ہے۔ اسی لئے کیا اس مملکت خداداد پاکستان میں قرآن سے روگردانی یا غداری کی سزا موت ہے؟ جواب بہت تلخ ہے' لیکن بہت سچا ہے کہ اس ملک میں آئین کا مرتبہ' مقام اور تقدس عملاً قرآن پاک سے بلند ہے اور اب تو اس بات پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی کہ آئین کے بنیادی ڈھانچے جس کا حرف آغاز یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ یا بادشاہت صرف اور صرف اللہ کی ہے لیکن سپریم کورٹ کے موجودہ فیصلے کے بعد اب اس ملک کے پانچ سو کے قریب ارکان ایک متفقہ آئینی ترمیم سے یہ اعلان کر سکتے ہیں کہ اقتدار اعلیٰ یا بادشاہت اب اللہ نہیں آصف زرداری یا ممنون حسین کے "جسد پُر نور" میں سرایت کر گئی ہے اور جو بھی اقتدار کی کرسی پر بیٹھے گا اس کو مکمل بالادستی حاصل ہو گی کیونکہ آئین کا بنیادی ڈھانچہ اللہ اور قرآن و سنت کو بالادستی دیتا تھا' اب اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ جب بنیادی ڈھانچے کو گرانے کا اختیار ان ممبران اسمبلی کو مل گیا جو گزشتہ کئی دہائیوں سے دھن' دھونس اور دھاندلی کی پیداوار ہیں اور عدالت نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی تو پھر سقراط کی پیش گوئی کے دن قریب آ جایا کرتے ہیں۔

بنیادی ڈھانچہ کسی معاشرے کا ہوتا ہے اور آئین اس کی تصویر ہوتا ہے۔ گزشتہ دو تین صدیوں سے بحث چل رہی ہے کہ اخلاقیات الہامی یا مذہب کی عطا کردہ ہیں یا انسان نے اسے خود بنایا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ سچ' وعدے کی پاسداری' ماں' بہن' بیٹی' بیوی کے رشتے' دھوکا نہ دینا' قتل نہ کرنا' غیر فطری فعل سے اجتناب' یہ سب انسانوں کو مذہب نے سکھایا' لیکن سیکولر جمہوریت کے علمبردار کہتے ہیں کہ ان اقدار کو انسان نے بنایا ہے' اس لئے انہیں انسان بدل بھی سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جنس پرستی کی شادی کا قانون مغرب میں منظور ہو جاتا ہے کیونکہ وہ آئین کے کسی بنیادی ڈھانچے کو تسلیم نہیں کرتے اور سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد اب پاکستان میں بھی یہ ممکن ہو گیا۔ ایسی آئینی تبدیلی کے لئے اکثریت میں ہونا بھی ضروری نہیں ہوتا صرف شرم' حیا اور اخلاق بیچ کھانا شرط ہے۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ میں ایک فیصد بھی ہم جنس پرست نہیں ہوں گے' یہی حال امریکہ کا ہے' لیکن چونکہ کوئی بنیادی ڈھانچہ نہیں' اس لئے ایک فیصد سے کم ہم جنس پرستوں نے اس مکروہ فعل کو جائز کروا لیا۔

کہا جاتا ہے آئین کے بغیر ملک نہیں چل سکتا۔ لیکن جن کے نظریات پختہ اور ایمان مضبوط ہو وہ یہ کر کے دکھاتے ہیں 25 جنوری 1949ء کو اسرائیل کی پہلی آئین ساز اسمبلی منتخب ہوئی۔ اس آئین ساز اسمبلی میں دو فقرے بار بار گونجے' ایک توراتی جمہوریت (TorahDemocracy) اور دوسرا ہمارا آئین تورات ہے۔ اس اسمبلی نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ہم کوئی ایسی کتاب' دستور یا آئین نہیں بنا سکتے جو حیثیت بلکہ تھوڑی سی بھی حیثیت میں تالمود (Talmud) تناخ (Tanakh) اور شلخان آرخ (ShulkanArakh) سے بالاتر تصور کی جائے۔ ہماری مقدس کتابیں بالاتر ہیں' اس لیے ہر کوئی ایسی کتاب جسے آئین کہتے ہیں تحریر نہیں کریں گے اور آج 66 سال گزرنے کے بعد بھی اسرائیل نے اپنا آئین مرتب نہیں کیا۔ البتہ بحث جاری ہے اور آخری تقریر جو اس موضوع پر ہوئی وہ 7 مئی 2012ء کو اسرائیل کے وزیر انصاف یعقوب نیمان (YaccovNeman) نے کی۔ اس نے کہا اسرائیل کو ایک تحریری آئین کی اشد ضرورت ہے۔ یہاں سرکاری قانون سازی کا کوئی طریق کار ہی موجود نہیں ۔ روز مرہ معاملات کے لئے اسرائیل نے قانون ضرور بنائے ہیں جنہیں ہر جگہ Subordinate قانون سازی کہتے ہیں۔ دنیا بھر کی سیکولر جمہوری عالمی قوتوں کو دھوکا دینے کے لئے اور ان کے پریشر سے مجبور ہو کر مئی 2003ء میں اسرائیل نے ایک پراجیکٹ کا آغاز کیا جو آئین بنائے گا' جس کی صدارت مائیکل ایٹان (MichellEttan) کر رہا ہے۔ آج بارہ سال گزر چکے ہیں لیکن اس نے آئین کا مسودہ تک تیار نہیں کیا۔ اسرائیل نے روزمرہ کاروبار کے لئے سات قوانین پاس کیے جنہیں عمومی قانون کہا جاتا ہے۔ 1958ء میں اسمبلی رولز' 1960ء میں تعزیرات اور زمین' 1964ء میں صدر کا عہدہ' 1968ء میں حکومت' 1975ء میں معیشت' 1979ء میں فوج اور 1980ء میں یہ قانون کہ یروشلم دارالحکومت ہو گا۔ لیکن ریاست کے بنیادی ڈھانچے کے لئے انہوں نے کوئی آئین مرتب نہیں کیا بلکہ صرف یہ تحریر کر دیا کہ "ہمارا آئین تورات ہے"۔ یہ سب اس لئے کہ وہاں کے بسنے والے لوگوں کو ایسا کہتے اور لکھتے ہوئے کبھی کوئی شرمندگی نہیں ہوتی۔ اس ملک کو ایک بالفور ڈیکلریشن کے ذریعے بغیر خون بہائے عالمی طاقتوں نے تخلیق کیا تھا جبکہ لا الہ اللہ پر قائم پاکستان کی بنیادوں میں لاکھوں شہدا کا لہو شامل ہے جن کی خون سے کھینچی لکیر پر ایک بنیادی ڈھانچہ تحریر کر دیا گیا کہ یہ ملک اللہ کے لئے بنا تھا اور اس پر اسی کا قانون نافذ ہو گا۔ اب اس سے مکمل انکار کا راستہ ہموار ہو گیا۔ ایسا لمحہ آ جائے تو تاریخ یہ بتاتی ہے کہ قانون کی کتابیں دھری کی دھری رہ جایا کرتی ہیں اور انسان صدیوں سے قائم اخلاقیات کو خود نافذ کر دیا کرتے ہیں۔ سقراط نے کہا تھا بہت سے لوگ جنہیں تم نہیں دیکھ پائے لیکن میں نے دیکھ لیا ہے جو تم سے حساب لیں گے۔

بت گروں پیدا بت شکن کو پچھاڑا

شاید یہ خبر اس قدر عام نہ ہوتی اگر کامیابی کے نشے میں چور' بھارتی وزیراعظم نریندر مودی اپنے ٹوئٹر پر اس کا اعلان نہ کرتا کہ متحدہ عرب امارات کی حکومت نے ایک ہندو مندر بنانے کے لئے دبئی میں زمین فراہم کر دی ہے ۔ یہ خبر دنیا والوں کے لئے حیران کن ہو گی کہ وہ جزیرہ نمائے عرب جہاں آج سے چودہ سو سال قبل سید الانبیاء ﷺ نے شرک اور بت پرستی کا خاتمہ کر دیا تھا' اس کے ایک حصے میں انہیں کے ماننے والے مورتیوں کے گھر کی تعمیر کے لئے زمین عطا کریں گے۔ لیکن وہ جو سرکار دو عالمؐ کی پیش گوئیوں پر ایمان رکھتے ہیں اور وقت کے ساتھ ان کے یقین و ایمان میں اضافہ ہوتا جارہا ہے کہ اس ہادی برحقؐ نے کس طرح کھول کھول کر وہ سب کچھ بتایا اور ان سب علامات قیامت کی خبر دی جو انہیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔ صحیح بخاری میں درج سرور عالمؐ کی یہ پیش گوئی ''قیامت قائم نہیں ہو گی' یہاں تک کہ دوس قبیلہ کی عورتیں ذوالخلصہ کے بت خانہ میں چکر نہ لگائیں'' ۔ (بخاری)۔ عرب میں جاہلیت کے زمانے میں جگہ جگہ بہت سے بت خانے قائم تھے اور لوگ پوجا پاٹ کیا کرتے تھے۔ ان میں عرب کے جنوب مغرب میں دوس قبیلہ رہتا تھا جن کا بت خانہ ذوالخلصہ کے مقام پر تھا۔ دین حق پھیلا تو اس کا نام و نشان تک ختم ہو گیا۔ یوں تو دبئی ایک ایسا شہر ہے جہاں آپ کو دنیا میں موجود تقریباً ہر بڑے مذہب کی عبادت گاہیں مل جائیں گی جن میں ہندو مندر بھی شامل ہے ۔ اس لئے کہ دبئی کی معیشت تو مدتوں سے ایک ایسے ماحول سے وابستہ ہو چکی ہے جس میں خطے کی پیداوار کچھ ہو نہ ہو' وہ خطہ خوشحال ضرور ہوتا ہے۔ یہ کاروبار یا معیشت کی زبان میں ''آزادانہ تجارتی منڈی'' کا ماحول ہوتا ہے۔ اس ماحول میں صرف تجارت ہی نہیں بلکہ اخلاقیات و اقدار تک سب آزاد ہو جاتے ہیں۔ دبئی سے پہلے اس طرح کا ماحول ان شہروں میں پیدا کیا گیا جنہیں یا تو امریکہ یا دیگر عالمی طاقتوں نے فتح کیا تھا یا پھر وہ امریکہ کی کسی جنگ میں اس کے حلیف تھے اور ان ملکوں نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو جنگی مراکز قائم کرنے کی اجازت دی تھی۔ فلپائن کا شہر منیلا اس ''ماحول'' کی اولین تجربہ گاہوں میں سے ایک تھا۔ 1901ء کے ''شکاگو ٹرابیون'' میں ایک صحافی نے منیلا شہر کی روداد بیان کی ہے' جہاں امریکی فوجی فلپائن کے عوام کو سپین کے ظالم کیتھولک عیسائی حکمرانوں سے آزادی دلوانے پہنچے تھے۔ فلپائن کی آزادی کی جنگ کے ہیرو ''رزال'' نے اس ظلم و جبر کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح یہاں کی مقامی آبادی کو عیسائی بننے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ لیکن امریکی وہاں پہنچے' ان کی آزادی کی جنگ میں مدد کی' اپنی چھاؤنیاں بنائیں' اور پھر انہیں ایک اور بدترین غلامی کا شکار کر گئے ۔ صحافی اپنی روداد میں لکھتا ہے کہ ایک پوری امریکی فوجی یونٹ کے ذمے ''آرمی ویلفیئر'' کے نام پر ایک ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ ملک کے طول و عرض سے غریب گھرانوں کی تیرہ سے سولہ سترہ سال کی بچیوں کو بہلا پھسلا کر منیلا کے بازاروں میں لا بٹھائے تاکہ امریکی فوجیوں کی تفنن طبع کا انتظام ہو سکے ۔ دنیا بھر میں ایسے ماحول کو ''نائٹ لائف'' یعنی رات کی زندگی کہا جاتا ہے۔ آپ آج دنیا کے کسی بھی بڑے شہر کا سیاحتی معلوماتی کتابچہ نکال کر دیکھ لیں' آپ کو ''نائٹ لائف'' کے نام سے ایک علیحدہ باب اس میں نظر آئے گا۔ منیلا جیسے کئی شہر اس دنیا کے نقشے پر آباد کئے گئے۔ ان میں سے کئی بڑے بڑے تجارتی مراکز کے طور پر آج بھی موجود ہیں اور کئی صرف اور صرف اپنی خوبصورتی یا تاریخی حیثیت کی وجہ سے سیاحتی مرکز کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اسلامی دنیا میں جنگ عظیم اول کے بعد بیروت کو خاص طور پر ان مقاصد کے لئے سجایا اور سنوارا گیا۔ عالمی طاقتوں نے وہاں کی مخلوط آبادی عیسائی' شیعہ اور سنی کو اس طرح آئینی طور پر تقسیم کیا کہ ''میرونائٹ عیسائیوں'' کو اقتدار میں بالادستی رہے۔ صدیوں سے روم کے زیر نگیں رہنے والے اس شہر کے مخصوص تاریخی پس منظر اور پڑوس میں یہودی ریاست کے قیام کی وجہ سے اس کا اسلامی تشخص مٹانے کے لئے اس کو اس طرح کے ''آزادانہ ماحول'' کا تحفہ دیا گیا۔ ایسے ماحول کو کاروبار کے لئے سازگار ماحول کہا جاتا ہے۔ یہ کاروبار بھی عجیب ہوتا ہے۔ نہ وہاں کوئی کھیت ہوتے ہیں اور نہ کارخانے۔ معدنیات بھی اتنی نہیں ہوتیں کہ ملکی معیشت کا پیٹ پال سکیں۔ ایسے میں دنیا بھر کے تاجروں' سٹے بازوں' جواریوں' عیاشیوں' اوباشوں اور نام نہاد سیاحوں کو اس شہر کا راستہ دکھایا جاتا ہے۔

دبئی بھی انہی شہروں میں سے ایک ہے جس کا اپنا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں' یہاں تک کہ وہ تیل کی دولت سے بھی محروم ہے۔ تیل کی پیداوار اس کی پوری معیشت کا 2 فیصد ہے۔ لیکن 70ء اور 80ء کی دہائیوں میں اس نے سونے کی آزادانہ تجارت کا آغاز کیا اور نوے کی دہائی میں یہ بھارت کو سونا سمگل کرنے والا سب سے بڑا ملک بن گیا۔ سمگلنگ کی اس دولت سے دبئی کو ایک سیاحتی مرکز میں بدلنے کے لئے وہاں تعمیراتی کاموں کا آغاز ہوا اور پام جمیرہ کے نام سے دنیا کا سب سے بڑا انسانوں کا بنایا ہوا جزیرہ سمندر کے بیچوں بیچ تعمیر کیا گیا۔ ہیروں کے کاروبار کا آغاز ہوا اور اس وقت یہ تجارت 35 ارب ڈالر تک ہے۔ سیاحتی مرکز کو ایک شاندار ایئر لائن اور ایئرپورٹ کی ضرورت تھی۔ وہ ضروریات بھی پوری کیں اور دبئی ائرپورٹ شاید وہ واحد ایئرپورٹ ہے جو کسی مسلم ملک میں واقع ہے اور وہاں آپ کھانے کی دیگر ڈشوں کے درمیان عربی میں ایک چٹ نظر آئے گی جس پر لکھا ہو گا ''لحم الخنزیر'' اور انگریزی میں "Pork"۔ مسلم امہ میں صدیوں سے سئور کے گوشت سے ایک کراہت موجود تھی۔ غالب پکڑا گیا تو انگریز نے پوچھا تم مسلمان ہو؟ کہا آدھا' کہا کیسے؟ کہنے لگا شراب پیتا ہوں سور کا گوشت نہیں کھاتا''۔ سیاحت کے عالمی مرکز نے اس مسلمان شہر کا یہ تشخص بھی ختم کر دیا۔ سیاحت وہاں کونسی ہے نہ آبشار ہیں نہ پہاڑ اور نہ ہی تاریخی مقامات' البتہ ''نائٹ لائف'' کے نام آپ کو سیاحتی کتابچے ضرور میسر آجائیں گے۔ روس کے سائبیریا سے لے کر جاپان کے اوساکا اور بمبئی' کراچی' تہران' پیرس' بغداد' نیویارک' لندن' بنکاک' غرض ہر شہر سے آنے والی فلائٹوں میں آپ کو مخصوص خواتین نظر آئیں گی جو ایک ماہ کے سیاحتی ویزے پر آتی ہیں اور اس ایک ماہ کے بعد وہ واپس اپنے گھروں کو لوٹتی ہیں تو خوشحالی ان کے دروازوں پر دستک دے رہی ہوتی ہے۔ دنیا بھر کا میڈیا اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو اس ''نائٹ لائف'' کی داستانیں ملیں گی۔ یورپ کے اخبارات اس شہر کو مشرق کا ایمسٹرڈیم کہتے ہیں۔ اس سارے کاروبار اور رنگا رنگی کو چلانے اور ''ماحول'' بنانے کے لئے افرادی قوت چاہیے اور دنیا بھر سے لوگ وہاں اس کاروباری ماحول کا ایندھن بنتے ہیں جن میں سب سے زیادہ تعداد بھارتیوں کی ہے جو 26 لاکھ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مودی امارات کی بڑی مسجد دیکھنے گیا تو وہ جگہ جہاں صرف اللہ کے نام کو سربلند ہونا چاہیے تھا' وہاں مودی مودی کے نعرے لگائے گئے کہ وہاں ایک کثیر تعداد بھارتیوں کی جمع تھی۔

ذوالخلصہ کے بت خانے کا چکر تو میرے آقا ﷺ نے ایک علامت کے طور بیان کیا ہے۔ اس باب کی احادیث پڑھیں تو ایسا لگتا ہے ہم اس دور میں زندہ ہیں جو قیامت کے قریب معرکوں کا دور ہے۔ غزوہ ہند کی پیش گوئیوں کے بارے میں پڑھتا تھا کہ کیا بھارت دنیا میں اس قدر اہمیت اختیار کر جائے گا کہ اس سے جہاد امت مسلمہ کی بقا اور شرک کے خاتمے کے لئے ضروری ہو جائے گا۔ آپؐ کی بتائی گئی نشانیوں کی جانب غور کریں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ معرکہ ہمارے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ معرکوں کے میدان صرف دو ہیں۔ ایک شام اور دوسرا ہند۔ شام سیدنا امام مہدی کا ہیڈ کوارٹر اور حضرت عیسیٰؑ کے نزول کا مقام۔ دونوں لشکروں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے لیکن جہاد ہند کے بارے میں تو رسول اکرمؐ نے صحابہ سے حصہ لینے کا وعدہ لیا (مسند احمد) اس غزوہ کے وقت کا تعین کرتے ہوئے فرمایا' ایک قوم میری امت میں سے ہند پر حملہ کرے گی' اللہ اس کو فتح عطا فرمائے گا یہاں تک کہ وہ ہند کے بادشاہوں کو زنجیروں میں جکڑ کر لائیں گے۔ اللہ ان کے گناہوں کی مغفرت فرمائے گا۔ پھر وہ شام کی طرف لوٹیں گے تو حضرت عیسیٰ ابن مریم کو شام میں پائیں گے (الفتن)۔ معرکہ قریب ہو تو صف بندیاں ہو جاتی ہیں۔ صف بندیاں شروع ہیں دفاعی' تجارتی اور سیاحتی معاہدے جاری ہیں۔ ایران ہو یا دبئی' امریکہ ہو یا اسرائیل' مودی کے لئے چشم براہ۔ لیکن نصرت الٰہی کا اندازہ تو اسی وقت ہی ہوتا ہے جب آپ کمزور ہوں' تعداد میں کم ہوں اور وہ آپ کو فتح و کامیابی عطا کرے۔

سیکولرازم کا اصل چہرہ یہی ہے

جب کبھی بھارت میں مسلم کش فسادات بھڑکتے ہیں یا وہاں کوئی دوسری اقلیت تشدد کا شکار ہوتی ہے تو میرے ملک کے لکھنے والے اور میڈیا ایک فقرہ بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ "وہ دیکھو بھارت کا سیکولر چہرہ بے نقاب ہو گیا"۔ اس طرح کے فقرے بولنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سیکولرازم ایک ایسی اعلیٰ و ارفع انسانی صفت اور حکومتی اقدار ہے کہ اس کا حامل انسانی معاشرہ یا حکومتیں دنیا کی مہذب ترین حکومتیں اور معاشرے ہوتے ہیں اور وہاں ظلم و ستم نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہوتی۔ یوں تو سیکولرازم کا لفظ پہلی دفعہ 1876 میں برطانوی صحافی جارج ہولی اوک GeorgeHolyoake نے استعمال کرنا شروع کیا اور پھر یہ زبان زدِ عام ہو گیا۔ لیکن اگر ہم سیکولرازم کے متوالوں کی ذاتی گھڑی ہوئی تاریخ کو بھی مان لیں کہ انقلاب فرانس کے اردگرد پیدا ہونے والے ادیب جنہوں نے لوگوں کو یہ تصور دیا کہ معاشروں کو جمہوری اقدار پر منظم کر کے اقتدار عوام کے نمائندوں کو منتقل کرنا چاہیے اور دوسرا یہ کہ مذہب کا ریاست کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تو پھر بھی اس تصور کے پیش کیئے جانے اور نفاذ کی عمر دو سو سال سے زیادہ نہیں بنتی۔ سیکولرازم کا سب سے بڑا داعی ایچ جی ویلز تھا جو برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں تقریریں کرتا پھرتا کہ حکومتوں پر قابض ہو کر سیکولرازم کو بزور نافذ کر دینا چاہیے ورنہ مذہبی لوگ عوام کے ذریعے کبھی بھی برسرِ اقتدار آسکتے ہیں۔

سیکولرازم جن معاشروں میں نافذ ہوا اور جہاں جہاں ایسے حکمران منتخب ہوئے یا مسلط کیئے گئے جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ریاست کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں انہوں نے اس سیکولرازم کے نام پر انسانی خون اسقدر بہایا، ظلم و تشدد اتنا کیا اور رعایا کو بھوک اور افلاس کا شکار اس قدر رکھا اس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ صرف مسلمان ملکوں کے سیکولر حکمرانوں کی فہرست اٹھا لیں۔ ان کے کارنامے پڑھ کر آپ حیران و ششدر رہ جائیں گے۔ مصر سے شروع کرتے ہیں، جمال عبدالناصر جس کے دامن پر اخوان المسلمین کے ڈھائی لاکھ لوگوں کو قتل کرنے کا الزام ہے، جس کے جیل خانوں کے تشدد کی کہانیاں لرزا دینے والی ہیں۔ بڑے بڑے رہنماؤں کی پھانسیوں کی ایک قطار ہے جو ختم ہی نہیں ہوتی۔ سیکولرازم اس کے خون میں رچا ہوا تھا۔ اسرائیل سے جنگ شروع ہوئی تو قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہنے لگا "اے فرعون کے بیٹو! آج تمہارا مقابلہ موسیٰ کی نسل سے ہے"۔ مذہب کو ریاست سے دور رکھنے کا دعویٰ کرنے والا یہ سیکولر حکمران دنیا کے ظالم ترین حکمرانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے فلسفہ پر عمل کرنے والے انور السادات اور حسنی مبارک بھی اسی روش پر قائم رہے اور انسانوں کا خون بہاتے رہے۔ عراق میں احمد حسن البکر اور پھر صدام حسین بھی سیکولر حکمران تھے جو ریاست کے کاروبار میں مذہب کے داخلے کو حرام سمجھتے تھے۔ صرف کردوں پر ڈھائے جانے والے مظالم انہیں تاریخ کے بدترین اور ظالم حکمران ثابت کرنے کے لیئے کافی ہیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد سیکولر صدام حسین نے پہلی دفعہ آبادیوں پر کیمیائی ہتھیار تک استعمال کیئے۔ سیکولرازم کے پرزور نفاذ کے یہ حامی حکمران ہر اس آواز کو خاموش کر دیتے ہیں جس کے منہ سے یہ لفظ بھی نکلتا کہ مذہب بھی انسانی زندگی میں ایک نافذ العمل چیز ہے۔ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگوں کے قاتل۔ ایران میں شاہ رضا پہلوی کی سیکولر آمریت ساوک کے ظلم و ستم سے عبارت ہے۔ موجودہ ایران میں شاہ کی خفیہ ایجنسی کے ان مراکز کو عجائب گھر بنا دیا ہے جہاں ایسے لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا جو مذہب کو ریاست کا حصہ سمجھتے تھے، ان کے ناخن اکھاڑے جاتے، بجلی کے مسلسل جھٹکے دیئے جاتے، زخم ڈال کر ان پر نمک چھڑکا جاتا۔ سیکولر رضا شاہ پہلوی کے سیکولر اقتدار کے دوران لاکھوں لوگ قتل اور لاپتہ ہوئے۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لیئے ایک سینما گھر کو آگ لگا دی، چار سو سے زیادہ لوگ زندہ جل گئے اور الزام ان لوگوں پر لگا دیا جو مذہب کو ریاست کے کاروبار کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ انڈونیشیا میں سہارتو کی سیکولر آمریت قائم ہوئی تو یہ دنیا کی سب سے پر تشدد آمریت تھی جس میں چار لاکھ سے زیادہ انسان قتل کر دیئے گئے۔ لاطینی یا جنوبی امریکہ کے کسی بھی حکمران کے عہد حکومت کو اٹھا لیں آپ کو ظلم و ستم کی داستانیں ملیں گی۔ صرف چلی کے پنوشے کے مظالم اسقدر ہولناک ہیں کہ قلم لکھتے ہوئے خون آلود ہونے لگتا ہے۔ وہ تو ان سیکولر اقتدار کو جمہوریت کا ٹیکا لگا کر الیکشن بھی جیتا تھا۔ لیکن کیا جمہوریت لوگوں کا خون بہانے، ظلم کرنے یا قتل و غارت سے روک سکتی ہے۔ دنیا کا سب سے ظالم، قتل و غارت کا رسیا اور تشدد کا علمبردار شخص ایک جمہوری طور پر منتخب لیڈر بھی تھا اور اقتدار کے حساب سے سیکولر بھی۔ وہ شخص جرمنی کے عوام کے دلوں پر راج کرنے والا نازی حکمران ہٹلر تھا جو ہر اعتبار سے سیکولر تھا۔ کوئی اس دور کی دنیا کے لوگوں سے پوچھے کہ انہوں نے اس جمہوری طور پر منتخب سیکولر ہٹلر کے ظلم کی کیا قیمت ادا کی ہے۔ اس سیکولر صفت جمہوری طور پر منتخب شخص نے نسلی تعصب کی ایسی بنیاد ڈالی کہ کروڑوں لوگ لقمہء اجل بن گئے۔ کوئی یہودیوں سے جا کر پوچھے کہ انہوں نے سیکولر اور جمہوری ہٹلر کی جمہوریت اور سیکولرازم کی کیا قیمت ادا کی ہے۔ واشنگٹن میں ایک ہولو کاسٹ میوزیم ہے جس میں ہٹلر کے اس جمہوری اور سیکولر اقتدار کے دوران ہونے والے مظالم کے شواہد رکھے ہوئے ہیں۔

جمہوریت اور سیکولرازم ایک اور جگہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر گزشتہ سڑسٹھ سالوں سے چل رہے ہیں اور یہ ملک بھارت ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی یا راجیو گاندھی جمہوری طور پر منتخب حکمران نہیں تھے اور وہ سیکولر نہیں تھے تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ اس ملک کا آئین بھی سیکولر ہے جو مذہب کو ریاست سے کوسوں دور رکھتا ہے۔ دنیا کا یہ سب سے بڑا جمہوری اور سیکولر ملک دنیا کی سب سے بڑی جھونپڑ پٹی ہے جہاں غربت کی انتہا علاقائی نہیں بلکہ مذہبی بنیادوں پر ہے۔ اس عظیم سیکولر اور جمہوری ملک میں غربت کے خط سے سب سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی اکثریت مسلمانوں میں سے ہے اور اس کے بعد دوسرا نمبر دلتوں یعنی شودروں کا آتا ہے۔ یہ شودر کسی علاقے کی وجہ سے غریب نہیں کہ وہاں وسائل موجود نہیں ہیں بلکہ یہ اس لیئے غربت کا شکار ہیں کہ ہندو مذہب انہیں بدترین حالت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ کیا کشمیر میں مظالم کسی ڈکٹیٹر یا مذہبی رہنما نے روا رکھے اور ایک لاکھ لوگوں کو شہید کیا۔ یہ سب کے سب سیکولر اور جمہوری حکمران تھے۔ کوئی سکھوں سے جا کے پوچھے کہ انہوں نے اس جمہوریت اور سیکولرازم کا 1984 میں کیسا مزہ چکھا تھا جب ان کو دلی کے بازاروں میں گھسیٹا گیا، گلے میں ٹائر ڈال کر ان ٹائروں کو آگ لگا دی گئی۔ یہ سب حکومتی سرپرستی میں ہوا۔ وہ حکومت جو فخر کرتی ہے کہ ہمارے ہاں جمہوریت کا تسلسل بھی ہے اور سیکولرازم کا آئینی تصور بھی۔

اس سارے ظلم و ستم اور تشدد کے باوجود ہمارا میڈیا اور دانشور یہ تصور پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے سیکولرازم اور جمہوریت ہی نجات کے دو راستے ہیں۔ اسلام پر گفتگو کرنی ہو تو یہ قرآن و حدیث میں بیان کردہ اسلام کے اعلیٰ و ارفع اصولوں کا ذکر نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ تمہاری تاریخ جنگوں اور لڑائیوں سے بھری ہے، تمہارے حکمران ظالم تھے۔ لیکن وہ یہ منطق سیکولرازم پر لاگو نہیں کرتے۔ حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ جس قدر ظلم و بربریت سیکولر ڈکٹیٹروں اور سیکولر جمہوری حکمرانوں کے ادوار میں اس دنیا نے دیکھی، تاریخ میں اس سے زیادہ ظلم و ستم اور قتل و غارت کسی اور دور میں نہیں ہوا۔ جنگ عظیم اول اور دوم کے دوران ایسے حکمران دنیا پر حکومت کرتے تھے جو جمہوری طور پر منتخب بھی تھے اور سیکولر بھی۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی، امریکہ، بیلجیم، اٹلی، دیگر تمام ممالک سے مذہب کو ریاست سے الگ بھی کر دیا گیا تھا اور حکمران بھی جمہوری طور پر منتخب تھے۔ ان سیکولر جمہوری حکمرانوں نے جنگوں میں اتنے لوگ قتل کیئے جن کی تعداد پوری انسانی تاریخ میں قتل ہونے والے افراد سے زیادہ ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ سیکولرازم کا اصل چہرہ ہی یہ ہے۔ یہ انسان کی مروجہ اقدار اور روایت کے برعکس ایک ایسا تصور ہے جسے زبردستی نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جو افراد اپنی روایت اور اقدار کے تحفظ کے لیئے آواز بلند کرتے ہیں انہیں قتل کر دیا جاتا ہے یا ان پر تشدد سے سیکولرازم نافذ کیا جاتا ہے۔ وہ مصر، عراق یا انڈونیشیا کے مذہب سے لگاؤ رکھنے والے مسلمان ہوں، جرمنی کے یہودی یا بھارت کے مسلمان، سکھ اور عیسائی اور شودر سب سیکولرازم کے ظلم کا شکار ہوئے ہیں۔ سیکولرازم نے ہمیشہ لوگوں کا خون بہایا اور اس کو ایک خوبصورت تصور دیا کہ ہم ان لوگوں کو اس لیئے قتل کر رہے ہیں کہ یہ جمہوریت اور سیکولرازم کے دشمن ہیں، تخریب کار ہیں، دہشت گرد ہیں، گوریلے ہیں، ملک دشمن ہیں، غدار ہیں۔ یہی سیکولرازم ہے اور یہی اس کا بھیانک چہرہ ہے اور یہ دو سو سال سے دنیا پر حکمران ہے۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر

کس قدر دکھ اور کرب تھا ان کے لہجے میں، وہ اس مملکت خداداد پاکستان کے عوام اور اس جمہوری نظام کا المیہ بیان کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا "میں نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے کہ "اس ملک میں عام الیکشن میں محترمہ فاطمہ جناح، میں اور میرا بیٹا ولید اقبال کیوں کامیاب نہیں ہوتا' اس لیے اس ملک پر طاقتور اور بالادست اشرافیہ کا قبضہ ہے جو ہمیں کبھی کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔" یہ الفاظ تھے علامہ اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کے جو انہوں نے اپنے انتقال سے چند دن قبل میرے پروگرام "متبادل" میں ادا کیے۔ وہ بہت بیمار تھے، ان کے گھر میں اس وقت کسی وجہ سے پروگرام ریکارڈ نہیں ہو سکتا تھا لیکن وہ کمال مہربانی کرتے ہوئے اپنے بھانجے اقبال صلاح الدین کے قائم کردہ اس ادارے میں تشریف لائے جو اس نے فکر اقبال کے فروغ کے لیے قائم کیا ہے۔

علامہ اقبال کی دعاؤں، آرزوؤں اور تمناؤں کا محور جاوید اقبال۔ یوں تو جاوید اقبال نے اپنے والد کی آغوشِ تربیت میں تقریباً تیرہ سال گزارے ہوں گے لیکن علامہ کی ان سے محبت ان کے کلام میں جھلکتی نظر آتی ہے۔ ابن عربی کی فتوحات مکیہ، دانتے کی ڈیوائن کامیڈی دونوں عالم بالا کے روحانی سفر کی داستانیں ہیں۔ اقبال تیسرے شاعر ہیں جنہوں نے اپنے روحانی مرشد مولانا روم کی صحبت میں روحانی سفر کو منظوم کیا اور اس کا نام اپنے بیٹے کے نام پر جاوید نامہ رکھا۔ اقبال انگلستان گئے تو جاوید اقبال نے انہیں اپنی زندگی کا پہلا خط تحریر کیا۔ اس خط میں انہوں نے علامہ سے گراموفون لانے کی فرمائش کی۔ علامہ اقبال نے جواب میں ایک نظم تحریر کر کے بھیجی جس کا عنوان "جاوید کے نام" ہے اور اس کے ساتھ تحریر ہے "لندن میں اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط آنے پر"۔ نظم کا خطاب تو جاوید اقبال سے ہے لیکن یوں لگتا ہے اس کا مخاطب پوری امت مسلمہ کے نوجوان ہیں۔

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کا احسان
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

اقبال کا یہ فرزند اس قوم نہیں بلکہ اس امت کے درمیان اکیانوے برس رہنے کے بعد اسی لاہور کی مٹی کے سپرد کر دیا گیا جہاں اس کے عظیم والد بھی آسودۂ خاک ہیں اور جن کے مزار کی مٹی لے جا کر ترکی کے شہر قونیہ میں مولانا روم کے مزار کے پہلو میں ایک اور مزار بنایا گیا ہے جو اقبال کے نام سے معنون ہے۔ شرافت، نجابت اور علم جس شخص کو اپنے عظیم باپ سے ورثے میں ملا۔ یہ 1970ء کے الیکشن کا زمانہ تھا۔ میری عمر چودہ سال کی ہو گی جب گجرات شہر میں جگہ جگہ پوسٹر لگے ہوئے تھے کہ فرزند اقبال کونسل مسلم لیگ کے جلسے سے ہارس شوگراونڈ میں خطاب کریں گے۔ میرے گھر میں علامہ اقبال کی حیثیت ایک ولی کامل کی سی تھی جس کا خمیر عشق رسول سے گندھا ہوا ہو۔ میرے والد ان کے اشعار گنگناتے اور اکثر اوقات بے اختیار آنسو ان کی آنکھوں سے چھلک پڑتے۔ میری زندگی میں ادب سے پہلی آشنائی بھی اقبال ہی کی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا پہلا شعر دس سال کی عمر میں سکول میں یوم اقبال کی ایک تقریب میں اپنی تقریر کے لیے تحریر کیا تھا۔ اقبال میرا عشق تھا اور ہے۔ لیکن 1970ء کا عرصہ ایسا تھا جب مجھ پر الحاد غالب تھا اور کمیونزم کے جراثیم ذہن میں سرایت کر چکے تھے، لیکن اقبال کا عشق مسلسل اور پیہم رہا، یہی وجہ ہے کہ میں جاوید اقبال کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ ان دنوں جلسوں کی منادی تانگے کے اوپر لاؤڈ سپیکر لگا کر کی جاتی۔ اس فن کے ماہرین مائیک ہاتھ میں پکڑے شعر پڑھتے جلسے کی منادی کرتے تھے۔ میں ایسے ہی ایک تانگے پر سوار ہو گیا۔ اقبال کے اشعار کا جادو تھا، جاوید اقبال کو دیکھنے کی لگن تھی کہ میری اس منادی یا اناؤنسمنٹ کو اس قدر پذیرائی ملی کہ اگلے تین دن صبح تانگے کو میرے گھر بھیج دیا جاتا تا کہ مجھے لے آئے۔ ان تین دنوں کا کمال یہ تھا کہ ایک بہت بڑے پر ہجوم جلسے میں مجھے سٹیج پر جاوید اقبال کے ساتھ کھڑے ہونے کی جگہ مل گئی۔ میں نے وفور شوق سے اس سرخ و سفید چہرے والے شخص سے ہاتھ ملایا جس کی زماہٹ آج تک مجھے یاد ہے۔ اقبال کے عشق میں گندھے ہوئے چودہ سالہ بچے کو کیا علم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ یہی فرزند اقبال ایک ٹیلی ویژن پروگرام میں میرے ساتھ مدعو تھے جو علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری پر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کس قدر محبت اور فراخ دلی سے کہنے لگے، "اقبال کی شاعری پر بات کرنے کے لیے تو اوریا کافی تھا، مجھے ویسے ہی زحمت دی آپ لوگوں نے"۔ یوں تو یہ فقرہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ ایک بڑے دانشور اور صاحب علم اور ایک عظیم آدمی کے منہ سے ادا ہوا لیکن مجھے اپنا اندازہ ہے کہ ان کے سامنے میرا علم ایک مبتدی اور سیکھنے والے سے زیادہ نہ تھا۔ میں گجرات میں تھا تو اکیس اپریل کو ہر سال لاہور میں ہونے والے مجلس اقبال کے سالانہ جلسے کی روداد اخباروں میں پڑھتا اور ایک شوق و تجسس مجھے گھیرے رہتا کہ کب میں اس جلسے کو دیکھ سکوں گا اور اس محفل کا حصہ بن سکوں گا جس کی بنیاد خود علامہ اقبال نے رکھی۔ میری خوش بختی کہ مجھے پہلی دفعہ جس جلسے میں شرکت کا موقع ملا اس کی صدارت جاوید اقبال کر رہے تھے اور میری پہلی شرکت اقبال کے ایک ہدی خوان کی حیثیت سے تھی۔ میری تقریر کے بعد جاوید اقبال کا وہ فقرہ بھی آج تک یاد ہے۔ "اس قدر جوش" آپ نے تو گرما دیا۔ میں نے زندگی میں کسی شخص کو اتنا وسیع القلب نہیں دیکھا جو کھل کر تعریف کرے اور سرعام اپنی غلطی کا اعتراف کرے۔ انہوں نے عدلیہ پر ایک کتاب لکھی اور اس میں عدالتی نظام کی خامیوں اور ججوں کی مجبوریوں کا ذکر کیا۔ آپ حیران ہوں گے کہ انہوں نے اس میں اپنے کیے گئے فیصلوں پر بھی تنقید کی اور انصاف کی راہ میں رکاوٹوں کا اپنے فیصلوں کے حوالے سے بتایا۔ ان کی سوانح حیات "اپنا گریباں چاک" میں انہوں نے اپنی زندگی کے جن گوشوں سے پردہ اٹھایا ہے ہمارے معاشرے میں ایسی جرأت کی مثال نہیں ملتی۔ جب انہوں نے اپنے والد کی سوانح عمری "زندہ رود" لکھی تو بہت سے محبان اقبال کا یہ گلہ تھا کہ انہیں اپنے والد کے بارے میں اس قدر سچ نہیں لکھنا چاہیے تھا کہ وہ بھی عام لوگوں کی طرح ایک والد، ایک خاوند اور ایک دوست نظر آئیں۔ لیکن شاید جاوید اقبال کی تربیت کا خاصہ تھا کہ انہیں تو ان کے والد نے یہی بتایا تھا کہ معصوم اور غلطی سے مبرا صرف اور صرف ایک ذات ہے جو سید الانبیا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہے۔ ٹیلی ویژن میں ہم نے ایک پروگرام کا آغاز کیا جس میں علامہ اقبال کی حکمت کے موضوعات پر گفتگو کرنا تھا۔ اس پروگرام کی میزبانی میرے ذمہ تھی اور اس کو رونق بخشنے والی دو عظیم شخصیات تھیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اور ڈاکٹر اسرار احمد، پہلا پروگرام "جدا ہو دیں سیاست سے" کے عنوان سے نشر ہوا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد ڈاکٹر اسرار احمد انتقال کر گئے اور یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اس پروگرام کے آغاز میں تعارف کرواتے ہوئے میں نے کہا آج میں علامہ اقبال کے جسمانی بیٹے جاوید اقبال اور روحانی بیٹے ڈاکٹر اسرار احمد کے ہمراہ حاضر ہوں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اس فقرے سے اس قدر خوش ہوئے کہ کہنے لگے ایسا جو آپ نے کہا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ وہ زمانہ جب بڑے لوگوں کی میراث کے وارث ان کی قبروں تک کو بیچ کھاتے ہوں، جاوید اقبال جیسے حوصلے والے اور وسیع القلب انسان کو آپ کسی اور ہی دنیا کا فرد سمجھیں گے۔ وہ یقیناً کسی اور ہی دنیا کے فرد تھے۔ اس قدر عجز، انکساری اور فقر یقیناً انہیں صحبت اقبال نے دیا اور یہ ان کے خون میں گردش کر رہا تھا۔ نہ چہرے پر ملال، نہ زبان پر غصہ، نہ گفتگو میں تلخی، ایسا چہرہ جو سوچ میں ڈوبا ہوا لگتا، مسکراتے تو آنکھیں بند ہو جاتیں اور ہنسی پورے چہرے پر پھیل جاتی۔ اقبال کی میراث کے تو وارث تھے ہی، ان کا ذاتی علم اور اس میں ان کا مقام بھی بلا کا تھا۔ ان کا یہ شکوہ بجا ہے کہ انہیں فرزند اقبال کی حیثیت سے ہی کیوں دیکھا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے اس حیثیت سے کبھی انکار بھی نہیں کیا۔ اقبال کے خطبات پر جس قدر علمی کام ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب "خطبات اقبال" تسہیل و تفہیم میں کیا ہے اقبال پر لکھنے والوں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا۔ وہ چیف جسٹس بھی رہے اور ایوان بالا کے سینیٹر بھی' جو براہ راست ووٹوں سے منتخب نہیں ہوتے۔ براہ راست وہ 1970ء کے الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے۔ یہ لاہور کی نشست تھی۔ ان کے مقابلے میں ذوالفقار علی بھٹو نے الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا۔ یہ الیکشن اس ملک کی تاریخ کا حیران کن الیکشن تھا۔ اہل نظر کہتے ہیں اس الیکشن نے اس قوم کے لیے سزا و جزا کے پیمانے مقرر کر دیے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی گرو جنہیں وہ ڈیڈی کہہ کر پکارتے تھے، ایوب خان، انہوں نے قائداعظم کی بہن محترمہ فاطمہ جناح کو شکست دی اور ان کے کنونشن مسلم لیگ کے سابقہ جنرل سیکرٹری ذوالفقار علی بھٹو نے فرزند اقبال کو شکست دے دی۔ جمہوریت، الیکشن اور اس قوم کی "مداح سرائی" میں اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس قوم نے قائداعظم اور علامہ اقبال دونوں کا قرض خوب اتار دیا۔ عالم ارواح میں اقبال نے یقیناً جاوید اقبال کا استقبال کیا ہو گا اور سرزمین لاہور کے باسیوں کا شکوہ بھی۔ وہ قوم جس کی تڑپ میں اقبال کی راتیں آنسوؤں کے چراغ جلاتی رہیں۔ اس نے ان کے فرزند کو اعتماد کے ایک ووٹ کے بھی قابل نہ سمجھا۔

فضائے بدر پیدا کر

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جو اس کی جانب ہدایت کے لیے رجوع کرتا ہے، اپنے گناہوں، گزشتہ خیالات اور نظریات پر نادم ہوتا ہے تو وہ اسے نور ہدایت سے بھی سرفراز کرتا ہے اور اس کی عزت و توقیر کی حفاظت بھی۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق بھی ان خوش نصیب لوگوں میں سے ایک تھے جو اپنی ابتدائی زندگی میں مادہ پرست افکار اور جدید علت و معلول پر مبنی علوم کی چاہ میں اسلام کی بنیادی اساس سے ہٹ گئے اور انہوں نے اپنی کتاب "دو اسلام" تحریر کی، جس کی وکالت میرے دوست کالم نگار نے بار بار کی۔ موصوف کا دعویٰ تھا، بلکہ چیلنج تھا کہ برق صاحب آخری وقت تک اپنے انہی خیالات پر قائم رہے۔ میرا اللہ جب اپنے ہدایت یافتہ لوگوں کی عزت کی حفاظت کرنا چاہتا ہے تو ایسی پیش بندیاں ان لوگوں سے کروا دیتا ہے کہ بعد میں آنے والے دانشوروں کا منہ بند ہو جائے۔

برق صاحب کی اس کتاب کے جواب میں مولانا مسعود احمد بی ایس سی نے ایک کتاب "تفہیم الاسلام" لکھی جو 1967ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر غلام جیلانی برق اور مولانا مسعود احمد کے درمیان خط و کتابت کا آغاز ہوا۔ یہ خطوط ان کی کتاب "تفہیم الاسلام" کے دوسرے ایڈیشن کے صفحات 575 سے 579 تک میں دیئے گئے (یہ خطوط ڈاکٹر برق صاحب کی تحریر کے عکس کے طور پر شائع کیے گئے ہیں)۔ یہ دوسرا ایڈیشن 1972ء میں شائع ہوا، اس وقت برق صاحب حیات تھے۔ برق صاحب کے تمام خطوط کو عبدالعزیز ساحر صاحب نے مرتب کیا ہے اس کتاب کا عنوان ہے "ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے خطوط" یہ کتاب حسنین پبلی کیشنز لاہور نے چھاپی ہے اور اس کے صفحات 135، 136 اور 137 پر یہ خطوط موجود ہیں۔ میں خط یہاں نقل کر رہا ہوں۔ ان خطوط میں برق صاحب کی "دو اسلام" کے بارے میں ندامت کا اظہار بھی ہے اور اس کی اشاعت پر پابندی کا اعلان بھی۔

پہلا خط: کیمبل پور۔ 16 مئی 1971ء۔ آقائے محترم۔ السلام علیکم و رحمتہ اللہ! آج ہی آپ کی گراں قدر تصنیف تفہیم اسلام" ملی اور ملتے ہی چند صفحات پڑھ ڈالے۔ دو اسلام کے بڑے بڑے عیوب تین ہیں۔ اول۔ اس کے پہلے ایڈیشن میں متعدد علمی اغلاط ہیں (مثلاً احادیث کا ترجمہ وغیرہ) جنہیں بڑی حد تک دوسرے ایڈیشن میں نکال دیا گیا، لیکن اب بھی باقی ہیں۔ دوم: میرا یہ موقف کہ احادیث کی تدوین و تسوید اڑھائی سو برس بعد ہوئی تھی سرو پا غلط ہے۔ یہ غلطی دوسرے ایڈیشن میں بھی موجود ہے۔ میں نے تو اس کی تلافی کر دی ہے کہ "تاریخ تدوین حدیث" لکھ کر ثابت کیا ہے کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہی تقریباً چالیس ہزار احادیث محفوظ ہو چکی تھیں۔ لیکن یہ کتاب شاید ہی کبھی چھپے۔ آج سے تین برس پہلے لاہور کا ایک بھوکا اور بے سرو سامان طابع و ناشر یہ کتاب لے گیا اور میرے انتہائی اصرار کے باوجود نہ تو تاحال کتابت کروائی اور نہ مسودہ واپس کیا۔ تیسرا عیب یہ ہے کہ دو اسلام کی زبان غیر سنجیدہ، غیر علمی، اور سخت جانبدارانہ ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ میں آپ کی زبان، اندازِ تحریر، اسلوب بیان اور متانت سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ پوری کتاب پڑھنے کے بعد میں شاید پھر آپ کو خط لکھوں، سر دست میں اس تخلیق پر آپ کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ والسلام۔ مخلص۔
برق

دوسرا خط: کیمبل پور 26 نومبر 1971ء، السلام و علیکم و رحمتہ اللہ، یاد آوری اور تہنیت عید کا شکریہ۔ آپ کی قابلِ قدر کتاب "تفہیم اسلام" کے متعلق میں کچھ عرصہ پہلے اپنے تاثرات کا اظہار کر چکا ہوں۔ اصل چیز وہ جذبہ ہے جو کسی کتاب کی تخلیق کا باعث بنتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کا مقصد ان اثرات کو مٹانا ہے جو میری کتاب سے پیدا ہوئے۔ اس للّٰہیت پر پہلے بھی مبارک باد پیش کر چکا ہوں اور پھر پیش کرتا ہوں۔ میری آزردگی کا نہ تو سوال پیدا کرتا ہے اور نہ وہ قابلِ التفات ہے۔ والسلام۔ مخلص۔ برق۔

تیسرا خط: کیمبل پور۔ 14 نومبر 1972ء۔ قابلِ صد احترام۔ السلام و علیکم یاد آوری کا شکریہ: میں نے ناشرین "دو اسلام" کو تاکید کی ہے کہ وہ اس کا آئندہ کوئی ایڈیشن شائع نہ کریں۔ تاریخ تدوین حدیث گم ہو گئی تھی۔ ساری نہیں بلکہ تینتیس اوراق۔ وہ مجھے دوبارہ لکھنے پڑے۔ ماخذ کی دوبارہ تلاش کی اور مسودے کو مکمل کر کے پھر ارسال کیا۔ اب اس کی کتابت ہو رہی ہے۔ دعا فرمائیں اس کی اشاعت میں آئندہ کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ والسلام۔
مخلص۔ برق

غلام جیلانی برق صاحب کے ان خطوط میں "دو اسلام" کے لکھنے پر ندامت بھی ہے اور اللہ سے معافی کی طلب بھی اور اس کتاب کو نہ چھاپنے کا اعلان بھی۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اپنی کتاب دو اسلام کے ردّ میں تاریخ تدوین حدیث لکھی اور اس کے دیباچے میں برملا اعتراف کیا "جو لوگ اس موضوع پر میری پہلی تحریروں سے آشنا ہیں، وہ یقیناً یہ اعتراض کریں گے کہ میرا موجودہ موقف پہلے موقف سے متصادم ہو رہا ہے۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ انسانی فکر ایک متحرک چیز ہے جو کسی ایک مقام پر مستقل قیام نہیں کرتی اور سدا خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہے۔ انسان صداقت تک پہنچتے پہنچتے سو بار گرتا ہے۔ میں بھی بار بار گرا اور ہر بار لطف ایزدی نے میری دستگیری کی، کہ اٹھا کر پھر ان راہوں پر ڈال دیا جو صحیح سمت جا رہی تھیں۔ یکم نومبر 1969ء۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کو تو اللہ نے ہدایت سے سرفراز کر دیا۔ انہوں نے اپنی غلطیوں کا ازالہ بھی کر دیا۔ لیکن دنیا کی طلب میں سرگرداں اور بنیادی اخلاقیات سے عاری پبلشرز آج بھی ان کی وہ کتاب "دو اسلام" چھاپے چلے جا رہے ہیں جس پر وہ انہیں خود منع کر گئے تھے۔ وہ لوگ جو گمراہی اور ظلمت کے شیدائی ہوتے ہیں وہ آج بھی برق صاحب کی ان کتابوں سے اپنے لیے جواز تلاش کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے زمانہ جاہلیت میں لکھی تھیں۔ لیکن میں کیا کروں کہ میں اپنے اس کالم نگار دوست سے اُس وقت سے محبت کرتا چلا آیا ہوں جب وہ اسلام کی سچی تصویر اپنے کالموں میں پیش کرتا تھا۔ اس کے قلم کی کاٹ میرے لیے جذبے کا باعث تھی۔ لیکن میرا دکھ اور المیہ یہ ہے کہ میرا یہ دوست ان دنیا پرست لوگوں سے متاثر ہو گیا ہے جو اگر رسول ﷺ کی زمانے میں بھی ہوتے تو اعتراض کرتے کہ دیکھو دو گھوڑے، چھ زرہیں اور آٹھ شمشیریں لے کر آپ کافروں کے ایک ہزار کے لشکر کے سامنے میدانِ بدر میں جا رہے ہو، وہ کیل کانٹے سے لیس ہیں۔ یہ تو نعوذ باللہ سراسر خودکشی ہے۔ وہ اگر عمر ابن خطاب کے زمانے میں ہوتے تو کہتے نہ تمہارے اسلحہ ہے، نہ افرادی قوت، گھروں میں تمہارے فاقے پڑے ہوئے ہیں اور تم ایران اور روم پر حملے کرنے جا رہے ہو، دیوانے تو نہیں ہو گئے، پہلے ترقی کر لو کم از کم اپنے زمانے کی سائنس اور ٹیکنالوجی ہی حاصل کر لو۔ تم تو ہر لحاظ سے پسماندہ ہو اور شکست تمہارا مقدر ہو گی۔ میرے اس کالم نگار دوست کو خوب علم ہے کہ جب بھی مسلمانوں پر زوال آیا، ان پر دنیا کی قومیں بھیڑیوں کی طرح چڑھ دوڑیں اس وقت وہ دنیا کی امیر ترین اور مہذب ترین قوموں میں شمار ہوتے تھے۔ بغداد دولت، تہذیب، علم، سائنس اور ٹیکنالوجی کا گہوارہ تھا جب ہلاکو نے اسے تاراج کیا۔ ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا، جب انگریز اس پر قابض ہوئے۔ سپین پورے یورپ میں تہذیب کا سرچشمہ تھا جب ازابیلا اور فرڈیننڈ نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

وہ کون سی قوت تھی جو فاقہ کش بدر کے صحابہ اور عمر ابن خطاب کے مفلوک الحال سپاہیوں کو فتح نصیب کرتی تھی۔ وہ اللہ پر توکل اور اس کی نصرت پر بھروسہ تھا۔ جنید بغدادی سے کسی نے سوال کیا۔ تصوف کیا ہے۔ فرمایا توکل ہی تصوف ہے۔ جب بغداد، سپین اور ہندوستان برباد ہوئے تو مسلمانوں سے یہ توکل ختم ہو چکا تھا۔ ان کا بھروسہ اسبابِ دنیا پر تھا۔ ایسی قوم کو ہزار نیک لوگوں کی دعائیں بھی تباہی سے نہیں بچا سکتیں۔ اللہ اسی قوم کا بازو پکڑتا ہے جو صرف اور صرف اس پر توکل کرتی ہے۔ ہاں اور اسے بھروسہ ہوتا ہے تو مومن کی پامردی پر اور پامردی اسباب سے مختلف چیز ہے۔ اقبال نے کہا تھا۔

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

کاش میرا دوست، صداقت کی اس منزل کی جانب لوٹ جائے جس پر وہ پہلے کھڑا تھا۔ اللہ اس کی نصرت کرے اور اسے یقین آ جائے کہ۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

فضائے بدر اسباب کی محتاج نہیں ہوتی۔ اسباب تو تھوڑی سی متاع ہوتی ہے جو اللہ کے حضور لے جا کر عرض کیا جاتا ہے کہ اے اللہ ہم کمزور ہیں جو تھا جمع کر لیا اور یقین یہ ہے کہ صرف اور صرف تو ہی فتح دے سکتا ہے۔

نوٹ: میں نے غلام جیلانی برق کے خط کا عکس اپنے فیس بک پیج www.facebook.com/oryamj پر ڈال دیا ہے۔

گوادر، چاہ بہار، بلوچستان، عراق، کراچی، بیروت

کاروباری اور معاشی مسابقت موجودہ دور کی سب سے تلخ حقیقت ہے۔ گزشتہ چند صدیوں سے جس طرح انسان نے دوسرے انسان کے منہ سے نوالہ چھیننے کی کوشش کی ہے اس کی مثال انسانی تاریخ میں اس قدر کریہہ اور ظالمانہ نہیں ملتی۔ بادشاہوں کی افواج آتی تھیں' شہر لوٹ کر چلی جاتی تھیں' لوگ پھر اپنے کاروبار زندگی میں مصروف ہو جاتے تھے۔ کئی بادشاہ علاقے فتح کرتے تھے' انہیں اپنی قلمرو میں شامل کرتے تھے اور پھر وہاں کے لوگوں کو بہتر انصاف اور اچھی زندگی کی ضمانت دیتے' اس لیے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو رعایا ان کے خلاف ہو جاتی۔ یہ رعایا جلوس اور ہڑتالیں تو نہ کرتی مگر جب بھی کوئی دوسرا بادشاہ ان کے ملک پر حملہ آور ہوتا تو وہ اس کا ساتھ دیتی اور یوں ایک بدترین غیر ملکی فاتح کی جگہ نسبتاً بہتر غیر ملکی فاتح حکومت کرنے لگتا۔ لیکن آج کے دور کی معیشت اور کاروباری مسابقت کی جنگ نے اتنے ملک برباد کیے ہیں' اتنے شہر اجاڑے ہیں' اسقدر قتل و غارت کا بازار گرم کیا ہے کہ کروڑوں انسان لقمہ اجل بن چکے ہیں۔ ایک ملک یا علاقے نے خود کو ترقی دینا ہو' اسے معاشی طور پر مستحکم کرنا مقصود ہو تو اس کے مقابلے پر آنے والے ملک' شہر یا علاقے کو بدترین خانہ جنگی کا شکار کیا جاتا ہے' اسے قتل و غارت کے طوفان میں غرق کیا جاتا ہے' اس پر عالمی دباؤ کے تحت ایک جنگ مسلط کی جاتی ہے اور کبھی کبھی اس پر حملہ کر کے' اس کے وسائل کو قابو میں لے کر اسے مستقل لوٹا جاتا ہے۔ یہ ہے موجودہ صدی کا معاشی' اقتصادی اور کاروباری میدان کا ''عالمی اخلاقی اصول''۔

اسی ''عالمی اخلاقی اصول'' کے تحت پاکستان اور چین کے معاشی راہداری منصوبے کی مخالفت میں علاقائی گدھ اکٹھا ہونا شروع ہو گئے ہیں تاکہ اس منصوبے کے پرندے کو پرواز سے پہلے ہی گلا گھونٹ کر مار دیا جائے۔ پاک چین راہداری کے خلاف ہلاکت انگیز منصوبے کا آغاز 2002ء میں ہی کر دیا گیا تھا' جب پاکستان نے گوادر کی بندرگاہ پر چین کی مدد سے کام شروع کیا تھا۔ اس پورے خطے میں بھارت کا سب سے مستحکم دوست ایران ہے۔ یہ دوستی افغانستان میں بھارتی اثر و نفوذ کی ایرانی پالیسی سے جڑی ہوئی ہے۔ جب بھی افغانستان میں پاکستان کے لیے نرم گوشہ رکھنے والی حکومت آئی' بھارت نے ایران کے ساتھ مل کر اسے غیر مستحکم کرنے کی کوشش کی اور اس کے مخالفین کو اسلحہ' ٹریننگ' یہاں تک کہ افرادی قوت تک فراہم کی۔ افغانستان میں پاکستان مخالف حکومت کا قیام بھارت اور ایران کا مشترکہ ہدف ہے۔ گوادر میں چین نے بندرگاہ کا کام شروع کیا تو بھارت نے گوادر سے صرف بہتر کلو میٹر کے فاصلے پر چاہ بہار کے ایرانی شہر میں ایک گہرے پانیوں کی بندرگاہ پر کام شروع کر دیا۔ ایران کی یہ پہلی گہرے پانیوں کی بندرگاہ بنائی جا رہی تھی۔ اس سے پہلے ایران کے پاس بندر عباس کی ایک بندرگاہ تھی جو صرف دس ہزار ٹن کارگو کی اہلیت رکھتی تھی جبکہ زیادہ تر جہاز 25 ہزار ٹن کارگو والے ہوتے ہیں۔ اس لیے زیادہ تر ایرانی جہاز دبئی میں مال اتارتے پھر چھوٹے جہازوں میں ایران لے کر آتے۔ بندر عباس ویسے ہی ہرمز کی تنگ پٹی پر واقع ہے اور امریکی جنگی بیڑے بھی وہاں گھومتے رہتے ہیں' اس لئے ایران کو بھارت نے مدد فراہم کی تاکہ وہاں چاہ بہار بندرگاہ بنے اور گوادر کا توڑ کیا جا سکے۔ کچھ عرصہ امریکی پابندیوں کی وجہ سے بھارت نے کام روکے رکھا۔ لیکن جیسے ہی 2012ء میں گوادر پورٹ کا انتظام سنگاپور سے لے کر چین کو دیا گیا، بھارت نے امریکہ کی پابندیوں کی پروا کیے بغیر چاہ بہار بندرگاہ پر کام دوبارہ شروع کر دیا۔ یہ منصوبہ ایران کے راستے افغانستان اور وسطی ایشیا کی ریاستوں کو ملانے کا ہے۔ اس کیلئے بھارت نے کثیر لاگت سے افغانستان میں ولآرم شہر سے ایرانی سرحدی شہر زرنج تک موٹروے بنا دی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چاہ بہار سے نو سو کلو میٹر ریلوے لائن بچھائی جا رہی ہے جو بامیان کے افغان صوبے تک جائے گی جہاں ہزارہ قبائل آباد ہیں اور جو ہمیشہ ایران کے اتحادی رہے ہیں۔ وہاں کی ''آئرن اور'' ''IRONORE'' کو بھارت کی سٹیل ملز تک پہنچایا جائے گا۔

پاکستان اور چین کے درمیان موجودہ معاہدے کے بعد اس مسابقت میں بہت تیزی آئی ہے۔ بھارتی کابینہ نے چاہ بہار بندرگاہ کے لئے 85.12 ملین ڈالر منظور کیے ہیں جس سے اس کے انفراسٹرکچر کو بہتر بنایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ بھارت ہر سال 22 ملین ڈالر اس بندرگاہ کے انتظام پر خرچ کرے گا۔ سات مئی 2015ء کو ایرانی وزیر ٹرانسپورٹ عباس احمد اخوندی اور بھارتی وزیر جہاز رانی و ٹرانسپورٹ نے ایک معاہدے پر دستخط کیے ہیں جس کے تحت بھارت دس سال کے لیے یہ بندرگاہ استعمال کرے گا اور دس سال بعد اس پر کی گئی تمام تعمیرات اور مشینری ایرانی ملکیت تصور ہو گی۔ بھارت وہاں ایک کثیر المقاصد کارگو ٹرمینل بنا رہا ہے اور ساتھ ساتھ عارضی مال رکھنے کی بہت بڑی گودی بھی۔ اس بھارت ایران معاہدے کا سرپرست امریکہ ہے جو 24 نومبر کو ایران کے چھ ممالک کے ساتھ ایٹمی توانائی معاہدے کے بعد ایران کو اس خطے میں اپنا چوکیدار سمجھنے لگا ہے۔ اس بات کا اندازہ اس سے لگائیے کہ نومبر سے اب تک ایران سے جو تجارتی پابندیاں اٹھی ہیں تو صرف چھ ماہ میں ایران نے سات ارب ڈالر کی تجارت کی ہے۔ امریکہ نے افغانستان میں قائم اپنی ٹوڈی حکومت کو بھی اس معاہدے کا حصہ بننے کو کہا۔ افغانستان نے پہلے بھارت سے بامیان میں حاجی گاک کے لوہے کے ذخائر کا معاہدہ کیا اور اب ایران میں افغانستان کے سفیر شائدہ محمد ابدالی نے ریلوے لائن اور ایران سے تین ارب ڈالر کی تجارت کے معاہدات مکمل کر لیے ہیں جن پر چند روز میں دستخط ہو جائیں گے۔

چار ممالک کا میڈیا اس بھارت' ایران اور افغانستان معاشی راہداری کے فوائد پر رطب اللسان ہے۔ اسرائیل کے اخبار یروشلم پوسٹ میں شلم کالج کے پروفیسر اور عبرانی (Hebrew) یونیورسٹی کے فیلوز مستقل مضامین لکھ رہے ہیں کہ اس منصوبے سے ایران عالمی تجارتی برادری کا حصہ بنے گا اور دنیا کیلئے کم خطرناک ہو جائے گا۔ اس کے بعد مغربی میڈیا' اور پھر بھارتی اور ایرانی میڈیا۔ آپ ان کے ٹیلی ویژن کھول لیں' ان کے اخبارات اٹھا لیں' ویب سائٹس پر چلے جائیں آپ کو ایک ہی بحث ملے گی کہ گوادر کی بندرگاہ اور پاک چین معاشی راہداری سے پہلے چاہ بہار افغانستان راہداری پر تجارت شروع کر دی جائے تو پھر چین اور پاکستان کا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔

یوں تو ایک سیدھا سادا کاروباری عمل لگتا ہے اور اسے ایسا ہی بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن کاروبار' معیشت اور سرمائے کی ہوس نے موجودہ دور میں جو بھیانک جرائم کئے ہیں ان کی ایک جھلک پاکستان کی سرزمین پر نظر آ رہی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے دبئی میں امریکی' یورپی اور اسرائیلی سرمایہ کاری شروع ہوئی تو سب نے یہ طے کیا کہ اگر بیروت زندہ سلامت اور ہنستا بستا رہا تو دبئی اس کے سامنے نہیں چل سکے گا۔ پہلے حزب اللہ اور اسرائیل کی جنگ شروع کروائی گئی۔ حزب اللہ کے حسن نصر اللہ تو بیروت میں جنگ کے دوران لاکھوں لوگوں کے ہجوم سے خطاب کرتے رہے لیکن اسرائیلی بم عام شہریوں' عمارتوں' پلوں اور سڑکوں پر برستے رہے اور بیروت ملبے کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ اس کے بعد پورے لبنان کو شیعہ سنی لڑائی میں اسقدر الجھایا گیا کہ وہ آج تک امن کو ترس رہا ہے۔ یہی تجربہ عراق میں دہرایا گیا تاکہ وہ ایرانی فوجی طاقت اور معاشی قوت کے مقابلے میں ابھر نہ سکے۔ افغانستان میں امن کی راہ کو مسدود کرنے کے لئے امت مسلمہ کے اسی اختلاف کو ابھارا گیا۔ پچانوے فیصد افغانستان پر طالبان کی حکومت قائم ہوئی' پرامن بھی تھی اور اسے پاکستان نے تسلیم بھی کر لیا تھا لیکن ایک معمولی سی اقلیت کو اسلحہ' سرمایہ یہاں تک کہ افرادی قوت دے کر ان کے خلاف کھڑا کیا گیا۔ آج پاکستان اس کا تختہ مشق ہے۔ بھارت اور امریکہ کے کاسہ لیس صرف ایک ہی مقصد لے کر اٹھے ہیں کہ اگر چاہ بہار معاشی راہداری نے پھلنا پھولنا ہے تو پاکستان کو پرامن نہیں رہنے دینا۔ پاکستان کے دشمن یہاں صرف بدامنی چاہتے ہیں' سب بے چینی اور قتل و غارت کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ پاکستان میں بہتے خون میں کسی ایرانی کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہو گی کہ ان کے ہم مسلک کا خون بہہ رہا ہے' کسی بھارتی کو اس بات پر خوشی نہیں ہو گی اگر پاکستان میں شیعہ سنی آپس میں متحد ہو جائیں۔

پاکستان میں بسنے والے شیعہ اور سنی دونوں کو پاکستان سے باہر بسنے والے ہم مسلک حکومتوں کے پرچم دفن کرنا ہوں گے۔ جو اس ملک کی سرزمین پر بیٹھ کر صرف مسلک کی بنیاد پر کسی دوسرے ملک کی خیر خواہی اور سلامتی کی بات کرتا ہے وہ اس ملک میں اپنی ہی قبر کھود رہا ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ ملک عدم استحکام کا شکار ہوا تو باچا خان کو بھارت تحفہ تو دے سکتا ہے' اس کے پرچم برداروں کو پناہ نہیں دے گا' علماء کو دیوبند اور بریلی میں تقریر کے لئے تو بلا لے گا مگر اپنی سرزمین پر آباد نہیں ہونے دے گا۔ اس طرح ایران بھی مشہد کی زیارت کے لئے راستہ کھولے رکھے گا مگر کسی پاکستانی کو ایرانی قبرستان میں دفن ہونے کی اجازت تک نہ دے گا کہ اس نے تو عراق کی جنگ میں مارے جانے والے پاکستانیوں کو بھی خارجی قبرستان میں دفنایا تھا۔ اس سے پہلے کہ کراچی بیروت' بلوچستان لبنان اور پاکستان کو عراق بنانے کا خواب دیکھنے والے کامیابی کی طرف بڑھیں' ہمیں اس کاروباری مسابقت کے عفریت کو روکنا ہو گا۔

گل صاحب

ان سے آخری گفتگو چند دن قبل ہوئی۔ سپریم کورٹ کے فیصلے پر بہت ہی پریشان تھے۔وہ جنھیں اللہ نے بصیرت عطا کی ہے وہ اس فیصلے کے دوررس اثرات سے آگاہ ہیں۔انھیں اندازہ ہے کہ جسٹس منیر کی 1954 کی رپورٹ کے بعد یہ دوسری دفعہ ہے کہ برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کی قربانی سے جنم لینے والی اس مملکت کے بنیادی تصور کو ایک آئینی ترمیم کی ٹھوکر پر لاکر رکھ دیا گیا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی سے لے کر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تک سینکڑوں علماء جو یہ تصور کیے بیٹھے تھے کہ آئین پاکستان کی مقدس کتاب میں قرارداد مقاصد تحریر کرنے سے یہ ملک مستقل طور پر اللہ کی بادشاہت قبول کرلے گا۔ان کی زندگیوں میں ہی اس جمہوری نظام نے اپنی شعبدہ بازیاں دکھانا شروع کردی تھیں۔ حیرت ہے جس نظام کا تصور ہی عوام کی بادشاہی پر رکھا گیا ہو، وہ اللہ کی بادشاہی سے ٹکرائے گا نہیں۔ عوام کی بادشاہی تو ایک ایسا فریب ہے جس میں دنیا کے ہر جمہوری ملک کے عوام کو مبتلا رکھا گیا ہے۔کارپوریٹ سرمائے سے جنم لینے والی سیاسی پارٹیاں اور اسی سرمائے سے پیدا ہونے والی میڈیا کی چکا چوند کے درمیان پندرہ بیس روز میلے میں ڈالے جانے ووٹوں کی حد تک عوام کو یہ خوش فہمی ہوتی ہے کہ ان کی رائے سے یہ عوام کی بادشاہت قائم ہوتی ہے۔اس کے بعد عوام کی یہ بادشاہت چار پانچ سو کے ایوان میں جمہوری طور پر وہی فیصلے کرتی ہے جو ان کے وہ آقا کہتے ہیں جنھوں نے ان کی سیاست میں سرمایہ لگایا ہوتا ہے۔اگر کسی بھی سیاسی جماعت کو جو اللہ کے دین کے غلبے کی جدوجہد میں مصروف عمل ہے۔یہ غلط فہمی ہے کہ جمہوری نظام کی یہ پٹڑی اس لیے بچھائی گئی ہے کہ اس پر چڑھ کر ایک دن اسلامی نظام کی ٹرین منزل مقصود پر پہنچ سکتی ہے تو ایسی غلط فہمی دماغ سے نکال دینی چاہیے۔ جنھوں نے یہ عوام کی بادشاہت کے فریب کے نام پر یہ جمہوری پٹڑی بچھائی ہے وہ یہ ساری پٹڑی تباہ کردیتے ہیں لیکن اس پر سوار ہوکر ایسی حکومت کبھی قائم نہیں ہونے دیتے جو اللہ کی حاکمیت کو نافذ کرے۔الجزائر اور مصر اس کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔یہ گفتگو کا لب لباب تھا۔وہ رات اس موضوع پر کسی ٹیلی ویژن چینل پر طویل انٹرویو دے چکے تھے اور میں ایک کالم تحریر کرچکا تھا۔ گفتگو نے طول پکڑا تو کہنے لگے مری جارہا ہوں' وہاں میرے پاس ایک گھر ہے' وہیں چلے آؤ' بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔کوئی لائحہ عمل طے کرتے ہیں۔وہ مری چلے گئے اور میں لاہور آگیا اور پھر یہیں پر یہ خبر ملی کہ وہ انتقال کرگئے۔

نسیم انور بیگ صاحب کی پررونق اور ایمان افروز میز پر ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔کچھ عرصہ پہلے وہ فوج سے ریٹائر ہوئے تھے۔پورا ملک گزشتہ پندرہ سالوں سے افغان جہاد کا گواہ تھا اور اب روس کے جانے کے بعد وہاں پر عالمی طاقتوں کی رسہ کشی دیکھ رہا تھا۔ آئی جے آئی بن چکی تھی اور نواز شریف برسراقتدار آچکے تھے۔جنرل حمید گل جن کا نام اس وقت تک ایک افسانوی کردار کی چاشنی لیے ہوئے زبان زد عام تھا۔وہ خواب دکھاتا ہے۔قرون اولیٰ کی باتیں کرتا ہے۔ایک سوچ رکھتا ہے' قیادت فراہم کرسکتا ہے۔ایسا سوچنے والے بھی بہت تھے اور یہ کہہ کر انھیں مسترد کرنے والے بھی کافی کہ وہ ایک جہادی ہے' جرنیل ہے' فوج ہی کا دوسرا چہرہ ہے۔ایسے کردار اپنے اندر بلا کی کشش رکھتے ہیں۔ایسے کرداروں کے مداح ان پر جان چھڑکنے والے ہوتے ہیں اور ان کے مخالف ان کی موت کے آرزومند۔ چرچل جب اپنی مقبولیت کے عروج پر تھا تو جنگ عظیم دوم کی فتح کے بعد ایک دفعہ پیرس کے بازار میں گھوم رہا تھا۔ایک خاتون نے اس کا گریبان تھاما اور کہا "اگر تم میرے خاوند ہوتے تو میں تمہاری کافی میں زہر ملادیتی"۔ چرچل مسکرایا اور اس نے کہا "اگر تم میری بیوی ہوتی تو میں وہ کافی بخوشی پی لیتا"۔ایسی ہی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی جنرل حمید گل کا بھی خاصہ تھی اور شاید یہ ہر ایسے کردار کا خاصہ ہوتی ہے جسے محبت کے پھول اور نفرت کے پتھر بیک وقت ملے ہوں۔یوسف زئی پختون قبیلے کا فرد جس کے آباؤاجداد سرگودھا میں آکر آباد ہوگئے۔ تمتماتا ہوا چہرہ اور آنکھوں میں حیاء اور شرم کی خیرہ کردینے والی چمک۔ شخصیت کا رعب ایسا کہ محفل میں کسی کو لغو یا فضول بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔وہ آتے تو نسیم انور بیگ صاحب ہمہ تن گوش ہوجاتے۔یوں تو میز پر موجود ہر کوئی انھیں اس لئے سننا چاہتا تھا کہ ان کے پاس تازہ خبر ہوگی لیکن وہ تو خود نسیم انور بیگ کے پاس آتے کہ خبر تو وہ ہے جس کا فیصلہ قضاوقدر کے کارپردازان کرتے ہیں۔وہ خواب ایسے دیکھتے جس کی تعبیر کی تکمیل کا راستہ موجود ہو۔وہ اس راستے کا تعین بھی کرتے اور ایک جرنیل کی طرح اس پر چلنے' دشمن سے ہوشیار رہنے اور وقت پر وار کرنے کی پوری حکمت عملی وضع کرتے۔

دنیا میں تاریخ سے زیادہ متعصب اور گمراہ کن مضمون کوئی نہیں۔ تعصب کے ضمیر میں گندھا ہوا اس کا آٹا بدبودار اور متعفن زدہ ہے۔دو یا تین ہزار سال تو دور کی بات ہے آج ہم کسی شخصیت یا واقعہ کی تاریخ لکھنا چاہیں تو ہمارے تعصبات ہمیں سچ نہیں لکھنے دیتے۔ کیا ہم آج ضیاءالحق کے بارے میں سچ لکھ اور بول سکتے ہیں۔وہ جنھیں اس نے اقتدار کی مسند بٹھایا اور وہ آج بھی بیٹھے ہوئے ہیں' ان کی بھی زبانیں گنگ ہیں۔کیا اسامہ بن لادن اور ملا محمد عمر جیسے کرداروں کے بارے میں کبھی سچ بولا جائے گا۔شاید نہیں اور خصوصاً اس کارپوریٹ سرمائے سے قائم میڈیا اور جمہوری نظام میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔جنرل حمید گل کی شخصیت بھی ایسی ہی ایک شخصیت ہے کہ جس پر بات کرنے والے سیکولر عینک کے تعصب اور جمہوری فریب زدگی کے قلم سے مسلح ہیں لیکن اس مملکت خداداد پاکستان سے محبت اور اس کے مستقبل سے امید گل صاحب کی شخصیت کا ہی خاصہ تھی۔ان پر تنقید کرنے والے سیاست دان یا ان کے پروردہ وہ ہیں جن پر اس ملک میں اقتدار کے دروازے بند ہوں تو کوئی بھارت کے ٹینکوں پر چڑھ کر آنے کی خواہش رکھتا ہے تو کوئی امریکہ اور سعودی عرب کے اثرورسوخ کی چھتری تلے اس ملک پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ حمید گل صاحب کا ضمیر ہی اس وطن سے محبت میں گندھا ہوا تھا۔92ء ہجری میں امام نفس زکیہ کے صاحبزادے عبداللہ شاہ غازی جس جہاد ہند کی بشارتیں اپنے نانا سید الانبیاء ﷺ کے حوالے سے سنتے آئے تھے اور اس کی امید پر کراچی کے ساحلوں پر آکر آباد ہوگئے تھے' جنرل حمید گل اسی سلسلے کی ایک کڑی تھے۔افغان جہاد کا کونسا ایسا سپاہی ہے جو ان کا نام احترام سے نہ لیتا ہو' افغان جہاد کے بارے میں ان کا ایک موقف تاریخ کی اتنی بڑی سچائی ہے کہ اگر کبھی کسی نے پاکستان کی تاریخ تعصب کی عینک اتار کر لکھی تو وہ حمید گل صاحب کے اس موقف پر مہر تصدیق ثبت کرے گا کہ "افغانوں نے چودہ سال قربانی دے کر پاکستان کے بقا اور تحفظ کی جنگ لڑی"۔ جن عظیم دانشوروں اور کافی کے تلخ گھونٹ اور مشروب مغرب کے اثر میں لکھنے والوں کو اس بات کا اندازہ نہیں وہ صرف ایک بار تاجکستان' ازبکستان' کرغستان' کازاکستان' ترکمانستان اور آذربائیجان کی مسلمان ریاستوں میں جاکر دیکھ لیں جن پر سوویت یونین نے قبضہ کیا تھا۔ ظلم وبربریت کی کہانیاں تو آپ کو ہر بوڑھا سنائے گا کہ 1917ء کوئی زیادہ دور کی بات نہیں لیکن غربت وافلاس اور بھوک اور بیماری یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ سوویت یونین کے قبضے نے وہاں کیا کچھ کیا۔دوشنبے جیسے شہر میں صرف دو سڑکیں شہری سہولیات رکھتی' باقی شہر میں عورتیں آج بھی ربڑ کے مشکیزے اٹھائے پانی بھر کر لاتی ہیں۔بڑے بڑے ثقافتی مرکز اور غربت وافلاس میں ڈوبے ہوئے شہر اور دیہات۔ان لوگوں کی نسل کشی جنھیں دین کا تھوڑا سا بھی علم حاصل تھا۔ پچھتر سال تک مسجدوں پر تالے' کئی ایک کو گوداموں میں بدل دیا گیا۔لوگ تہہ خانوں میں چھپ کر قرآن کی تعلیم بچوں کو دیتے۔دسمبر 1979ء میں جب روس افغانستان میں داخل ہوا تو پاکستان کے تمام ترقی پسند جو آج امریکہ کی جھولی میں بیٹھے ہیں' اس وقت روس کے خوشہ چین تھے۔ مسکراتے ہوئے طنز کرتے تھے کہ وہ دیکھو تمہارے دروازے تک آگیا' اب ڈیورنڈ لائن عبور کرے گا اور تم لوگ داڑھیاں منڈوا کر اپنی شناخت چھپاتے پھروگے۔کوئی عبدالرحمٰن سے رحمانوف بن جائے گا اور کوئی نذیر سے نذیروف۔ سرخ سویرا طلوع ہونے والا ہے۔ بیس لاکھ افغان اپنی جانوں کی قربانی نہ دیتے۔افغانستان کو سوویت یونین کا قبرستان نہ بناتے تو نہ حمید گل کی آئی ایس آئی ہوتی اور نہ ہی نواز شریف کی مسلم لیگ' نہ الطاف بھائی کی گونج ہوتی اور نہ مولانا فضل الرحمٰن کا جبہ و دستار۔جس کو حمید گل کی اس سچائی پر یقین نہیں' وہ ایک دفعہ وسط ایشیائی مسلمان ریاستوں کا دورہ کرکے دیکھ لے۔ایسا سچ بولنے والا آج ہم میں نہیں رہا' لیکن میرا ایمان ہے کہ جس راستے کے وہ راہی تھے' ان کا استقبال اس راستے پر گامزن ارواح نے کیا ہوگا جو رسول اللہ ﷺ کی اس بشارت کی امین تھیں۔ "دو لشکروں پر جہنم کی آگ حرام' ایک وہ جو عیسیٰ ابن مریم کے ساتھ ہوگا اور دوسرا وہ جو جہاد ہند میں حصہ لے گا"۔

ہیرلڈ پنٹر اور ملالہ یوسف زئی

گلے کے سرطان کی وجہ سے اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس پچھتر سالہ شخص کی جرأت، بہادری اور الفاظ کی گھن گھرج سے ہال میں بیٹھے لوگ حیرت میں گم تھے۔ سرطان کے اسی حملے کی وجہ سے اس کی جلد ایک خطرناک مرض کا شکار ہو چکی تھی اور خون میں زہریلے مواد کے در آنے سے جسے Spticemia کہتے ہیں، اسے چلنے اور کھڑے ہونے میں بھی مشکلات درپیش تھیں۔ ان تمام مشکلات و مصائب کے باوجود 7 دسمبر 2005 کو سویڈیش اکیڈیمی اسٹاک ہوم کی نوبل انعام کی تقریب منعقدہ بور سلین Borssalen میں اس نے انعام وصول کرنے کے بعد جو تقریر کی وہ آج کے دور کے مظالم پر ایک فردِ جرم تھی۔ یہ فردِ جرم ایک ایسے شخص نے پڑھ کر سنائی جس کی ساری زندگی شاعری کرنے، ڈرامے لکھنے، فلموں کے سکرین پلے تحریر کرنے اور اداکاری کرتے گذری۔ مشرقی لندن کے علاقے ہیکنی Hackney میں 10 اکتوبر 1930 کو پیدا ہونے والا ہیرلڈ پنٹر "Pinter Harlod" جس نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے کے ایک سکول میں حاصل کی۔ تعلیم کے دوران وہ ڈراموں میں حصہ لیتا، تقریریں کرتا اور کرکٹ کھیلتا تھا۔ وہ شاعری بھی کرتا اور اپنے آپ کو ایک پیدائشی شاعر سمجھتا تھا۔ سکول کے بعد اس نے ڈرامائی آرٹ کی رائل اکیڈمی میں داخلہ لیا لیکن اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکا۔ اسے رائل اکیڈیمی اس لئے چھوڑنا پڑی کہ اس نے ضمیر کی آواز بلند کرتے ہوئے جبری طور پر فوجی ٹریننگ اور ملازمت سے انکار کیا تھا۔ رائل اکیڈیمی سے نکالے جانے کے بعد اس نے نسبتاً ایک چھوٹے ادارے سنٹرل سکول آف سپیچ اینڈ ڈراما میں اپنی تعلیم مکمل کی اور ساتھ ساتھ انگلینڈ اور آئرلینڈ کے تھیٹروں میں بھی اداکاری شروع کر دی۔ ستائیس سال کی عمر میں اسے پہلا ڈرامہ "TheRoom" تحریر کرنے کا موقع ملا۔ اس کا دوسرا ڈرامہ "BrithdayParty The" صرف آٹھ شو کرنے کے بعد بند کر دیا گیا۔ اس کی تحریوں کو Comedy of menace یعنی خوفزدہ کرنے والا مزاح " قرار دیا گیا۔ لیکن وہ لکھتا رہا اور اداکاری بھی کرتا رہا۔ وہ مسلسل شاعری میں بھی طبع رواں رکھے ہوئے تھا۔ اس کی اسی لگن اور انتھک محنت نے اسے برطانیہ کا مقبول ترین ڈرامہ نگار بنا دیا۔ اس کے اندر ایک باغی کی روح بچپن ہی سے تڑپ رہی تھی۔ صرف 18 سال کی عمر میں اس نے سرد جنگ کی مخالفت کی اور اسے باضمیر مخالف " کے نام سے پکارا گیا، کیونکہ اس نے برطانوی فوج کی جبری ملازمت سے انکار کیا تھا۔ اس نے "29 سال کی عمر میں نسلی امتیاز کے خلاف چلنے والی تحریک میں حصہ لیا اور تمام برطانوی آرٹسٹوں کو قائل کیا کہ ان کے ڈرامے جنوبی افریقہ جیسے نسل پرست ملک میں نہیں چلنے چاہیں۔ عمر کے آخری پچیس سال اس نے خود کو کالم اور مضامین لکھنے، تقاریر کرنے اور انٹرویو دینے تک محدود کر لیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ڈراموں اور شاعری کی نسبت اس طرح زیادہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ اس نے 1991 کی پہلی عراق جنگ کی مخالفت کی، 2001 میں افغانستان اور 2003 میں عراق پر حملے کے خلاف وہ میدان میں نکل آیا۔ اس کے مضامین اور تقریریں جرأت و بہادری اور طنز و مزاح کا امتزاج تھیں۔ اس نے ٹونی بلیئر کو DeludedIdiot "مغرور جاہل" کہا اور جارج بش انتظامیہ کو نازی جرمنی سے تعبیر کیا۔ اس نے کہا کہ امریکہ دنیا میں قتل و غارت کے ذریعے اپنی سلطنت قائم کرنا چاہتا ہے اور اس کے عوام اور برطانیہ کا قاتل وزیر اعظم اس سب کو ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے کوئی سٹیڈیم میں میچ دیکھتا ہے۔ اس کی تحریوں پر اسے بے تحاشا ایوارڈ ملے اور آخر کار 2005 میں اسے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ وہ شدید بیمار تھا۔ اس کے گلے کے سرطان کا آپریشن ہو چکا تھا۔ اس کی جلد ایک بیماری کی وجہ سے کٹ پھٹ چکی تھی اور خون میں زہریلے مواد کی آمیزش نے اسے چلنے پھرنے سے معذور کر دیا تھا۔ اسے ادب کا نوبل انعام دیا گیا تو اس نے تاثرات ریکارڈ کرواتے ہوئے کہا" مجھے صبح کسی نے بتایا کہ SKY چینل پر میرے بارے میں یہ خبر چلی ہے کہ ہیرلڈ پنٹر مر گیا اور پھر تصحیح کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ نہیں اسے تو ادب کا نوبل انعام دیا گیا ہے، تو یوں میں ایک دفعہ مر کے دوبارہ زندہ ہوا ہوں"وہ دسمبر میں انعام وصول کرنے کے لیئے سٹاک ہوم جانا چاہتا تھا، اس نے تمام تیاریاں مکمل کر لیں، لیکن نومبر میں اسے ہسپتال داخل ہونا پڑا اور ڈاکٹروں نے اسے اس قسم کے سفر سے منع کر دیا۔ اس کے اندر کے باغی کی روح بے چین ہو گئی۔ اس نے ویل چیئر پر بیٹھے بیٹھے نوبل انعام وصول کرنے کے بعد کی جانے والی تقریر ریکارڈ کروائی جسے سویڈش اکیڈیمی نے تین بڑی بڑی سکرینیں لگا کر ہال میں لوگوں کو سنایا۔ اس کی تقریر اکیسویں صدی میں ہونے والے جنگی جرائم کی فردِ جرم ہے اور سیاست، سیاسی رہنماؤں اور جمہوری نظام کے منہ پر طمانچہ ہے۔ تقریر کا آغاز سچ اور سچ کی تلاش کے تصور سے شروع ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے " سیاست دانوں کی اکثریت سچ کی وادی کے سفیر ہی نہیں۔ وہ کسی طور بھی سچ کی بالادستی میں دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ طاقت کا حصول اور اس کا مستقل دوام ہی ان کے منزل ہوتی ہے۔ وہ نکاراگوا میں امریکی بدمعاشی کی کہانی سناتا ہے جہاں وہ چالیس سال سموزا کی حکومت کی مدد کرتا رہا تاکہ وہ سکول تباہ کرے، لوگوں کو قتل کرے، عورتوں کی عزت لوٹے۔ وہ کہتا ہے کہ جب کانگریس اس قتل و غارت کی منظوری دے رہی تھی تو میں امریکی سفارت خانے احتجاج کے لیئے گیا۔ میں نے دھواں دار گفتگو کی جس کے جواب میں امریکی سفارت کار نے طنزیہ مسکرا کر بس اتنا کہا، " میں آپ کے ڈرامے پسند کرتا ہوں "۔ وہ بتاتا کہ السلویڈور میں 1989 میں کس طرح امریکی رجمنٹ نے چھ قابلِ قدر ججوں کو یونیورسٹی میں قتل کر دیا۔ آرک بشپ رومیو کو اس وقت قتل کر دیا گیا جب اس نے لوگوں سے خطاب کے دوران یہ فقرہ کہا تھا کہ امریکیوں نے 75 ہزار افراد کو قتل کیا ہے وہ اپنی تقریر میں ایسے ملک گنواتا ہے جہاں جمہوریت اور آزادی کا نظام نافذ کرنے کے بہانے امریکہ نے لاکھوں لوگ قتل کیئے۔ انڈونیشیا، یونان، یوراگوئے، برازیل، پیراگوئے، ہیٹی، فلپائن، گوئٹے مالا، السلواڈور اور چلی۔ لیکن اس کا زورِ بیان افغانستان سے ہوتا ہوا عراق کے قتل و غارت پر اپنے عروج پر پہنچتا ہے۔ میں اس کے انگریزی الفاظ تحریر کر رہا ہوں تاکہ اس کی تلخی کا صحیح تصور کیا جا سکے:

"people and call it bringing freedom and democracy to the middle east innumerable random murder, misery, degradation and death to the Iraqi We have brought torture, cluster bombs, depleted uranioum",

ہم نے عراقی عوام کو تشدد، کلسٹر بم، تابکاری یورینیم، لاتعداد قتل و غارت کے واقعات، بدبختی، عزت و حرمت" کی پامالی اور موت تحفے میں دی ہے اور ہم کہتے ہیں کی یہ سب ہم نے مشرقِ وسطیٰ میں آزادی لانے کے لیئے کیا ہے "اس کے بعد وہ پکارتا ہے کہ جنگی جرائم کی عدالت میں امریکہ اور اس کے حواریوں کو لے جانے کے لیئے اور کتنے مقتول چاہیں، ایک لاکھ، یہاں تو کئی ایک لاکھ لوگ قتل ہو چکے۔ اپنی اس تقریر کے ٹھیک تین سال بعد 31 دسمبر 2008 کو وہ انتقال کر گیا۔ لیکن نوبل انعام حاصل کرنے والوں کے ہر سال کے اجتماع میں فضاؤں میں کہیں اس کی تقریر کی گونج آج بھی موجود ہو گی۔ یہ گونج اس وقت بھی موجود تھی جب اسی امریکہ اور برطانیہ کی آشیرباد سے ملالہ یوسف زئی نے امن کا نوبل انعام حاصل کرنے کے بعد امریکہ اور اس کے حواریوں کے قتل و غارت اور درندگی کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کے طور پر جائز قرار دیا تھا۔ شاید ہیرلڈ پنٹر کی روح اس موقع پر پوری پاکستانی قوم سے زیادہ شرمندہ ہوئی ہو گی۔ لیکن ہم کیوں شرمندہ ہوں۔ ہم ملالہ یوسف زئی کو پسند کرتے ہیں۔ ہم تو پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم میں وکٹوریہ کراس لینے والوں کو آج بھی عزت و احترام سے دیکھتے ہیں۔ ہماری اسمبلیاں ان لوگوں سے بھری ہوئی ہیں جن کے آباءواجداد نے 1857 کی جنگ آزادی میں افرادی قوت مہیا کی تھی۔ ایک ایک مسلمان باغی کو اپنے شہروں میں قتل کرنے پر چند روپے فی لاش وصول کیئے تھے۔ ہم نے دوسری جنگ عظیم میں انگریز کی وفاداری دکھانے والوں کو منچھر جھیل سندھ کے آس پاس زمینیں دی تھی۔ ہم آج بھی اپنے انہی آباؤاجداد پر فخر کرتے ہیں جو KBOE اور OBOE جیسے برطانوی تمغے حاصل کرتے رہے ہم مدتوں اس سپاہی کی یاد میں گلے میں نیلا ربن ڈالتے رہے ہیں جس نے 1857 میں دہلی قلعہ کے دروازے میں گردن دے دی تھی، گردن نیلی ہو گئی تھی لیکن دروازہ کھلا رہا اور انگریز فوج اندر داخل ہو گئی تھی۔ ہمارے رول ماڈل آج بھی برطانوی سول سروس کے وہ وفادار بیوروکریٹ ہیں جنہوں نے یہاں پر ابھرنے والی تحریک کو کچلنے کے لیئے تشدد کیا، پھانسیاں دی، کالے پانی بھجوایا۔ یہ سب ہمارے لیئے قابلِ فخر ہیں، ان لوگوں کی اولادیں ہماری سیاسی اشرافیہ ہیں ہمارے روحانی پیشوا ہیں، ہماری سول اور ملٹری اسٹیبلشمنٹ کا حصہ ہیں۔ ہمارے درمیان سے ہیرلڈ پنٹر نہیں ملالہ یوسف زئی ہی جنم لے سکتی ہے یا پھر ہم صرف ملالہ یوسف زئی پر فخر کر سکتے ہیں کسی ہیرلڈ پنٹر جیسے پاکستانی پر نہیں۔

ہمارے افسانہ ساز مورخین

ایران کے دار لحکومت تہران کے ایک جانب بلند وبالا پہاڑ البرز کے اس پار ایک انتہائی خوبصورت خطہ ہے جسے مازندران کہتے ہیں۔ماضی میں اسے طبرستان کہتے تھے۔یہ خطہ انتہائی سرسبز ہے اور البرز پہاڑ سے کیسپین سمندر تک پھیلا ہوا ہے۔کیسپین جسے ایرانی دریائے خذر کہتے ہیں،وسطی ایشیاء کے کئی ممالک کے درمیان ایک بہت بڑا جھیل نما سمندر ہے۔یہاں سے بخارات اٹھتے ہیں،بادل بنتے ہیں،البرز کی بلندیوں سے ٹکراتے ہیں اور مازندران کے علاقے کو سرسبز و شاداب بناتے ہیں۔کیسپین سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ ہر ملک نے ایک خوبصورت سڑک تعمیر کی ہے جس پر ہر چند کلومیٹر کے فاصلے پر سیرو تفریح کے لیئے خوبصورت آبادیاں موجود ہیں۔ایسی ہی ایک چھوٹی سی خوبصورت آبادی "امول" میں گیارہ سو سال قبل 838 عیسوی میں مسلمانوں کی تاریخ مرتب کرنے والا ایک فرد پیدا ہوا۔والدین نے اس کا نام محمد رکھا،اس کے والد کا نام جریر اور دادا کا نام یزید تھا، ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید۔ لیکن دنیا اسے اپنے علاقے طبرستان کے حوالے سے ال طبری کے طور پر جانتی ہے۔اس نے سات سال کی عمر میں قرآنِ پاک حفظ کیا اور بارہ سال کی عمر میں اپنے گھر سے قصبہ رے موجودہ تہران مین مشہور مفسر الرازی سے درس لینے گیا۔رازی اسوقت بہت ضعیف العمر ہو چکے تھے۔تقریباً پانچ سال بعد وہ بغداد چلا گیا۔وہاں امام احمد بن حنبل کا بہت شہرہ تھا۔اسلامی تاریخ میں معتزلہ کے فتنے کے مقابلے میں جس قدر صعوبتیں اور تشدد امام احمد بن حنبل نے برداشت کیا اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔لیکن طبری کے بغداد پہنچنے سے پہلے ہی امام احمد بن حنبل خالق حقیقی سے جا ملے۔ طبری نے ان کے شاگردوں سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد شافعی مسلک کے استادوں سے بھی پڑھا۔اس کے بعد وہ شام، فلسطین اور مصر چلا گیا اور وہاں شیعہ اور اسماعیلی علماء سے کسب فیض کیا۔طبری بغداد واپس آیا تو بغداد پر عباسی خلیفہ ال معتضد کی حکومت تھی۔اسوقت طبری کی عمر پچاس سال ہو چکی تھی۔ طبری دربار سے وابستہ تو نہ ہوا لیکن اس کے خیالات عباسی خلفاء کے معتزلی خیالات سے ہم آہنگ ہوتے چلے گئے اور پھر اس نے اپنی فقہ اور اپنے مسلک کی بنیاد رکھی جسے ---اُلجریری کہا جاتا ہے۔یہ مسلک اس کی موت کے فوراً بعد ہی دم توڑ گیا۔اسلامی تاریخ میں امام احمد بن حنبل کا تمام مسالک میں احترام پایا جاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ اگر وہ مسئلہ خلق قرآن پر استقامت نہ دکھاتے تو آج اسلامی علم کی میراث ہی مختلف ہوتی۔ معتزلہ کا فتنہ پرداز قرآن کو مخلوق ثابت کرنا چاہتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر ایک دفعہ اس امت نے قرآن کو مخلوق مان لیا تو پھر جس طرح ہر مخلوق میں تبدیلی کی جاسکتی ہے ویسے قرآن میں بھی وقت اور حالات کے مطابق تبدیلی کی جاسکے گی۔امام احمد بن حنبل کی بصیرت اور قربانی نے اس امت کو اس فتنے سے محفوظ رکھا۔اسلامی تاریخ میں امام احمد بن حنبل کا واحد ناقد اور مخالف محمد بن جریر ال طبری نظر آتا ہے۔یہ اس قدر مخالف تھا کہ عباسی خلفاء کے دور میں لوگ نفرت کے طور پر گزرتے ہوئے اس کے گھر پر پتھر پھینکا کرتے تھے۔لوگوں کی مخالفت اسقدر بڑھی کہ عباسی خلفاء نے ایسے لوگوں کو قید میں ڈالنا اور کوڑے مارنا شروع کر دیا جو طبری کو برا بھلا کہتے تھے۔17 فروری 923ء کو وہ انتقال کر گیا اور عباسیوں نے اسے کسی خفیہ مقام پر دفن کر دیا تاکہ لوگ اس کی قبر کی بے حرمتی نہ کریں۔ایران جیسے علاقے میں پیدا ہونے کے باوجود طبری کا رنگ کافی سیاہی مائل تھا، بڑی بڑی آنکھیں، لمبا قد، چھریرا بدن،اس نے لمبی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ صحت کی حفاظت کے لیے گوشت اور چربی وغیرہ نہیں کھاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ موت تک اس کی داڑھی میں سفید بال نہیں آئے تھے۔ سال کی عمر میں اس نے اپنی مشہور اور متنازعہ ترین 'تاریخ الرسل والملوک' لکھی۔یہ وہ تاریخ ہے جس کے ستر مندرجات آج تک امتِ مسلمہ میں فتنہ و فساد اور فرقہ بندی و نفرت کا باعث بنے ہوئے ہیں۔اور مغرب کے سیکولر انہیں ہتھیار بنا کر ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

طبری مغرب کے اسلام دشمنوں کا محبوب مورخ ہے۔ شروع شروع میں جب یورپ میں تحریک احیائے علوم شروع ہوئی تو عیسائی چرچ نے باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت اپنے زیرِ اثر کچھ مورخین کو اسلام کی تاریخ اور اسلامی کتب کے ترجمے کی ذمہ داری سونپی۔انہوں نے سب سے پہلے الیگزینڈر پاگانینی کا قرآن کا ترجمہ 1537ء میں شائع کیا۔اس ترجمے میں جان بوجھ کر ایسی غلطیاں کیں جن سے قرآنی آیات کے مطالب بدل جاتے تھے۔ ترجمے کو ایک خاص مقصد کے تحت استنبول برآمد کیا گیا۔پاگانینی جب اسے لے کر خلیفہ کے پاس پہنچا تو وہ سخت غصے میں آگیا اور اس نے اسے تلف کرنے کا حکم دے دیا۔اس کے تمام نسخے جلا دیے گئے لیکن پھر بھی اس وقت دنیا میں اس تحریف شدہ قرآن کے آٹھ نسخے موجود ہیں جن میں سے دو برٹش میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں۔اس تحریف شدہ قرآنی ترجمے کے ساتھ ساتھ دوسری کتاب جو مغرب کے ان متعصب اور بدنیت لوگوں نے عیسائی چرچ کی سربراہی میں ترجمہ کر کے چھاپی وہ تاریخِ طبری تھی۔

طبری کی تاریخ چھاپنے کی ایسی کیا ضرورت محسوس کی گئی۔اس کے پیچھے کونسے ایسے مقاصد تھے۔اس تاریخ میں ایسا کیا درج تھا کہ مغرب کے ان متعصب تاریخ دانوں کے ہاتھ میں آگیا اور پھر وہ آج تک اسلام اور مسلمانوں کو اپنا تختہء مشق بنائے ہوئے ہیں۔ طبری اور اس قبیل کے کئی مورخین ہیں جنہوں نے من گھڑت، جھوٹے اور بیہودہ افسانوی قصوں کو مسلمانوں کی تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ان قصوں کی نہ تو وہ کوئی سند دیتے ہیں اور نہ ہی ان کے پاس ان کے ماخذ کا کوئی علم ہے۔ خود طبری نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے "میں نے اس کتاب میں وہی کچھ لکھا ہے جو میں نے سنا ہے یا مجھے بتایا گیا ہے۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اس کتاب میں میں نے ماضی کے کسی آدمی یا واقعہ کا ذکر کیا ہے اور پڑھنے اور سننے والا اس کو قابلِ اعتراض یا تنقید و تردید کے قابل سمجھے تو یاد رہے کہ میں نے وہی کچھ لکھا ہے جو مجھے بتایا گیا ہے۔" جس کتاب کو بازاری قصوں کی کتاب ہونا چاہیے تھی اسے مستند ترین تاریخ سمجھ کر یورپ نے پیش کیا۔ طبری عام مسلمانوں کی بات کرتا تو برداشت تھا لیکن اس نے تو سید الانبیاء ﷺ کی ذات کے بارے میں بھی دو عدد من گھڑت قصے اسقدر فضول اور بیہودہ انداز میں تحریر کیئے ہیں کہ انہیں درج کرنے کی بھی ہمت نہیں پاتا۔ان دونوں فضول قصوں کا نہ کہیں قرآن میں ذکر ہے اور نہ ہی احادیث کی کتابوں میں۔ لیکن طبری نے اپنے ذہن کی غلاظت کو تاریخ کی چاشنی بنا کر پیش کی ہے۔ طبری کے تحریر کردہ قصوں کو ولیم می وِر سے لے کر میکس ویبر، جرجی زیدان، منٹگمری واٹ اور موجودہ مورخین ایسے پیش کرتے ہیں جیسے اصل سچ یہی ہے۔ مقصد صرف مسلمانوں کی سب سے قابلِ احترام شخصیات کے بارے میں فتنہ کھڑا کرنا۔اس لیئے کہ پوری تاریخِ طبری صحابہ سے لے کر عباسی دور تک ایسے افسانوں سے بھری ہوئی ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے تمام افسانے، من گھڑت قصے جن میں اختلاف کی بو آتی ہو، مسلمانوں کے کردار کی خرابی نظر آئے۔سب طبری اور اسی قبیل کے مورخین کی ایجادات ہیں اور یہ مورخین مغرب اور اس کے سیکولر حواریوں کو بہت محبوب ہیں۔ گزشتہ چھ سو سال سے یہ مغربی مورخین اسلام پر کتابیں تحریر کر رہے ہیں لیکن کوئی قرآن کی تعلیمات کا ذکر نہیں کرتا۔کوئی حدیث کی کتابوں سے معلومات نہیں لیتا۔سب جانتے ہیں کہ دنیا بھر میں مسلمانوں نے حدیث کی احتیاط کے سلسلہ میں اسماء الرجال کا ایک علم ایجاد کیا جو تاریخ کو مستند بناتا ہے۔لیکن چونکہ مسئلہ تذلیل اور امت کی تذلیل ہے اس لیئے جھوٹی افسانوی تاریخ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس امت کی پانچ فقہوں میں دین کے نافذالعمل اصولوں پر ذرا برابر اختلاف نہیں۔ شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی سب سود کو حرام، زنا پر سنگسار، چوری پر ہاتھ کاٹنا، جھوٹ، غیبت، وعدہ خلافی کو گناہ سمجھتے ہیں۔ سب پانچ نمازوں، ان کے اوقات، تیس روزوں، حج اور زکواۃ پر متفق ہیں۔کوئی اس کا ذکر نہیں کرے گا۔ تاریخ اٹھائے گا جو جھوٹے من گھڑت قصے کہانیوں پر مبنی ہے اور اس امت کے سارے جھگڑے تاریخ سے جنم لیتے ہیں۔اور اسے ہوا دینے میں ان تمام مشترقین کا دخل ہے جو ہمارے خیر خواہ بن کر ہم پر کتابیں لکھتے رہے اور ہمارے تابناک ماضی کو زہر آلود کرتے رہے۔

اجتماعی ہپناٹزم

ذہنوں کو مسخر کر کے انہیں اپنی مرضی کے احکامات کے مطابق عمل کرنے پر بلا چون وچرا راضی کرنے کو موجودہ دور کی نفسیاتی تعلیم کی دنیا میں بہت اہمیت حاصل ہے۔یوں تو ذہنوں کو قابو کرنے کا فن اتنا ہی قدیم ہے جس قدر انسان کی تہذیب و ترقی کا سفر لیکن جیسے جیسے علم کی دنیا نے ترقی کی تو تمام علوم کتب کی صورت محفوظ ہوتے چلے گئے ویسے ہی ہپناٹزم نے بھی اپنے دائرے ، ضابطے اور اصول وضع کر لیے۔ نفسیات دان یا نفسیاتی معالج اسے صرف علاج کے لیے استعمال کرنے کو جائز خیال کرتے ہیں۔کیونکہ جب آپ کسی شخص کو ہپناٹزم کے زیر اثر لاتے ہو تو پھر آپ اس کے لاشعور تک جا پہنچتے ہو، جہاں اس نے بہت سے ایسے تجربات چھپا کر رکھے ہوتے ہیں جو تلخ اور تکلیف دہ ہوتے ہیں، لوگوں کے خلاف اپنے جذبات کو دبایا ہوتا ہے۔ایسے جذبات جن کے بیان کرنے سے اسے خود نقصان پہنچ سکتا ہے۔ آدمی جب اپنے ایسے تجربات، خیالات اور جذبات کو دباتا ہے تو ایک مسلسل کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے جو اس میں اضطراب، بے چینی، پژمردگی، بلاوجہ غصہ اور بعض دفعہ جسمانی بیماریاں تک پیدا کر دیتی ہے۔ان میں جلدی امراض اور پیٹ کے السر بہت عام ہیں۔ نفسیات دان جب کسی مریض کا علاج کرتا ہے تو اسے مریض کے لاشعور تک رسائی کے لیے ہپناٹزم کا سہارا لینا پڑتا ہے جسے موجودہ دور میں "Hypnotherapy" کہتے ہیں۔ آجکل اس کے لیے آپریشن سے پہلے لگائے جانے والے انستھیزیا انجکشن کی ہلکی سی مقدار مریض کو ایک ایسی کیفیت میں لے جاتی ہے جہاں آپ احکامات کے ذریعے اس سے ماضی سے متعلق بہت کچھ اگلوا سکتے ہیں۔ یہ سب انفرادی ہپناٹزم کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن ایک گروپ ہپناٹزم ہے جو ایک ایسے گروہ پر استعمال کیا جاتا ہے جو بحیثیت مجموعی اس کے لیے راضی ہو۔ایم اے کے دوران ہمارے ایک جاپانی استاد تھے وہ اکثر اس کا مظاہرہ کرتے۔اگر کبھی ہم تھکاوٹ محسوس کر رہے ہوتے تو وہ ہمیں آنکھیں بند کرنے کو کہتے اور پھر ہاتھوں کو آنکھوں کے سامنے آہستہ آہستہ ہلانے کے احکامات جاری کرتے۔یہاں تک کہ ہم نیند میں چلے جاتے۔اجتماعی ہپناٹزم ایسے تمام افراد استعمال کرتے ہیں جنہوں نے اپنا کوئی گروہ منظم کیا ہو اور اسے ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کرنا ہو۔اس سے مثبت مقاصد بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں اور منفی بھی، ارتکاز، مراقبہ یا انگریزی زبان میں اجتماعی Meditation اسی کا نام ہے۔ یہی کیفیت ہوتی ہے جس میں کسی شخصیت کے دیدار یا اس کے حکم کو بجا لانے کے لیے لوگ کئی کئی گھنٹے سخت گرمی یا سخت سردی میں بیٹھے رہتے ہیں۔اجتماعی ہپناٹزم کے لیے کسی شخص کو مجبور کر کے بٹھانے کی ضرورت نہیں، نہ ہی اسے قائل کیا جاتا ہے کہ ایسا کچھ ہونے جا رہا ہے۔ بس اس کے سامنے ایک ایسی کیفیت پیدا کی جاتی ہے جس کو دیکھنے کے لیے وہ ایک لمحے کو رک جاتا ہے۔اسے یہ شخص یا کیفیت حیران کن اور مزا دینے والی لگتی ہے۔ جیسے ہی وہ اس کیفیت کے سحر میں ایک لمحے کو رکتا ہے اس کا ذہن اس شخص کے کنٹرول میں آجاتا ہے جو اجتماعی ہپناٹزم کر رہا ہوتا ہے۔دنیا کے بڑے بڑے گروہ (Cult) اسی ذہنی تسخیر کی بنیاد پر مرتب کیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حسن بن صباح نے الموط کے پہاڑ پر جو جنت تخلیق کی تھی اور جس سے وہ اپنے زیر اثر لوگوں کو فدائی حملوں کے لیے راضی کر لیتا تھا وہ اسی اجتماعی ہپناٹزم کے طریقوں کی اعلیٰ ترین کیفیت تھی۔امریکہ میں اسی کے زیر اثر کئی سو افراد کو اجتماعی خودکشی پر مجبور کیا جاتا رہا اور ستر کی دہائی میں پنجاب سے ایک شخص نے کئی سو لوگوں کو زیارتوں پر جانے کے لیے صندوقوں میں بند کیا اور سمندر میں بہا دیا اور کہا تم ایک دن کربلائے معلیٰ پہنچ جاؤ گے۔موجودہ خودکش حملوں کی ترغیب بھی اسی اجتماعی ہپناٹزم کے اصولوں کے استعمال کی ایک شکل ہے۔ لیکن اس کی شاندار اور اعلیٰ ترین مثال موجودہ دور کا میڈیا ہے۔یوں تو میڈیا کی تاریخ بہت پرانی ہے۔یہ اس وقت سے موجود ہے جب انسان صرف گفتگو کا فن جانتا تھا لیکن تحریر سے اسے آشنائی نہ تھی۔ تقریر، شاعری اور حسن کلام اسی دور سے لوگوں کے ہجوم کو مسخر کرنے کیلئے استعمال ہوتا تھا۔پھر کتاب، قلم، کاغذ اور اخبار آیا۔ سٹیج ڈراموں اور پتلیوں کے تماشوں کے ذریعے انسانوں نے انسانوں کے ذہنوں کو مسخر کرنا صدیوں پہلے سیکھ لیا تھا۔کئی ہزار سال تک اس میڈیا کا مثبت استعمال رہا کہ یہ اجتماعی سطح پر اور عالمی طور پر کسی ایک گروہ کا غلام نہیں تھا۔جدید میڈیا، جدید مغربی تہذیب کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ یہ ایٹم بم، نیپام بم، ہائیڈروجن بم اور کیمیائی ہتھیاروں سے بھی زیادہ خطرناک اثر اپنے اندر رکھتا ہے۔یہ انسانوں کے ذہنوں کو اس طرح اجتماعی ہپناٹزم کے ذریعے مسخر کرتا ہے کہ انہیں حقیقت اور سراب میں فرق تک محسوس نہیں ہوتا۔وہ اس کے سحر میں ایسے کھوئے ہوتے ہیں کہ انہیں نہ اپنے نقصان کا اندازہ ہوتا ہے اور نہ دوسروں کے دکھ اور درد کا۔

جدید مغربی تہذیب جو گزشتہ تین سو سال کی ایجاد ہے اس نے پوری دنیا میں نو آبادیات کی دولت کو لوٹ کر ترقی یافتہ ہونے کا سفر جب طے کر لیا تو اسے اپنی نو آبادیوں کو آزادی کے بعد مستقل غلام بنانے کا خیال آیا۔جب ایشیاء، افریقہ اور جنوبی امریکہ لوٹ لیا گیا تو اسے چھوڑنے کا ارادہ کرنے سے پہلے اس بات کو یقینی بنایا گیا کہ اب یہ سب کے سب ہماری تہذیب کے بہترین نقال بن جائیں۔اس کے لیے انہوں نے ملک میں ایسے ادارے تخلیق کیے جو ان غلام معاشروں میں جدید مغربی تہذیب کی کاربن کاپیاں تیار کریں۔ان میں سب سے اہم ادارہ تعلیم اور دوسرا ادارہ میڈیا تھا۔ تعلیم میں سائنسی علوم شامل نہیں کہ ان کا معاشرے کی تبدیلی میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ایئر کنڈیشنڈ، کار، بلب یا ہوائی جہاز لوگوں کو اخلاقیات یا سماجی طرز زندگی نہیں سکھاتا۔ لیکن پرائمری تعلیم اور سوشل سائنسز آپ کے ذہن میں کرداروں کو تخلیق کرتی ہیں۔کارٹون، نرسری کی نظمیں، کومکس اور اسی طرح مذہب سے بیگانہ اخلاقیات آپ کو اپنے سحر میں لے لیتی ہے۔اس کے بعد جب آپ میڈیا کھولتے ہیں تو آپ کو وہ کسی قسم کا اچنبھا نہیں لگتا۔ آپ ویسا ہی ماحول دیکھنے کے لئے تیار ہو چکے ہوتے ہیں۔جب آپ تیار ہو گئے تو پھر آپ کا ذہن اجتماعی ہپناٹزم کرنے والے کے ہاتھ میں آگیا۔اس کی بدترین مثال یہ ہے کہ آپ کسی شہر پر امریکی طیاروں کی بمباری کے براہ راست مناظر دیکھ رہے ہوتے ہیں لیکن اس سب کو اس طرح دیکھ رہے ہوتے ہیں جیسے ہالی ووڈ کی کوئی فلم دیکھی جاتی ہے۔ منظر کو اس طرح طاقت کے مظاہرے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ جس بلڈنگ پر یہ بم گرا رہے اس میں تین چار سو خاندان رہائش پذیر ہوں گے۔ بچے' بوڑھے' عورتیں وہاں مقیم ہوں گی۔ یہ میڈیا جن کو مظلوم ثابت کرنا چاہئے ان کے صرف روتی صورتیں دکھا دے اور ہم ان سے ہمدردی کرنے لگیں اور جن کی موت پر سے بے گانہ رکھنا چاہے تو گلیوں میں بکھرے ہوئے لاشوں کے ٹکڑے بھی نہ دکھائے اور ساتھ یہ دلیل بھی دے کہ ہم تو اخلاقاً ایسا نہیں کرتے کہ ان سے لوگ خوفزدہ اور نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں۔

یہ اجتماعی ہپناٹزم دنیا کو جدید مغربی تہذیب کی کاربن کاپی بنانے کا عمل ہے۔اگر یورپ کی عورتوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بے پردگی اختیار کریں گی تو میڈیا اپنے سحر سے سب کو قائل کر لیتا ہے کہ یہ ایک مہذب عمل ہے۔یورپ کے مرد اگر شیو کرنا شروع کر دیں تو پوری دنیا میں ہیرو کا تصور اسی کی کاربن کاپی ہونا چاہئے۔ عورتوں کے دلوں میں جذبات ایسے ہی ہیرو سے ابھرنے چاہئیں۔ آخر اس جدید مغربی تہذیب کی کاربن کاپی پوری دنیا کو بنانے کی ضرورت کیا ہے۔ آخر اس میڈیا کو کون سرمایہ فراہم کرتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ کرے۔میڈیا کو ہر ماہ اربوں ڈالر دیئے جاتے ہیں جو کارپوریٹ سرمائے سے ادا ہوتے ہیں۔اور یہ کارپوریٹ سرمایہ بینکوں کی جعلی کاغذی کرنسی سے جنم لیتا ہے۔اس کارپوریٹ سرمایہ کی امین پنتالیس ہزار کارپوریشنیں ہیں جن کو پانچ سو بنیادی کارپوریشن کنٹرول کرتی ہیں اور ان کو بیس بینک کنٹرول کرتے ہیں اور انہیں سرمایہ بھی فراہم کرتے ہیں۔ان سب کو پوری دنیا جدید مغربی تہذیب کی کاربن کاپی کی صورت میں چاہئے۔اس لئے کہ جب تک سب لوگ ایک جیسا پیزا' برگر' چکن یا کھانا نہیں کھائیں گے' ایک جیسی جینز' جاگر اور لباس نہیں پہنیں گے' ایک جیسا میک اپ اور خوشبو نہیں استعمال کریں گے' ایک جیسا لائف سٹائل اختیار نہیں کریں گے تو ان کا مال نہیں بکے گا۔ایک جیسے لائف سٹائل کا مطلب ہے کہ جدید مغربی تہذیب کی کاربن کاپی' خاندانی زندگی کی اخلاقیات بھی ویسی' بڑوں کا عدم احترام بھی ویسا' معاشرتی' برائیوں زنا' شراب' جواء اور ہم جنس پرستی پر غرور بھی ویسا۔ایسے انسان صرف اسی وقت بنائے جا سکتے ہیں جب آپ کا ذہن کسی اجتماعی ہپناٹزم کرنے والے کے قابو میں آجائے اور میڈیا یہ کام کس قدر آسانی اور غیر محسوس طریقے سے کرتا ہے۔ ہمیں احساس تک نہیں ہوتا اور ہم وہ سب کچھ کر رہے ہوتے ہیں جن پر ہمیں حیرت تک نہیں ہوتی۔

عشق نہ ہو تو شرع ودیں بتکدۂ تصورات

ہم لوگ بھی کس قدر ظالم ہیں کہ اسلام کی تشریح اپنی مرضی سے کرنے اور اسے اپنے موجودہ ماڈرن' سیکولر اور مغربی تصورات سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ایسی شخصیات کا انتخاب کرتے ہیں جن کی ایک عمر جہالت اور گمراہی میں گزری' انہوں نے اسلام کو ویسے ہی مغرب زدہ معانی پہنانے کی کوشش کی جیسی گزشتہ تین سو سالوں سے مغرب زدہ دانشور کر رہے ہیں۔ لیکن چونکہ عظیم لوگ مسلسل علم کی جستجو میں بغیر کسی تعصب کے لگے رہے تو اللہ نے ان پر حقیقت کے دروا کر دیئے اور ہدایت کی روشنی عطا کر دی۔ ایسے ہی ایک شخص کا نام ڈاکٹر غلام جیلانی برق ہے۔ مدرسے کی دینی تعلیم سے جدید علوم کے سفر تک غلام جیلانی برق نے بہت سی منازل طے کیں۔ ان کا زمانہ مسلم امت پر ادبار اور مایوسی کا زمانہ تھا۔ 1901ء میں پیدا ہونے والے ڈاکٹر برق کے سامنے جنگ عظیم اول ہوئی' خلافت عثمانیہ ٹوٹی' پوری مسلم امہ پر مغربی طاقتوں کی حاکمیت اور بالادستی قائم ہوئی۔ غلامی کے اس بدترین دور میں برق صاحب کو بھی اسی نہج پر سوچنے پر مجبور کیا جیسے موجودہ دور کے مرعوب مسلمان سوچتے ہیں اور یہ تصور کر لیتے ہیں کہ انسان کی زندگی کا صرف اور صرف ایک مقصد ہے اور وہ ہے مادی ترقی۔ انہوں نے اسلام کے تصور سے روحانیت' دعا' اللہ کی نصرت اور دیگر الٰہی تصورات کی نفی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی اور پھر انہوں نے "دو اسلام"، "دو قرآن" اور "ایک اسلام" جیسی کتابیں تحریر کیں۔ وہ حدیث کے منکرین میں شامل ہوئے اور ان کا تعلق غلام احمد پرویز سے بہت گہرا ہو گیا۔ وہ مدتوں ایک ایسے اسلام کا تصور پیش کرتے رہے جو سرسید سے لے کر جاوید غامدی تک ہر دور کے سیکولر اور مادہ پرست انسانوں کو بہت پسند آتا ہے۔ لیکن شاید ان کے نیک والد کی شبانہ روز دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ اللہ نے ڈاکٹر غلام جیلانی برق کو ہدایت کے نور سے سرفراز فرمایا اور انہوں نے اپنے والد کی بیان کردہ رسول اکرم ﷺ کی حدیث "یہ دنیا مردار سے زیادہ نجس اور اس کے متلاشی کتوں سے زیادہ ناپاک ہیں" کے دفاع میں ایک پوری کتاب "من کی دنیا" 1960ء میں تحریر کی۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ اپنی سابقہ کتابوں پر نادم رہے اور اکثر کہا کرتے تھے میرا سارا کام دور جاہلیت میں لکھا گیا تھا۔ مجھے ان کے بڑھاپے اور ہدایت سے مزین زمانہ میسر آیا۔ یہ زمانہ ان کی ندامت اور شرمندگی اور اللہ سے روحانی تعلق کا زمانہ تھا۔ اسی لئے میں نے کبھی ان کے علم اور ان کی شخصیت کو ان کی گزشتہ کتابوں "دو قرآن" یا "ایک اسلام" کے حوالے سے نہیں جانچا بلکہ میرے نزدیک من کی دنیا لکھنے والا ایک روحانی غلام جیلانی برق محترم اور معزز رہا۔ وہ میرے لئے محترم تھے کہ انہوں نے من کی دنیا لکھ کر مادیت پرست دانشوروں' کالم نگاروں اور عالموں کے منہ بند کر دیئے۔ وہ لوگ جو آج ان کی کتاب "دو اسلام" کا حوالہ دیتے ہیں ان کے لئے برق صاحب کی آخری عمر میں تحریر کی گئی کتاب "من کی دنیا" کے اقتباسات لکھ رہا ہوں۔ میں نے ان میں ایک حرف کی بھی تبدیلی نہیں کی۔

"قوت کے دو ماخذ ہیں' کائنات اور دل۔ کائنات کی تسخیر علم سے ہوتی ہے اور دل کا جزیٹر عبادت اور تقویٰ سے چلتا ہے' اور مسلمان وہ ہے جو ان دونوں طاقتوں کا مالک ہو۔ روح کی قوت قومی بقا کی ضامن ہے۔ اگر یہ ختم ہو جائے تو پھر صرف مادی طاقت، خواہ وہ کتنی ہی مہیب کیوں نہ ہو' ہمیں نہیں بچا سکتی۔ قیصر و کسریٰ کی عظیم مادی طاقت کو مٹھی بھر عربوں کی روحانی طاقت نے پیس ڈالا اور ہماری تاریخ ایسے واقعات سے لبریز ہے اور جب خود مسلمان اس سرچشمہ قوت سے محروم ہو گئے تو ان کی عظیم امپائر اور مہیب عسکری قوت انہیں زوال سے نہ بچا سکی۔ آج برتری کا واحد معیار مادی اسباب و وسائل کی کثرت ہے۔ جس قوم کے پاس کائناتی قوت کے ذخائر زیادہ ہوں گے وہ زیادہ طاقتور سمجھی جائے گی۔ اگر کل دنیا میں کوئی ایسی قوم پیدا ہو جائے جو عظیم کائناتی علم اور عشق گیر جذبے سے مسلح ہو تو مجھے یقین ہے کہ روس اور امریکہ خوف سے کانپ اٹھیں گے اور عالم انسانی کی قیادت اس کے حوالے ہو جائے گی۔ یہ اعزاز پاکستان کو بھی مل سکتا ہے بشرطیکہ اہل پاکستان علم و عشق کی توانائیوں سے مسلح ہو جائیں"۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی زندگی کے آخری پچیس سال روحانیت کے سال تھے۔ انہیں اپنی تمام لکھی ہوئی کتابوں پر ندامت رہی۔ انہوں نے "میرے گیت" کے نام سے تقریباً ساٹھ اشعار نما فقرے تحریر کیے جن کا آغاز یوں ہوتا ہے "اے رب میں حریم دل میں ایمان کی جوت جگا کر اندھیروں کو باہر دھکیل رہا ہوں تاکہ تو اس میں بس سکے"، "جب احساس ندامت سے میرا آنسو ٹپکا تو کہیں سے آواز آئی' آنسو بہائے جا کہ روح کی برکھا یہی ہے"۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ جب میں روحانیت کے سفر پر نکلا تو لوگوں نے مجھے بہت طعنے دیئے یہاں تک لکھا کہ "اللہ کی شان' جو برق سیف و سناں کی طرف دعوت دیا کرتا تھا۔ وہ آج عجمی' فلاطونی اور مردہ تصوف کی تبلیغ کر رہا ہے"۔ برق صاحب کی یہ کتاب ان تمام مادہ پرست افراد کے منہ پر طمانچہ ہے جو یہ تصور لیے ہوتے ہیں کہ یہ دنیا صرف دو اور دو چار کی دنیا ہے۔ انہوں نے صرف مسلمانوں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے مذاہب کے افراد کے روحانی تجربات' حتیٰ کہ جدید مغرب کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد' الیگزینڈر کانن' ولسن چیمبر' ای سی رینڈل' جیسے دور جدید کے مفکرین کے روحانی تجربات کو بھی کتاب کا حصہ بنایا ہے۔ اپنی کتاب کے آخر میں انہوں نے ان تمام جدید مفکرین کی کتب کے نام بھی دیئے ہیں تاکہ وہ لوگ جن کو صرف مغرب کی یونیورسٹیوں کے پڑھے ہوئے لوگوں کے لکھے ہوئے پر یقین آتا ہے' وہ ان کتب کو پڑھ لیں اور جان لیں کہ صرف مادہ پرستی اور دنیا کے وسائل پر بھروسہ کرنا انسان کا بدترین تجربہ ہوتا ہے۔ پوری کتاب روحانی طاقتوں کے تصرفات پر ہے۔ تیسری آنکھ کیسے کھلتی ہے۔ کیسے انسان ہوا میں پرواز کر سکتا ہے۔ اور مختلف وظائف میں کیا تاثیر ہوتی ہے۔ برق صاحب نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی سے ثابت کیا کہ کس طرح مخصوص الفاظ کا ایک مخصوص ارتعاش (Resonance) ہوتا ہے جو کائنات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ انہوں نے اعداد کے علم سے اس بات پر بھی گفتگو کی ہے کہ اللہ کے تمام نام اپنا ایک الگ اثر رکھتے ہیں اور ان کے ورد سے کائنات پر عجیب و غریب اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کتاب کا ایک مضمون "اقبال اور دل کی دنیا" اس قدر خوبصورت ہے کہ ہر پیرا آنکھوں میں آنسو بھر لاتا ہے۔ انہوں نے اقبال کے ممدوحین کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ یہ ممدوحین سید الانبیاء ﷺ سے لے کر بو علی قلندر پانی پتی تک ہیں۔ سیدنا علیؓ سیدہ فاطمہ الزہرہؓ اور سیدنا امام حسینؓ کے بارے میں اقبال کے اشعار اور ان سے روحانی فیض اس کتاب کا حاصل ہے۔ برق صاحب کا قرآن کا علم اس کتاب میں یوں جھلکتا ہے اور ایسے لگتا ہے کہ وہ نیت باندھ کر یہ کتاب اس لئے لکھنے بیٹھے تھے جیسے وہ اپنے دور کے مادہ پرست دانشوروں کو اسلام کی روحانی روشنی دکھا رہے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کتاب کے سرورق پر اقبال یہ شعر تحریر کیا ہے۔

عقل دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع ودیں بتکدۂ تصورات

غلام جیلانی برق کی اس کتاب "من کی دنیا" کا یہ اقتباس اس دانشور کالم نگار دوست کی نذر کر رہا ہوں جس نے ان کی زمانہ جاہلیت کی کتاب سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا صرف اور صرف مادہ پرستی ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق صاحب نے کس خوبصورتی سے اس دنیا کو اپنے نیک اور دیندار باپ کی بیان کردہ حدیث کے مطابق صرف اور صرف مادہ اور نجس ثابت کیا ہے۔

"دولت فراہم کرنے کے لئے ہر انسان کا قدم اس تیزی سے اٹھ رہا ہے گویا کتے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اس راہ میں نہ وہ کسی رکاوٹ کی پرواہ کرتا ہے اور نہ کسی عصبیت کو خاطر میں لاتا ہے۔ آج کراچی میں تو کل لندن اور پرسوں واشنگٹن۔ سفر عین راحت اور کلفت عین مسرت۔ اگر کسی چیز میں دو سال بعد چار آنے کا فائدہ دیکھے تو اسے آج خرید کر گوداموں میں بھر لیتا ہے۔ جس بچے نے سولہ سال بعد ایم اے کر کے نوکری کرنا ہو اسے سولہ سال تک درس گاہوں میں بھیجتا اور اس کے مصارف برداشت کرتا ہے۔ عارضی جسم کی عارضی ضروریات کے لئے تو ہماری دوڑ دھوپ کا یہ عالم ہے' لیکن جس روحانی جسم نے ان گنت صدیوں تک زندہ رہنا ہے۔ اس کی پروا نہیں' آخر منصوبہ بندی کی یہ کونسی قسم ہے؟ کیا شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں سے روحانی نشوونما کے لئے آپ ایک گھنٹہ بھی نہیں نکال سکتے۔ کیا روح کی زندگی سے آپ کو اتنی چڑ ہے؟ کیا آپ کو جنت کی بہاروں سے اتنی نفرت ہے؟"۔ اس مادہ پرستی کے بدترین انجام پر برق صاحب نے اقبال کا یہ شعر درج کیا ہے

دوزخ کی کسی طاق پہ افسردہ پڑی ہے
خاک سترا اسکندر و دارا و ہلاکو

اسلامی بینک ۔ حیلہ بینک

بنی اسرائیل ایک ایسی قوم ہے جس پر اللہ نے بار بار ذلت و مسکنت مسلط کی اور بار بار اپنے عذاب کا مزا چکھایا۔ قرآن پاک کے ایک چوتھائی حصے سے بھی زیادہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہودیوں کی حیلہ سازیوں 'مکروفریب' دجل و مکاری اور احکامات الٰہی کے انکار کے بارے میں بتایا ہے۔اس میں علماء یہود کے قصور اس قدر گھناؤنے تھے کہ اللہ کو ان پر لعنت بھیجنا پڑی۔ فرمایا: جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں۔ حالانکہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لئے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو اللہ بھی ان پر لعنت بھیجتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ (البقرہ 160) یہ لوگ کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے تھے اور دوسرے حصے سے دنیاوی مفادات کی بنیاد پر انکار کرتے تھے 'فرمایا: تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو' پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں گے 'ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں۔ (البقرہ 85) یہودیوں پر ایک عذاب ایسا بھی آیا کہ وہ بندر بنا دیئے گئے۔ یہ عذاب اس وجہ سے آیا کہ انہیں ہفتے کے دن شرعی حیلہ کرنے سے منع کیا گیا تھا، لیکن وہ حیلے تراشتے اور طرح طرح کے طریقے ڈھونڈتے تاکہ اللہ کے اس حکم کا انکار بھی ہو جائے اور شرعی طور پر ان پر کوئی حرف نہ آئے۔ ہفتے کے روز دریا میں مچھلی پکڑنے پر ممانعت تھی۔ یہود نے بڑے بڑے تالاب بنائے تھے جن کی طرف پانی کا رخ موڑ دیتے۔ وہاں مچھلی آکر پھنس جاتی اور یوں وہ اسے اگلے دن پکڑ لیتے اور باقی اضافی مچھلی کا شکار بھی ہوتا رہتا۔ ''پھر تمہیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ تو معلوم ہی ہے جنہوں نے ہفتے کے دن کاروبار نہ کرنے کا قانون توڑا ہم نے انہیں کہہ دیا کہ ہو جاؤ بندر اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر پھٹکار پڑے''۔ (البقر 66) حیلہ سازی و بہانہ بازی اور مختلف طریقوں سے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات سے روگردانی کا راستہ نکالنا علمائے یہود کا خاصا تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی امت کے بارے میں ایسے ہی ایک خطرے سے آگاہ فرمایا ''تم پہلی امتوں کی اسی طرح پیروی کرو گے جس طرح بالشت بالشت کے برابر اور گز گز کے برابر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ لوگ گوہ کے سوراخ میں گئے ہوں گے تو تم ان کی پیروی کرو گے۔ ہم لوگوں نے عرض کیا' یارسول اللہ کیا یہود و انصاریٰ کی پیروی کریں گے' آپ ؐ نے فرمایا کہ اور کون ہو سکتا ہے۔ (متفق علیہ)۔ یہی ہماری روش ہے کہ ہمارے بعض علماء بھی ویسے ہی حیلہ سازی کے ذریعے اللہ کے احکامات سے روگردانی کا راستہ نکالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان جس کے آئین میں سود کو ختم کرنے کی ذمہ داری حکومت کی ہے اس کے صدر ممنون حسین کو یہ جرأت ہوتی ہے کہ وہ علماء سے کہتے ہیں کہ ہاؤس بلڈنگ کے قرضے پر سود کی ادائیگی کے لئے راستہ نکالیں۔ ہاؤس بلڈنگ کے قرضے حکومت کے زیر انتظام دیئے جاتے ہیں اور صدر محترم اپنے ماتحت محکمے کو سود سے منع نہیں کر سکتے لیکن علماء سے کہتے ہیں کہ کوئی راستہ نکالیں۔ یعنی حکومت تو یہ حرام کھاتی رہے گی، آپ دینے والوں کی تسلی کے لئے کوئی راستہ نکالو۔ یہ توقع علماء سے کیوں لگائی گئی۔ اس لئے کہ اس مملکت خداداد پاکستان کے کچھ علماء نے ایک ایسے بینکاری نظام کو حیلوں کے ذریعے اسلامی بنا کر پیش کیا جس کی ساری اساس ہی سودی نظام پر ہے۔ جب سپریم کورٹ نے اپنے تاریخ ساز فیصلے مورخہ 23 دسمبر 1999ء میں بینکاری سود کو حرام قرار دیا تو اقتدار کے ایوانوں میں ہل چل مچ گئی۔ فوری طور پر جو پالیسی ترتیب دی گئی اس کے اہم ستون یہ تھے۔ 1۔ عدالتوں کے ذریعے سود کے حرام ہونے کو متنازعہ رکھا جائے تاکہ پوری قوم کنفیوژن کا شکار رہے۔ 2۔ حکومت عدالت میں یہ مؤقف اختیار کرے کہ اسلام نے تو اصل میں رباء کو حرام قرار دیا جبکہ بینکاری سود تو رباء ہے ہی نہیں۔ 3- موجودہ جدید بینکاری کی طرز پر ایک اسلامی بینکاری نظام قائم کیا جائے جو سودی نظام کے شانہ بشانہ چلتا رہے اور جسے اسلامی قرار دینے کے لئے شریعہ ایڈوائز مقرر کیے جائیں۔ یوں ایک ہی بینک لوگوں کو یہ سہولت دے کہ اگر وہ چاہیں تو اسلامی بینکاری کے تحت اکاؤنٹ کھولیں یا عام بینکاری کے تحت۔ یعنی چاہے تو اس بینک کی دکان سے حرام کاروبار کریں یا حلال۔ یہ ایسے ہی ہے کہ ایک قصاب کی دکان پر خنزیر اور بکری کا گوشت بیک وقت دستیاب ہو۔ اس وقت 22 اسلامی بینک بیک وقت یہ سہولت فراہم کر رہے ہیں اور ان بینکوں میں بیٹھے شریعہ ایڈوائزر اور مفتیان کرام خاموش ہیں بلکہ سٹیٹ بینک کا شریعہ ایڈوائزی بورڈ بھی خاموش ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک قصاب کی دکان پر خنزیر کا گوشت بھی بک رہا ہو اور آپ کہیں کہ میں تو اس بات کی تنخواہ لیتا ہوں کہ یہاں بکری کا گوشت خالص ہے یا نہیں۔ اگر اسلامی بینکاری واقعی حلال ہے تو مروجہ بینکاری کو بند کیوں نہیں کرتے۔ سب کچھ تو ویسا ہی ہے 'عمارت' چیک بک 'اے ٹی ایم کارڈ' قرضہ سکیمیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہم نے ہی تو حیلہ سازی سے انہیں قائم رکھا ہوا ہے۔ صرف ایک شرعی حیلہ بیان کر دوں۔ اجارہ سکوک' یہ ایک طرح کے بانڈ کی قسم ہے۔ مثلاً واپڈا اگر ایک ڈیم بنانا چاہتا ہے تو وہ اپنے ڈائریکٹروں کی ایک کمپنی بنائے گا جسے SPV یعنی Siecial Purpose Vehicle کہتے ہیں۔ یہ کمپنی اس ڈیم کی عالمی کنسل ٹیسٹ سے قیمت لگوائے گی جسے Valuation کہتے ہیں۔ یہ قیمت اسلامی بینک اجارہ سکوک کی انوسٹمنٹ کے ذریعے ادا کر دیں گے جس سے وہ ڈیم بنے گا۔ اب یہ کمپنی جو اسی ادارہ کے ڈائریکٹروں پر مشتمل ہوگی 'ڈیم کو واپڈا کو استعمال کرنے کے لئے دے گی۔ اب واپڈا سے جو رقم کمپنی حاصل کرے گی اسے سود نہیں کرایہ کہا جائے گا۔ اس پر سب سے مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ ہر صبح اس ڈیم کا کرایہ سودی بینکوں کے سود کی شرح ناپنے کے نظام KIBOR یا LIBOR کے ذریعے ادا ہو گا۔ یعنی جس دن شرح کم اس دن کرایہ کم اور جس دن شرح زیادہ اس دن کا کرایہ زیادہ۔ کیا خوبصورت نفع اور نقصان کی حصہ داری نکالی ہے۔ کیا کسی عالم دین نے اپنا مکان کرائے پر دیا ہے اور ہر روز اس کا کرایہ KIBOR یا LIBOR کے ریٹ دیکھ کر وصول کرتا ہو۔ پوری کی پوری اسلامی بینکاری حیلہ سازی پر مبنی ہے جسے اسلامی بینکاری تو نہیں حیلہ بینکاری کہا جا سکتا ہے۔

لیکن اس حیلے کے بعد جو سب سے بڑا فریب اب ہونے جا رہا ہے وہ ایسا ہے جو پورے کے پورے اسلامی بینکاری کے نظام کو سودی مال سے تر کر دے گا اور اس کی منظوری اسٹیٹ بینک کے شریعہ ایڈوائزی بورڈ نے دے دی ہے۔ شاہد حسن صدیقی صاحب نے اس خطرناک فیصلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ دن پہلے تحریر کیا تھا ''سٹیٹ بینک اسلامی بینکوں سے سکوک کی مدت ختم ہونے کے قریب انہیں خرید کر مارکیٹ سے اربوں روپے وصول کرتا ہے پھر یہ رقم اوپن مارکیٹ میں سودی بینکوں کو فراہم کر دی جاتی ہے: ''سٹیٹ بینک اسے بیع مؤجل کہتا ہے۔ اس طرح کھاتے دار جو رقم اسلامی بینکوں میں پہنچاتے ہیں وہ خود بخود سودی بینکوں میں پہنچ جاتی ہے اور اس کی سود کی آمدنی سے جو منافع اسلامی بینک حاصل کرتے ہیں اسے خالصتاً اسلامی کہہ کر کھاتے داروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اب تو خنزیر اور بکری کا گوشت بھی ایک کر دیا گیا ہے۔ حرام و حلال ایک جگہ ایسے گڈمڈ کر دیئے کہ پہچاننا مشکل ہے لیکن میرے لئے حیرت کی بات یہ ہے کہ سٹیٹ بنک کے شریعہ ایڈوائزی بورڈ جس میں ہر مسلک کے علماء شامل ہیں اس نے اس کی منظوری دے دی اور پوری امت کے علماء اس پر چپ ہیں' خاموش ہیں' مہر بہ لب ہیں۔ شاید انہیں اس بات کی سنگینی کا احساس نہیں یا پھر انہوں نے سورہ بقرہ کی ان آیات کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ سود اللہ اور اس کے رسول ؐ کے خلاف جنگ کا اعلان ہے۔ مکمل انکار کرنے والوں' اللہ اور اس کے رسول ؐ کے منکروں کا معاملہ تو اللہ روز قیامت پر چھوڑتا ہے لیکن جو اسے مانتے ہیں اور پھر حیلہ سازی 'مکروفریب' دجل و ریاکاری اور منافقت کے ذریعے اس کے احکامات میں دنیاداری کی گنجائش نکالتے ہیں تو ان پر آنے والے دردناک عذابوں سے قرآن کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ شاید ہم کسی بڑے عذاب کو آواز دے رہے ہیں۔ جو اللہ ایک شدت والے زلزلے سے ہمیں خوفزدہ کر سکتا ہے، وہ زمین کو مزید جنبش بھی دے سکتا ہے تاکہ ہم عبرت کے نشان بنا دیئے جائیں۔

اضطراب بے چینی مایوسی

چہروں پر کرب' ماتھے سلوٹوں سے بھرے ہوئے' مضطرب' پریشان' کوئی ناخنوں کو دانتوں سے کاٹ رہا ہے تو کوئی مسلسل اپنی ٹانگیں ہلائے چلے جا رہا ہے' اچھا خاصا ذہین اور بذلہ سنج آدمی لیکن بھری محفل میں بیٹھے ہوئے خود سے باتیں کرنے لگ جاتا ہے' کسی جگہ آرام سے چل رہا ہو گا تو اچانک دوڑ پڑے گا۔ آپ کو یہ سب اس اضطراب کے دور میں عام نظر آ رہا ہو گا۔ یہ تو وہ علامتیں ہیں جو آپ دیکھ پاتے ہیں۔ یہ ان انسانوں کو پریشانیوں سے پیدا ہونے والی کیفیت کی ایک معمولی سی جھلک ہے۔ لیکن اگر آپ کو ان کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کا اتفاق ہو جائے تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ یہ لوگ پریشانی اور اضطراب کے عالم میں کس قدر خوفناک زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی نیند ٹوٹی پھوٹی اور بہت کم ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات تو ہزار کوشش سے انہیں نیند آتی ہی نہیں' بلاوجہ غصہ اور چڑچڑاہٹ' ایسے شخص سے لڑ پڑتے ہیں جس کا کوئی قصور تک نہ ہو یا ایسی بات پر غصہ کر جاتے ہیں جسے ہنس کر ٹال دینا چاہیے تھا۔ کوئی پریشانی کے عالم میں معدے کی تیزابیت کا شکار ہو جاتا ہے تو کسی کو ابھارے کی ایسی شکایت ہوتی ہے کہ سانس حلق میں اٹک جاتا ہے۔ کسی کے ہاتھوں اور پاؤں میں مستقل پسینہ آنے لگتا ہے تو کوئی شدید بلڈ پریشر یا فشار خون کے ہاتھوں پریشان۔ یہ تو صرف چند علامات ہیں جو انہیں پریشانیوں کی وجہ سے لاحق ہیں ورنہ امراض کی ایک فہرست ہے جو نفسیاتی اضطراب' بے چینی اور پریشانی سے جنم لیتی ہیں۔ یہ موجودہ دور کا المیہ ہے۔ موجودہ صدی جسے ''اضطراب کی صدی'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ اضطراب ہمارے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ ہم پریشان ہیں' مضطرب ہیں اور یہ سب کچھ ہمارے چہروں سے عیاں ہے۔ آپ بس' ٹرین یا رکشہ میں سفر کرتے لوگوں کو دیکھیں' دفتروں میں کام کرتے بابوؤں یا دفتروں کے باہر عرضیاں ہاتھ میں لیے سائلوں کو دیکھیں' ہسپتال کے ہجوم یا عدالتوں کی راہداریاں۔ ان تمام جگہوں پر جو خلقت آپ کو نظر آئے گی اس کے چہرے سے اضطراب' پریشانی اور ہیجان نمایاں ہے۔ یہاں تک کہ تفریح گاہوں میں موجود لوگ یوں تو سیر کر رہے ہوتے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ سیر بھی ان کی پریشانی کم نہیں کر سکی۔ بلند قہقہے اور مسکراتے چہرے اب اس ملک میں خال خال دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اضطراب اور بے چینی ہمیں حالات نے تحفے میں دی ہے۔ ہم روز اپنے پیاروں کو مرتے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن ان کی زندگی بچانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ ہمارے سامنے حادثے ہوتے ہیں' بم پھٹتے' جسموں کے پرخچے اڑتے ہیں' ہم کسی لچے' لفنگے اور بدمعاش کی آمد کے خوف سے بھی کانپتے رہتے ہیں کہ وہ کس وقت آن دھمکے اور بھتے کا مطالبہ کر دے۔ ہم یا ہمارے پیارے بیمار ہیں۔ بیروزگار ہیں' بے سروسامان ہیں۔ ہم یہ سب بھی خاموشی سے سہہ لیتے اگر ہمیں یقین ہوتا کہ سب کچھ بدلا ہی نہیں جا سکتا یا یہ ہمارا مستقل مقدر ہے۔ لیکن ہمارے سامنے اربوں روپے کی خوبصورت چمکتی گاڑیاں ان لوٹنے والے کے نیچے آ جاتی ہیں جن کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ انہوں نے ہمارا مال لوٹا ہے۔ ہماری دولت صرف ووٹ لینے کے لئے' چمکتی موٹروے یا مغربی دنیا کی ہم پلہ میٹرو بس پر خرچ کر دی جاتی ہے اور ہماری حالت یہ ہوتی ہے کہ ہمیں دنیا بھر کے دکھوں کے درمیان بیس روپے کی ایک شاندار چیئر لفٹ کی طرح کا جھولا مل جاتا ہے۔ اس سے ہمارے دکھ' بے چینی اور اضطراب تو ختم نہیں ہوتا۔ ہمارے چہروں پر لٹے جانے اور غربت و افلاس کا اضطراب ہے اور اعلیٰ طبقات کے چہروں پر جرم اور بددیانتی سے جنم لینے والی اضطرابی حالت ہے۔ ہم سب بے چین' مضطرب' پریشان اور کرب زدہ ہیں' ہم سے مسکراہٹیں روٹھ گئی ہیں اور ہماری نیندیں چھن چکی ہیں۔

لیکن اس ساری بے چینی نے ہم سے ہمارا ایک رویہ ہم سے چھین لیا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے جسمانی طور پر بھی علیحدہ ہوتے جا رہے ہیں ہم بحیثیت قوم اب مصافحہ بہت کم کرتے ہیں' گلے بہت کم ملتے ہیں' ہمارے بچے لمس سے محروم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم اپنے بزرگوں کا حال احوال بھی دور سے کرتے ہیں' انہیں چھوتے تک نہیں۔ ہم لوگوں کو مصیبت میں گلے لگا کر ان کے غم کو کم کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہم ایک دوسرے سے جسمانی طور پر یوں دور ہیں جیسے کسی چھوت کے مریض سے خوفزدہ ہوں۔ سید الانبیاء ﷺ کی اس حدیث پر غور کرتا ہوں تو موجودہ دور کے اس المیے کا حل معلوم ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''جب دو مسلمان ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں تو جب تک وہ ہاتھ ملائے رکھتے ہیں ان کے گناہ جھڑتے رہتے ہیں''۔ میں مدتوں اس حدیث پر غور کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ انسانوں کا لمس انسان کو کس قدر سکون اور اطمینان پہنچا سکتا ہے۔ ہاتھ ملانے سے بھی زیادہ اہم چیز معانقہ یعنی گلے ملنا ہے جو ہم عید کے روز بھی بہت کم کرتے ہیں۔ کسی کو دکھ میں گلے مل کر دلاسہ بھی نہیں دیتے۔ ہم اپنے بچوں کو بھی اپنی محبت سے اس لئے محروم رکھتے ہیں کہ ہم ان کو بار بار گلے نہیں لگاتے' نہ وہ ہمیں جوش محبت میں چمٹتے ہیں۔ میڈیکل سائنس نے گلے ملنے کے جو فوائد بتائے ہیں اس کی تفصیل اس قدر طویل اور اس کے انسانی صحت پر اثرات اسقدر زیادہ ہیں کہ اس دور اضطراب میں ہمیں صرف ایک دوسرے کو اس انسانی جذبے کو عام کرنا چاہیے۔ نفسیاتی معالج کہتے ہیں کہ ہمیں زندہ رہنے کے لئے دن میں ایک بار گلے ملنا ضروری ہے' صحت کو برقرار رکھنے کے لئے کم از کم آٹھ بار اور صحت کی بہتری کے لئے کم از کم 12 بار گلے ملنا چاہیے۔ ایک ہارمون جس کا نام Oxytocin ہے جو ذہن کے جذباتی مراکز سے جنم لیتا ہے جس سے پریشانی' اضطراب اور بے چینی کا خاتمہ ہوتا ہے اور آدمی میں قناعت آتی ہے۔ عورت جب بچہ پیدا کر رہی ہوتی ہے تو یہ ہارمون تھوڑی سی تعداد میں نکلتا ہے اور وہ تمام دکھ درد بھول کر بچے کو پیار کرنے لگتی ہے۔ جدید تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ جب محبت میں ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں گلے ملتے ہیں تو یہ ہارمون نکلتا ہے اور ہمیں سکون ملتا ہے۔ اس ہارمون کی وجہ سے ہم میں صبر کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے' اس سے ہم میں امراض سے مدافعت کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہمارے ThymusGland کو بہتر کارکردگی پر مجبور کرتا ہے اور بلڈ پریشر کم کرتا ہے۔ نفسیات دان کہتے ہیں کہ بچوں کو گلے لگانے سے ان میں عزت نفس پیدا ہوتی ہے۔ گلے ملنے سے DOPAHIN ہارمون کو تحریک ملتی ہے اور وہ ہمیں ہر طرح کی نفسیاتی امراض سے نجات دیتا ہے۔ یہ قوم جو ایک دوسرے سے اتنی دور ہو چکی ہے' اتنی پریشان اور مضطرب ہے۔ کیا وہ سید الانبیاء ﷺ کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے محبت سے ایک دوسرے کا ہاتھ بار بار نہیں تھام سکتی کہ دنیا میں وہ بہتر زندگی گزارے اور آخرت میں اس کے گناہ کم ہوں۔

جدید نظام تعلیم، جعلی ڈگریاں اور کارپوریٹ اخلاقیات

دنیا بھر میں رائج جدید نظام تعلیم جسے مغربی تہذیب کی سب سے بڑی کامیابی تصور کیا جاتا ہے‘ اس کا کمال یہ ہے اس نے طالب علم کا رشتہ استاد سے صرف علم کی ترسیل تک محدود کر دیا ہے جبکہ اس ساری تعلیم کا دارومدار کمرہ امتحان‘ سوالنامہ‘ قابلیت اور اہلیت ناپنے کے پیمانے اور اس کے نتیجے میں ملنے والی ڈگری کو علم کی معراج تصور کیا جاتا ہے۔ اس ڈگری کی قدرو قیمت بھی کسی طالب علم کے علمی مرتبے کی اس وقت تک پہچان نہیں بنتی جب تک اس ڈگری کو مارکیٹ میں سرمائے میں تولا نہ جائے۔ ڈگری کی اہمیت اور قدرو منزلت سرمائے سے منسلک ہے۔ آپ انسانی معاشرت‘ ادبی تاریخ‘ مابعد الطبیعاتی فلسفہ جیسے اعلیٰ موضوعات پر بہترین یونیورسٹیوں سے ڈگری لے کر آ جائیں‘ دنیا بھر میں جوتیاں چٹخاتے پھریں گے‘ جبکہ اس کے مقابلے میں مارکیٹنگ جیسے سطحی مضمون میں معمولی سا ڈپلومہ بھی آپ کو لکھ پتی بنا سکتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں بیس سے زیادہ تہذیبوں نے اپنے نظام تعلیم بنا کر رائج کیے۔ ان سب میں علم کا مقصد بنیادی طور پر علم کا حصول تھا اور ایک استاد اس بات کا اعلان کرتا تھا کہ میں نے اپنے اس شاگرد کو مکمل علم سکھا دیا ہے اور اب یہ اس سے انسانیت کو فیضیاب کر سکتا ہے۔ دنیا میں کسی بھی تہذیب کے مدرسوں میں پہلی‘ دوسری اور تیسری پوزیشن کی جنگیں طلبا کے اعصاب پر سوار نہیں کی جاتی تھیں۔ استاد‘ شاگرد اور تعلیمی ادارے کا تعلق آخری عمر تک قائم رہتا۔ جدید مغربی نظام تعلیم سے قبل دنیا کی تمام بڑی بڑی ایجادات‘ تصنیفات اور علمی موضوعات پر کام تعلیمی اداروں میں ہوا۔ لیکن جدید مغربی نظام تعلیم نے کاغذ کے اس ٹکڑے جسے ڈگری‘ ڈپلوما یا سرٹیفکیٹ کہتے ہیں‘ اس کے حصول کے بعد طالب علم کو مارکیٹ کے کھلے سمندر میں پھینک دیا گیا جہاں وہ اپنے حاصل کیے گئے علم کو مارکیٹ کی اخلاقیات کے تابع کر کے استعمال کرتا ہے۔ مارکیٹ کا تعلق بھی کسی تعلیمی ادارے سے نہیں بلکہ ڈگری‘ ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ تک محدود ہے اور ان ڈگریوں کی اصل کو جانچنے کیلئے بھی ایک ادارہ یا کئی ادارے موجود ہیں جو کسی استاد سے یہ سوال نہیں کرتے کہ تمہارا یہ شاگرد علمی استعداد میں کیسا تھا بلکہ ڈگری پر لگی مہر‘ دستخط اور ریکارڈ کے درست ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ ہے جدید نظام تعلیم کا شاندار خوبصورت کاغذ جسے ڈگری کہتے ہیں اور ان کے گرد گھومتا ہے جدید تصورِ علم‘ ڈگریوں کی مارکیٹ میں کھپت اور قیمت اور اس پر مبنی جدید معاشرہ۔

چونکہ پوری دنیا کا کارپوریٹ کلچر اپنی بددیانتی‘ بے ایمانی‘ دھوکے اور فراڈ کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے‘ اس لئے یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اس کے تعلیمی نظام میں کام کرنے والے دیانت اور ایمانداری کے پرتو ہوں۔ اسی لیے جہاں دنیا بھر میں یونیورسٹیوں کا جال بچھا ہوا ہے جو تعلیم کے بعد ڈگریاں دیتی ہیں وہیں ان سے کہیں زیادہ ایسے ادارے موجود ہیں جو جعلی ڈگریاں بناتے اور بیچتے ہیں۔ امریکہ میں انہیں ”ڈپلوما ملز DiplomaMills“ کہا جاتا ہے۔ چونکہ بددیانت کارپوریٹ معاشرے کو ان جعلی ڈگریوں کی ضرورت ہے‘ اس لئے امریکہ میں ایجوکیشن ایکٹ 1965ء کے تحت اعلیٰ تعلیم کو دیکھنے‘ جانچ پڑتال کرنے‘ اداروں کے معیار کو پرکھنے کا کوئی مربوط نظام موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں جعلی ڈگری بیچنے والی یونیورسٹیوں کا بازار لگا ہوا ہے۔ جنوری 2010ء میں سی این این نے جارج گولن GeorgeGollin کا تفصیلی انٹرویو کیا۔ یہ شخص امریکہ کی ہائر ایجوکیشنل کونسل کا رکن ہے۔ اس نے کہا کہ امریکہ میں ہر سال ایک لاکھ جعلی ڈگریاں بیچی جاتی ہیں جن میں سے 35 ہزار کے قریب ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں ہوتی ہیں۔ جعلی ڈگری بنانا اور بیچنا اسقدر آسان ہے کہ آپ کو صرف ایک ویب سائٹ بنانا ہوتی ہے‘ جہاں ایسے ڈپلوما اور ڈگریاں بنا کر بیچے جا سکیں‘ جن پر اصل کا گمان ہو اور ایسی یونیورسٹیاں کاغذی طور پر تخلیق کی جائیں جو اصلی معلوم ہوں۔ ان ڈگریوں کے خریدار ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ نوکری لینے والے‘ نوکری میں پروموشن لینے والے‘ دوستوں پر رعب ڈالنے والے‘ سیاست میں الیکشن لڑنے کے لئے اپنا پروفائل بہتر بنانے والے۔ گولن نے "SaintRigis" کی مثال دی جس نے نو ہزار چھ سو ڈگریاں بیچ کر سات ملین ڈالر کمائے۔ اس نے مثال دی کہ ایک امریکی نے نیوکلئر انجینئرنگ کی ڈگری ایسے ہی ایک ادارے سے حاصل کی اور وہ اب ایک نیوکلئر پلانٹ کے کنٹرول روم میں کام کر رہا ہے۔

اس وقت امریکہ میں چار سو ڈپلوما ملز کام کر رہی ہیں اور تین سو جعلی ڈگری بنانے والی ویب سائٹس آزادانہ اپنا کاروبار کر رہی ہیں۔ یہ کاروبار پانچ سو ملین ڈالر پر محیط ہے۔ اسی طرح یورپ کے جعلی تعلیمی ادارے اور ویب سائٹس 50 ملین ڈالر لے کر ہر سال 15 ہزار افراد کو تعلیمی اسناد دیتی ہیں۔ دنیا کے ہر شعبہ میں اور ہر بڑے ملک میں یہ جعلی ڈگری کے حامل کام کر رہے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر بھی ہیں اور انجینئر بھی‘ نفسیات دان بھی اور سائنس دان بھی۔ ایسے ڈپلوما اور ڈگری بیچنے والوں پر جب مقدمہ چلا تو ان کے دلائل اس پورے موجودہ نظام تعلیم کارپوریٹ معاشرے کی ہنسی اڑا رہے تھے۔ ان کے وکیلوں نے کہا ”ہم نے کبھی کسی یونیورسٹی ڈگری کی نقل نہیں بنائی یہ الگ بات ہے کہ ہماری ڈگریاں اصل سے ملتی جلتی ہیں‘ ہم نے کسی کے جعلی دستخط نہیں بنائے‘ ہمارے اپنے دستخط کرنے والے ہیں۔ ہمارے پاس چار لاکھ ایسے ڈیزائن ہیں جو اصلی ڈگریوں سے بھی زیادہ خوبصورت اور جاذب نظر ہیں“۔ امریکہ کا 1980ء کا "Dipscam" آج بھی جعلی ڈگریوں کا سب سے بڑا سکینڈل تصور کیا جاتا ہے۔ اسی زمانے میں امریکہ کی ریاست وائمنگ "Wyoming" ان ڈپلوما ملز کی آماجگاہ تھی۔ اسی دور میں ٹیکساس کے ایک سرکاری وکیل نے اپنی بلی کولبی نولن "ColbyNolan" کے لئے ایسی ہی ایک یونیورسٹی ٹرنٹی ساوتھرن یونیورسٹی سے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس بلی نے بی اے کی ڈگری کے لئے درخواست جمع کروائی لیکن یونیورسٹی نے اس کی اعلیٰ کارکردگی کی بنیاد پر اسے ایم بی اے کی ڈگری دے دی۔ 2004ء میں امریکہ کی ہوم لینڈ سکیورٹی کی رکن لارا کولاہان LauraCollahan سے استعفےٰ لے لیا گیا کیونکہ اس کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری ایسی ہی ایک جعلی یونیورسٹی ”ہملٹن یونیورسٹی“ سے تھی جبکہ اصل یونیورسٹی کا نام اس سے ملتا جلتا ”ہملٹن کالج“ تھا۔ 1980ء سے لے کر آج تک ان ڈپلوما ملز کا دھندا پورے یورپ اور امریکہ میں چل رہا ہے۔ وہ امریکہ اور یورپ جو شک کی بنیاد پر لوگوں کو سالوں قید میں ڈال دیتا ہے۔ جعلی کرنسی‘ جعلی ویزوں اور جعلی پاسپورٹ پر بدترین سزائیں دیتا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف ایسے قانون بناتا ہے کہ عام آدمی کا بھی جینا مشکل ہو جائے وہاں ایسی ویب سائٹس اور ایسی یونیورسٹیوں کو کیوں چلنے دیا جاتا ہے‘ ان کے لئے سخت قانون کیوں نہیں بنائے جاتے۔ اس لیے کہ یہ جعلی ڈگریاں اور ڈپلومے نوے فیصد سے زیادہ امریکی اور یورپی حاصل کرتے ہیں اور پھر جب امریکی اور یورپی کمپنیاں افریقہ‘ ایشیا‘ مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں کام کرنے آتی ہیں تو اپنے ساتھ ایسے ہی جعلی ڈگری اور ڈپلوما والے افراد کو لے کر آتی ہیں۔ اصل ڈگری والے امریکہ اور یورپ میں کام کریں گے اور جعلی ڈگری والے ایشیا اور افریقہ میں۔ یہ ہے معیار۔ جنوری 1997ء میں ایشیائی ترقیاتی بنک ہیڈ کوارٹر منیلا میں مجھے بحیثیت ایم ڈی واسا بلوچستان کیلئے ایک اعلیٰ سطح کے "ContractNegociation" میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ کوئٹہ میں پانی اور سیوریج کے لئے ایک کنسلٹنٹ مقرر کرنے کے لئے میٹنگ تھی۔ یہ میٹنگ سات روز تک چلنا تھی لیکن وہ امریکی فرم جس کے ساتھ معاہدہ ہونا تھا اس کے نمائندے نے دو روز بعد کی ٹکٹ بک کروائی ہوئی تھی۔ میں نے حیران ہو کر بینک کے ڈائریکٹر سے سوال کیا‘ اس نے ایسا کیوں ہے۔ کہنے لگا آپ آج ہی دستخط کر دو اور باقی چھ دن عیاشی کرو‘ سب پاکستانی ایسا ہی کرتے ہیں۔ میں نے انکار کیا اور فرم سے اس کے سٹاف کے پروفائل مانگ لیے جنہوں نے پاکستان میں کام کرنا تھا۔ تین دن کمپیوٹر پر بیٹھنے کے بعد مجھے علم ہوا کہ ان میں نوے فیصد اسی طرح کی جعلی ڈگریوں والے ہیں۔ پانچویں روز جب میں نے اس امریکی فرم کے نمائندے کے سامنے یہ سارا کچا چٹھا رکھا تو اس کا فقرہ تھا۔

"Itiscommercialsuicideworkingwiththisman" (اس شخص کے ساتھ کام کرنا تجارتی خودکشی ہے) اور یہ کہتا ہوا میٹنگ چھوڑ کر چلا گیا۔ میں ناکام واپس آیا‘ لیکن ایک کامیابی تھی کہ میرا ملک ایک بدترین قرض سے بچ گیا۔ ان جعلی ڈگریوں اور ڈپلوموں کی کھپت ہمارے جیسے ملکوں میں ہے اور اس کو خریدنے والے امریکی اور یورپی شہری ہیں۔ کس قدر بودا اور ناکارہ ہے یہ نظام تعلیم جو علم کو پہلے کاغذ کے خوبصورت ٹکڑے سے ناپتا ہے اور پھر مارکیٹ میں اس کی قیمت کے مطابق اس کی عزت کرنا سکھاتا ہے۔ انسانی تہذیب و تاریخ میں اس سے بدترین نظام تعلیم بھی کبھی رائج رہا ہے؟

خوف بیچنے والے

دنیا میں خوف ایسی چیز ہے جسے سب سے آسانی کے ساتھ بیچا جا سکتا ہے اور پھر موت کا خوف۔ موت تو ایک ایسی اٹل سچائی ہے کہ جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ انسان کی ساری جدو جہد اور تگ ودو اس موت کے عفریت پر قابو پانے پر لگی ہوئی۔ فلاں ملک اس لیے ترقی یافتہ ہے کیونکہ وہاں افراد کی اوسط عمر بہت زیادہ ہے۔ وہاں سیلابوں اور زلزلوں سے بچنے کے انتظامات بہت خوب ہیں۔ بڑھاپے پر قابو پانے، جوان رہنے، بیماریوں اور متعدی امراض سے بچنے کے لیے تحقیقات کا آخری نقطہ اور منزل یہ ہے کہ آدمی موت پر کیسے قابو پاتا ہے، لیکن انسان کی لاکھوں سال کی اس جدو جہد پر ہر دوسرے لمحے موت ایک طمانچہ رسید کرتی ہے۔ فاتحانہ طور پر اپنی مرضی کے شخص کو ساتھ لے جاتی ہے اور پوری انسانی جدو جہد کو ماتم کرتا چھوڑ جاتی ہے۔ یہ ہے موت اور اسی موت کا خوف جب کسی شخص کے دل میں گھر کر جاتا ہے تو پھر آپ اسے موت سے بچنے کے لیے مٹی بھی بیچیں تو وہ سونے کے مول خریدے گا اور اگر موت کا یہ خوف کسی قوم یا قبیلے میں رس بس جائے تو ان کی حالت اس بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہو جاتی ہے جنہیں گلے میں رسی ڈال کر جس طرف چاہے ہانک دو۔

لیکن موجودہ دور کا کمال یہ ہے کہ اس نے موت کے خوف کو کاروبار بنا لیا ہے۔ پہلے لوگوں کے سروں پر ایک انجانے خوف کی تلوار لٹکائی جاتی ہے اور پھر اس تلوار کے وار سے بچنے کے لیے بنائے گئے بندوبست کو مہنگے داموں بیچا جاتا ہے۔ موت کا بے دلیل قسم کا خوف ایسی بلا ہے کہ آدمی گھر بار بیچ کر زندگی کے چند لمحے خریدنا چاہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب موت اس کے پاس نہیں آئے گی۔ موجودہ دور کی سب سے بڑی انڈسٹری خوف ہے۔ دنیا بھر کا کارپوریٹ مافیا خوف پھیلاتا ہے۔ اور پھر اسی خوف کے سائے میں اپنی مصنوعات اور سہولیات بیچتا ہے۔ آپ کسی ملک کے بڑے شہر بلکہ اپنے ملک پاکستان کے صدر مقام اسلام آباد اور دیگر صوبائی صدر مقام پشاور، لاہور، کراچی اور کوئٹہ کے فائیو سٹار ہوٹلوں کی زندگی کا موازنہ آج سے بیس سال پہلے کی زندگی سے کریں تو آپ کو یہ ہوٹل رہائش یا کھانا پینا نہیں خوف بیچتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اسلام آباد کے دو بڑے ہوٹلوں میں دنیا کی تمام بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے دفاتر منتقل کرنے کی خواہشمند ہیں اور جن کے وہاں منتقل ہو چکے ہیں' وہ اپنے آپ کو خوش قسمت خیال کرتی ہیں۔ ہوٹلوں کے چاروں طرف مضبوط، مستحکم اور بم پروف دیواریں بنا دی گئی ہیں، ایسے تمام آلات جو دھماکہ خیز مواد اور اسلحہ کو سو پردوں میں بھی تلاش کر سکتے ہیں' نصب ہیں۔ مخصوص تربیت یافتہ کتے بو سونگھتے پھرتے ہیں۔ ٹیلیفون کالوں کو روکنے کے لیے جام کرنے والے آلات بھی موجود ہیں اور کالوں کو ریکارڈ کرنے کے لیے مشینیں بھی مہیا ہیں۔ آپ ایک دفعہ کسی طرح کے ہوٹل میں گھس جائیں تو یوں سمجھو کہ موت کا فرشتہ بھی آپ کا سراغ نہیں لگا سکتا۔ دنیا بھر سے آنے والے ملٹی نیشنل کمپنیوں کے نمائندے، عالمی اداروں کے افسران، بیرونی سفارت کار، غرض ایسے سب لوگ جن کی سکیورٹی خالصتاً پرائیویٹ ہے، وہ ایئرپورٹ سے بلٹ پروف اور دہشت گردی پروف گاڑیوں اور محافظوں کے ساتھ ان ہوٹلوں میں آتے ہیں، اپنی میٹنگ یا ضروری کام کرتے ہیں اور ویسے ہی واپس چلے جاتے ہیں۔ اگر یہ خوف نہ ہوتا تو کیا اس ہوٹل یا ایسے ہوٹلوں کا کاروبار اس طرح چمکتا، سکیورٹی آلات بنانے والی کمپنیوں کی آمدنی میں اضافہ ہوتا، کتے پالنے اور انہیں خاص طرح تربیت دینے والوں کی چاندی ہوتی، وہ ملٹی نیشنل کمپنیاں جو چند لاکھ روپے ماہانہ کے دفاتر میں کام کرتی تھیں' اب ان ہوٹلوں کو پچاس گنا زیادہ کرایہ دینے کو بھی تیار ہوتی ہیں اور وہ یہ اخراجات اپنی مصنوعات کی قیمت بڑھا کر عوام سے وصول کرتی ہیں۔

خوف کے اس کاروبار نے صرف ان چند ہوٹلوں کے کاروبار کو نہیں چمکایا بلکہ اس نے ایک پوری انڈسٹری کو جنم دیا ہے۔ پرائیویٹ سکیورٹی ایجنسیوں کا کاروبار اسقدر وسعت اختیار کر چکا ہے کہ ہر دوسرا دفتر اپنے دروازے پر ان سے ایک پرائیویٹ گارڈ حاصل کرتا ہے اور خود کو ہر قسم کے خوف سے آزاد سمجھنے لگتا ہے۔ اس خوف نے نہ صرف اسلحہ ساز فیکٹریوں کو نئے نئے اسلحہ بنانے کی ترغیب دی ہے بلکہ وقت سے پہلے خطرے کی نشاندہی اور لوگوں کی طرف بڑھتے ہوئے مہیب اور خوفناک گروہوں کا پتہ دینے کے آلات بھی بے شمار تعداد میں بنائے گئے اور اربوں ڈالر میں فروخت کئے گئے۔ خوف کارپوریٹ دنیا کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور موت کا خوف اس ہتھیار کی اصل۔ آج سے تقریباً چالیس سال پہلے دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں وہاں کی میونسپل سروسز کی طرف سے فراہم کئے جانے والے پانی پر لوگ زندگی گزارا کرتے تھے۔ یہ ادارے اپنے پانی کو کلورین یا پوٹاشیم پرمیگ نیٹ سے صاف کر کے اس قابل بنا دیتے تھے کہ لوگوں کو بیماری نہ لگے۔ سب سے پہلے کیلیفورنیا میں پانی کے نمونے پر بحث کا آغاز کیا گیا اور انہیں حفظان صحت کے اصولوں کے منافی قرار دیا گیا۔ لوگوں کو پہلے یہ خوف ڈالا گیا کہ اس پانی میں فلاں فلاں معدنیات تھیں جن سے آپ کی ہڈیاں کمزور ہو سکتی ہیں' یادداشت میں کمی یا پھر نظام انہضام میں خرابی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ لوگوں کو یقین سا ہونے لگا۔ اس کے بعد مختلف شہروں کے پانیوں کے نمونوں میں بکٹیریا اور دیگر بیماریوں کے جرثوموں کو دریافت کیا گیا۔ ہیپاٹائٹس کا خوف سر پر سوار کیا گیا اور پھر پانی کی بوتل ہر شخص کے ہاتھ میں آ گئی۔ ہر کسی کا اپنا پانی ہے جو وہ لے کر گھومتا پھرتا ہے۔ کیا کبھی کسی نے پاکستان میں آج سے صرف 25 سال پہلے سوچا تھا کہ ہم پانی بھی خرید کر پئیں گے۔ وہ قوم جو دیہات میں دودھ کو فروخت کرنا بھی برا سمجھتی تھی کہ یہ اللہ کی ایک نعمت ہے اور اس سے مال کمانا حرام ہے' اب زمین میں موجود اللہ کی اجتماعی نعمت پانی کو بھی پیسے لے کر فروخت کرتی ہے۔ دنیا کی صحت اور میڈیسن کی انڈسٹری جسے ملٹی نیشنل کمپنیاں چلاتی ہیں' اسی خوف کے ہتھیار کو لے کر پروان چڑھتی ہے۔ ہر کسی کو ناگہانی موت سے ڈرایا جاتا ہے' معذور ہونے کا خوف دلایا جاتا ہے' بیمار اور لاچار ہو جانے کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور پھر کبھی وٹامن بیچی جاتی ہیں اور کبھی خالص غذا جسے Organic غذا کہتے ہیں۔ تقریباً پچاس سال سائنس دانوں نے اس کوشش میں لگائے کہ اشیا کے بیج ایسے بنائے جائیں کہ ایک ایکڑ پر بے شمار گندم' چاول یا دالیں حاصل کی جا سکیں۔ جب ایسا ہو گیا تو ساری دنیا کو خوفزدہ کیا گیا کہ اگر تم نے یہ خوراک کھائی تو تمہارے ہارمونز میں خرابی آ جائے گی' تم بد صورت اور معذور ہو جاؤ گے۔ تم خالص گندم' خالص چاول' دالیں اور خالص گھی استعمال کرو اور پھر اس خالص پن کو بیچ کر سرمایہ کمایا گیا۔ پہلے خود خوف پیدا کیا گیا' پھر اس خوف سے سرمایہ داروں کو ڈرایا گیا' پھر ان کو اس خوف کے زیر اثر جی بھر کے لوٹا گیا۔

خوف کے سوداگر اپنے لیے خود بھی خوف کی فضا کا چرچا کرتے ہیں۔ ہر سیاست دان' بیوروکریٹ' جرنیل' صحافی' جج' دہشت گردوں کی ہٹ لسٹ پر آ جاتا ہے۔ لمبی لمبی کانوائے' ایلیٹ فورس' اونچی اونچی دیواریں' مسلح گارڈ۔ آپ کسی جی او آر' کسی سیکرٹریٹ یا کنٹونمنٹ کے علاقے میں گھسنے لگیں تو ایسا لگتا ہے آپ غزہ سے اسرائیل جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو سارا دن منبر رسول ﷺ پر بیٹھے قرآن پاک کی یہ آیات تلاوت کرتے ہیں کہ موت کا وقت مقرر ہے اور وہ نہ جلدی کرتی ہے اور نہ دیر' جو اللہ کو قادر مطلق فاعل حقیقی اور مختار کل سمجھتے ہیں۔ وہ سنی' شیعہ' دیوبندی' بریلوی' کوئی بھی ہو' اسی خوف کے سائے میں اپنے اردگرد مریدوں کا حصار لئے گھومتے ہیں۔ انہیں یقین ہی نہیں ہوتا کہ ان کی زندگی اور موت کا فیصلہ اللہ نے کرنا ہے۔ سید الانبیاء ﷺ نے اسی خوف کو امت مسلمہ کا سب سے بڑا مرض قرار دیا ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا "قریب ہے کہ تم پر دنیا کی اقوام چڑھ آئیں گی' جیسے کھانے والوں کو کھانے کے دستر خوان پر دعوت دی جاتی ہے۔ کسی نے عرض کیا' یا رسول اللہ' کیا ہم اس زمانہ میں بہت کم ہونگے' فرمایا نہیں! بلکہ تم اس زمانہ میں بہت کثرت سے ہو گے' لیکن تم سیلاب کے اوپر چھائے ہوئے کوڑے کباڑ کی طرح ہو گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کے سینوں سے تمہاری ہیبت اور رعب نکال دے گا اور تم "وہن" کا شکار ہو جاؤ گے۔ پوچھا گیا' یا رسول اللہ "وہن" کیا ہے۔ آپ نے فرمایا "دنیا کی محبت اور موت کا خوف (ابوداؤد)۔ کیا اس امت کو یہ مرض لاحق نہیں ہے۔

[illegible]

مدتوں سے میرا یہ دستور رہا ہے کہ میں آج کے پُر آشوب دور میں ان لوگوں کے دفاع کو اپنا فرضِ عین سمجھتا ہوں جو نامساعد حالات، زمانے کی بے رخی، معاشی حالات کی ستم ظریفی اور اہلِ اقتدار کے ظلم و ستم کے باوجود منبر و محراب پر اللہ کے دین کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔ مسجد کا ایک خطیب دانستہ یا نادانستہ طور پر اسلام کی علامت ہے اور ان لوگوں نے کمال جانفشانی سے اس علامت کو قائم رکھا ہے۔ ان کے اسلاف جن کے یہ وارث ہیں انہوں نے عمر بھر ایک دوسرے کے خیالات، نظریے، عقیدے اور تشریح و توضیح کا احترام کیا۔ فقہ کے چاروں امام اپنی تشریح کو ایک رائے تصور کرتے تھے اور دوسرے کی رائے کا احترام کرتے تھے۔ یہ سب تمہید مجھے اس لئے باندھنا پڑ رہی ہے کہ آج سے کچھ عرصہ قبل میں نے "ہمارے افسانہ ساز مؤرخین" کے عنوان سے ایک کالم تحریر کیا جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی ایمانیات، عقائد اور ان محترم شخصیات، جن کے کردار کی گواہی اللہ نے قرآن اور رسول اللہ نے اپنی احادیث میں دی ہے، انہیں تاریخ کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھیں گے تو یہ ظلم عظیم ہو گا۔ اس لئے کہ تاریخ بے سروپا داستانوں اور جھوٹ سچ کا ملغوبہ ہے۔ دنیا کی کوئی تاریخ اپنے سچے اور کھرے ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ جنہیں اللہ صدیقین، شہدا اور صالحین کے لقب سے پکارتا ہے اور سید الانبیا ﷺ جن کے مرتبے کی تصدیق کرتے ہیں ان کو تین سو سال بعد لکھے جانے والے جھوٹ اور سچ کے پلندے، یعنی تاریخ کی گواہی پر رکھ کر پرکھنا زیادتی ہے۔ مسلمان دنیا میں فخر کے ساتھ سینہ تان کر ایک بات کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے حدیث نویسی جو مغرب کے ہاں بھی تاریخ ہی کی ایک قسم سمجھی جاتی ہے، اس میں جرح و تعدیل اور اسم اُلرجال کا ایک ایسا علم ایجاد کیا، جس نے یہ طریقہ وضع کیا کہ ہر سنی سنائی بات یا روایت اس قابل نہیں ہوتی کہ اسے تحریر کیا جائے جب تک اس کو بیان کرنے والے اپنے کردار میں سچے، ایماندار اور صاحبِ امانت نہ ہوں۔ لیکن دنیا کی ہر تاریخ جھوٹے اور کذآب راویوں کی روایتوں سے بھری پڑی ہے۔ کسی بھی مسلمان مورخ نے کبھی بھی اس معاملے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ میں نے اس سلسلہ میں تاریخِ طبری کا حوالہ خاص طور پر دیا تھا، کیونکہ یہ مغرب کے ان مصنفین کی محبوب کتاب ہے جو رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں پر دشنام طرازی کرنا چاہیں تو انہیں حوالے اسی قسم کی کتابوں سے ملتے ہیں۔ اس پر یار لوگوں نے طبری کے دفاع میں بہت کچھ لکھا اور میں نے جواب میں صرف یہ نوٹ تحریر کیا کہ "طبری پر لکھنا میں رسول اللہ ﷺ کی محبت میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کیونکہ دو واقعات ایک حضرت زینب اور حضرت زید کی طلاق اور دوسرا واقعہ غرانیق طبری نے جس انداز میں بیان کیا ہے کوئی انہیں کالم میں لکھنے کی ہمت تو ایک طرف پڑھنے کی برداشت نہیں رکھتا"۔ میری حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی جب میرے سیکولر دوست تو میری اس وضاحت پر خاموش ہو گئے، لیکن چند علمائے اُمت اپنی تلواریں سونت کر مجھ پر پل پڑے۔ وہ لوگ جن کا دفاع میں صرف اللہ کی رضا کیلئے کرتا رہا ہوں۔ ان علماء نے طبری کا دفاع صرف اس لئے کیا کہ گزشتہ چند سو سالوں سے ان کے مدارس میں تفسیر جلالین پڑھائی جاتی ہے اور اس میں اس واقعہ غرانیق کا ذکر ہے، جس کا ماخذ طبری کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ سب سے پہلے ولیم می ور نے اس واقعہ کے حوالے سے اپنے غلاظت بھرے مضامین لکھے۔ دفاعِ طبری اور میری مذمت کا سلسلہ ملکوں ملکوں پھیل گیا اور تازہ ترین مضمون بھارت کے مولانا عبدالمتین منیری صاحب نے تحریر کیا ہے۔ پہلے تو انہوں نے مجھے طنزاً سول سروس سے وابستہ کہہ کر بات کا آغاز کیا اور پھر شک ظاہر کیا کہ شاید میں عربی زبان سے ناواقف ہوں اور یہ بھی فرض کر لیا کہ میں نے ہو سکتا ہے انگریزی ترجمے سے تاریخِ طبری پڑھی ہو۔ انہوں نے مجھے اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور معافی مانگنے اور غلطی کا علی الاعلان اظہار کرنے کے لیے کہا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے معافی تو میں دن رات مانگتا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس روئے زمین پر میں بہت ہی گناہ گار اور عاصی شخص ہوں جس کی بچت صرف اور صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے بغیر ممکن نہیں۔ میرا عربی کا علم بھی کمزور ہے اور میں علومِ دین کے سمندر کا اس طرح غواص نہیں جیسے علماءِ دین ہوتے ہیں۔ میں خود کو ان کے سامنے طفلِ مکتب سمجھتا ہوں۔ لیکن میں کیا کروں کہ جب قرآن پاک ایک واقعہ کی تفصیل بیان کرتا ہے، اور معتبر احادیث میں بھی اس کی تفصیل بالکل ویسی ہی ہوتی ہے۔ لیکن تین سو سال بعد پیدا ہونے والا مورخ بالکل اس کے الٹ تحریر کر رہا ہوتا ہے۔ تاریخ کا تو عالم یہ ہے کہ خود ابن جریر طبری کے ایک ہونے کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ ایک ابن جریر بن رستم اور دوسرا ابن جریر بن یزید ہے اور دونوں ہی مصنفین ہیں۔ ایک کو شیعہ علماء طبائی، ابن الندیم، علی بن داؤد حلی، ابو جعفر طوسی اور سید خوئی اہلِ تشیع میں سے مانتے ہیں اور دوسرے کو سنی طبا علماء امام کا درجہ دیتے ہیں۔ اور کہیں بھی معلوم نہیں پڑتا کہ تصدیق کی جائے کہ کونسی کتاب کس طبری کی لکھی ہوئی ہے۔ لیکن اگر تاریخ طبری کو ہی دیکھا جائے، جو زیرِ بحث ہے تو ڈاکٹر خالد طلال کبیر نے طبری کے اہم راویوں کا جائزہ لیا ہے جو ان کے نزدیک بارہ ہیں۔ یہ طبری کی تاریخ کا بنیادی ماخذ ہیں۔ ان بارہ میں سات وہ ہیں جن پر ائمہ جرح و تعدیل جھوٹے یا متہم بالکذب ہونے کا الزام لگاتے ہیں اور پانچ ثقہ راوی ہیں۔ اب یہ دروغ گو راویوں یعنی وہ جن پر جھوٹے ہونے کا الزام ہے ان کی روایتوں کی تعداد ملاحظہ کریں۔ محمد بن سائب کلبی (12)، ہشام بن محمد کلبی (55) محمد بن عمر (440) سیف بن عمر تمیمی (700)، ابو مخنف لوط بن یحییٰ (612) وہثیم بن عدی (16) محمد بن اسحاق بن یسار کی (164) روایات ہیں ان تمام کو ملا کر 1999 روایات بنتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں طبری نے سچے اور ثقہ راویوں کی صرف 209 روایات کو تاریخ کا حصہ بنایا۔ زبیر بن بکاء (8)، محمد بن سعد (164)، موسیٰ بن عقبہ (7) خلیفہ بن خیاط (1) وہب بن منبہ (46)۔ تاریخ طبری میں یہ ہے جھوٹے اور ثقہ راویوں کی روایتوں کا تناسب۔ حالت یہ ہے کہ عباسی حاکم مع تصد باللہ کا رسالہ بغیر کسی چھان پھٹک کے تاریخ کا حصہ بنایا گیا جو خالصتاً بنوامیہ سے بغض و عناد اور قبائلی دشمنی کی بنیاد پر تحریر کیا گیا تھا۔ متہم بالکذب اور جھوٹے راویوں کی روایتیں طبری نے بلا کم و کاست تحریر کر دیں اور کئی تو ایسی ہیں جن میں معمولی سی عقل بھی استعمال کی جاتی تو قصہ جھوٹا محسوس ہوتا۔ جیسے سیدہ زینب والے واقعہ میں ایسے لگتا ہے جیسے رسولِ اکرم نے انہیں پہلی دفعہ دیکھا ہے جب کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کی پھوپھی زاد تھیں۔ یہیں سے مؤرخ کی نیت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اس تاریخ میں اپنی مرضی کے افسانے جمع کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس تاریخ طبری کا جو نسخہ ہے وہ خوش قسمتی سے عربی میں ہے اور قاہرہ سے چھپا ہے اور جسے میں اپنی کمزور عربی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اور ترجمہ بھی دیکھتا ہوں۔ آپ حیران ہوں گے کہ طبری کی تفسیر کے رجال کا کام تو مصر کے محمود شاکر نے کیا ہے لیکن کسی نے آج تک تاریخ طبری کے رجال اور راویوں پر مفصل کام نہیں کیا۔ اس لئے کہ اگر مسلمانوں کی تاریخ کے راویوں کی تحقیق کی جائے کہ ان میں کردار کے اعتبار سے جھوٹا کون تھا تو پھر آدھی سے زیادہ تاریخ جھوٹ کا پلندہ ثابت ہو گی۔

میرا معاملہ نہ طبری سے پرخاش کا ہے اور نہ ہی بلاذری اور ابن سعد سے۔ میرا دکھ یہ ہے کہ جس کسی نے میرے اسلاف پر انگلی اٹھائی ہو، میرے دین کے نقص بیان کرنا ہوں وہ ان مؤرخین کے جمع کئے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیتا ہے۔ الحاد کا دروازہ انہی کے جمع کئے گئے جھوٹ سے کھلتا ہے۔ آپ اسلام کے خلاف لکھی جانے والی تمام کتابوں کو اٹھا لیں، توہینِ رسالت پر مبنی کتب کا مطالعہ کریں اور ان میں کہیں نہ کہیں طبری اور اس کے قبیل کے مؤرخین جھانکتے نظر آئیں گے۔ وہ لوگ انہی کی روایات کو بنیاد بناتے ہیں۔ حیرت ہے وہ تمام شاتمینِ رسول اللہ ﷺ تو ایسی باتیں تحریر کرنے پر واجب القتل قرار دیے جاتے ہیں اور جس مؤرخ نے یہ جھوٹ اکٹھا کر کے تاریخ کا حصہ بنایا وہ محترم۔ پتہ نہیں کیوں میرے ان صاحبانِ علم علماء کرام کو رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث یاد نہیں آتی کہ "کسی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے آگے سناتا پھرے"۔ کیا ہمارے مؤرخین نے ایسا نہیں کیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی تاریخ مرتب کی جائے جو حدیث اور تاریخ کے راویوں کی بھی چھان پھٹک کے بعد لکھی جائے۔ اللہ مسعود احمد بی ایس سی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جنہوں نے "تاریخ الاسلام والمسلمین" لکھی جو قرآن اور حدیث کی روایتوں پر مبنی ہے۔ یہ انتہائی اہم کام تھا جو مرحوم نے کیا اور یہ ان کی جماعت المسلمین کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔ اس کے ساتھ تاریخ کے راویوں کی تحقیق بھی ضروری ہے۔ اور ایسی سچی تاریخ ہماری ضرورت ہے۔

قبریں بے نشاں

یہ وہ معصوم ہیں جن کی موت پر صرف ان کے ماں باپ یا بہن بھائی اور رشتے دار آنسو بہاتے ہیں۔ ان میں اکثر انہیں تقدیر کا لکھا سمجھ کر چپ چاپ ننھی سی قبریں کھود کر ان میں اپنے پیاروں کو دفن کر کے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ کوئی زیادہ تلخ ہو تو ڈاکٹروں کا گریبان تھام لیتا ہے۔ لیکن کسے خبر ہے کہ یہ آفت کے مارے کون ہیں اور ان کی تعداد کتنی ہے۔ ہر سال کتنے لوگ موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ اگر اس ملک کے میڈیا میں تھوڑی سی حمیت اور شرم ہوتی اور اسے اس ملک کے مفلس و نادار لوگوں پر بیتنے والی قیامتوں کا ادراک ہوتا تو آج اس ملک کا ہر چینل اور ہر اخبار چیخ چیخ کر دہائی دے رہا ہوتا کہ ہمارے بچے مر رہے ہیں اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں۔ ہمیں ان اموات کو روکنے کے لئے فوری کاروائی کرنی چاہیے۔ اے پی سی بلائی جائے، نیشنل پلان آف ایکشن ترتیب دیا جائے۔ تمام سیاسی پارٹیاں اور فوج ایک صفحے پر آجائیں۔ یہ قومی المیہ ہے۔ لیکن رکیئے! سوچیئے! یہ ہمارا قومی المیہ نہیں ہے کہ صرف گزشتہ سال یعنی سال 2014ء میں ایک لاکھ چوالیس ہزار بچے صرف نمونیا اور اسہال کے مرض سے ہلاک ہوئے جن میں 91 ہزار بچے نمونیا سے اور 53 ہزار بچے اسہال کے مرض سے موت کی آغوش میں چلے گئے۔ یعنی روزانہ 395، ہر گھنٹے میں 33 اور ہر دو منٹ میں ایک بچہ صرف ان دو بیماریوں کی وجہ سے موت کی آغوش میں چلا گیا۔ نمونیا سے مرنے والے بچوں کی تعداد کے حساب سے ہم دنیا میں تیسرے نمبر پر ہیں، بھارت پہلے نمبر پر ہے جہاں گزشتہ سال 1,74,000 بچے نمونیا سے ہلاک ہوئے۔ بھارت کی آبادی ہم سے چھ گنا زیادہ ہے، لیکن اموات صرف دوگنا زیادہ ہیں۔ اس لئے دراصل یہ تاج ہمارے ہی سروں پر سجنا چاہیے کہ ہم سب سے زیادہ اپنے بچوں کو موت کا ذائقہ چکھانے والے ہیں۔ ہم وہ بدقسمت معاشرہ ہیں جو دنیا بھر کے پسماندہ ترین ممالک سے بھی زیادہ اپنے بچوں سے لاپرواہ اور ان پر ظلم کرنے والے ہیں۔ وہ ممالک جو قحط زدہ ہیں، غربت و افلاس کا شکار ہیں۔ ہمارے مقابلے میں ایتھوپیا میں ہر سال 35 ہزار، انگولا 26 ہزار، کینیا 18 ہزار، سوڈان 17 ہزار، یوگینڈا 16 ہزار، نائیجیریا 15 ہزار، تنزانیہ 14 ہزار اور ہمارے پڑوسی ملک افغانستان جو گزشتہ تین دہائیوں سے حالتِ جنگ میں ہے، اس میں 20 ہزار بچے 2014ء میں نمونیا سے ہلاک ہوئے۔

دنیا کے تمام طبّی ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ بچوں کے نمونیا سے مرنے کی بنیادی وجہ قصبوں اور گاؤں کی سطح پر طبّی سہولتوں کا فقدان ہے۔ دنیا کے جس ملک میں طبّی سہولیات فراہم کرنے میں ترجیح بڑے ہسپتالوں کی بجائے قصبوں اور دیہاتوں تک ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کو پہنچانے پر دی جائے گی، وہاں بچوں کی اموات کی شرح کو کم کیا جاسکے گا۔ بلکہ دیگر تمام بیماریوں کی بھی آسانی سے روک تھام ہو گی۔ پاکستان میں بچوں کی یہ اموات کسی بھی آفت، بیماری، دہشت گردی سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ لیکن چونکہ نہ ان اموات کے بارے میں گفتگو کرنے سے عالمی ایجنڈا پورا ہوتا ہے اور نہ ہی ان بچوں کو زندہ رکھنے کی جدوجہد میں ہمیں ووٹ ملتے ہیں اس لئے ان پر گفتگو کرنا نہ ہمارے میڈیا کا موضوع ہے اور نہ ہی ہمارے سیاستدانوں کا مشغلہ۔ ہم اپنی دھن میں مست ہیں۔

ہماری دھن کیا ہے۔ ہماری دھن وہی ہے جس سے ہماری مقبولیت میں اضافہ ہو اور ہم اس کے ذریعے سرمایہ کما سکیں۔ میڈیا اور سیاست دونوں ان مقاصد میں اکٹھے ہیں۔ میڈیا ایسے موضوعات چھیڑتا ہے جن سے ریٹنگ میں اضافہ ہو اور پھر اسے اشتہارات ملیں اور وہ مالا مال ہو۔ سیاست دان ان ہتھکنڈوں کو اختیار کرتے ہیں جن سے ان کے ووٹ بنک میں اضافہ ہو، وہ دوبارہ، سہ بارہ منتخب ہوں اور جس کے نتیجے میں ان کے ذاتی کاروبار دن دگنی رات چوگنی ترقی کر سکیں، وہ لکھ پتی سے کروڑ پتی اور پھر ارب پتی بنتے چلے جائیں۔

پاکستان کے میڈیا پر گزشتہ پندرہ سالوں میں جس بات پر سب سے زیادہ گفتگو ہوئی، جس پر سب سے زیادہ لکھا گیا وہ دہشت گردی ہے۔ ان پندرہ سالوں میں دہشت گردی سے اندازاً پچاس ہزار لوگ لقمہءِ اجل بنے۔ جس کا مطلب ہے ہر سال تقریباً تین ہزار تین سو تینتیس افراد موت کی آغوش میں گئے۔ یہ نمونیا اور اسہال سے مرنے والے بچوں کا صرف 2 فیصد ہیں۔ یعنی اگر سال میں 2 لوگ دہشت گردی سے ہلاک ہوئے تو صرف نمونیا اور اسہال سے 98 بچے مارے گئے۔ میں یہاں دیگر بیماریوں سے مرنے والے بچوں کا ذکر نہیں کر رہا۔ لیکن آپ گزشتہ پندرہ سالوں کا میڈیا اٹھا کر دیکھ لیں، آپ کو ان لاوارث اور بے یار و مددگار بچوں کے مرنے اور اتنی تعداد میں مرنے کے بارے میں شاید ہی کوئی پروگرام مل سکے یا کسی عظیم کالم نگار کا کالم نظر آئے۔ جبکہ دہشت گردی کے بارے میں آپ کو ہر طرف خوف کے سائے پھیلاتے اور پوری دنیا کو متحد کرتے میڈیا کے عظیم جگادری نظر آئیں گے۔ دہشت گردی کی اس جنگ میں اب تک تقریباً "پچاس لاکھ لوگ پوری دنیا خصوصاً مسلم دنیا میں مارے جاچکے ہیں۔ یہ سب دہشت گردوں کا صفایا کرنے میں مارے گئے۔ یعنی ان پندرہ سالوں میں دنیا بھر میں ہر سال تین لاکھ انسانوں کو قتل کیا گیا تاکہ دنیا امن کا گہوارہ بن جائے۔ اس جنگ میں تقریباً دو ہزار ارب ڈالر جھونکے گئے تاکہ لوگوں کو دہشت گردی کی موت سے بچایا جاسکے۔ لیکن جب ہم اس گولہ و بارود کا کھیل کھیل رہے تھے تو دینا میں صرف نمونیا سے 94 لاکھ بچے ہر سال مر رہے تھے۔ یعنی ان پندرہ سالوں میں چودہ کروڑ بچے صرف نمونیا سے ہلاک ہوگئے اور ان اموات کو روکنے کے لئے نہ کوئی نیٹو آگے بڑھا اور نہ ہی کسی عالمی طاقت کے ضمیر کو دھچکا لگا۔ ہم بھی عالمی برادری کا حصہ ہیں، ان کے کاسہ لیس اور ذہنی غلام ہیں۔ ہم بھی اسی طرح بے حس، بے شرم اور لاپرواہ ہیں۔ ہم بھی اس عالمی برادری کا سودا بیچتے ہیں اور اپنے بچوں کو موت کی آغوش میں چپ چاپ جاتا دیکھتے چلے جاتے ہیں۔

ہماری بے حسی، لاپرواہی اور بے شرمی علاقائی بھی ہے۔ کیا کبھی کسی نے ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے کہ جب اس ملک کے بڑے شہروں لاہور اور اسلام آباد میں میٹرو بچھائی جارہی تھی تو اس کی تعمیر میں لگنے والی ایک ایک اینٹ، ایک ایک انسانی جان کی قیمت پر لگائی جارہی تھی۔ ان دونوں عظیم منصوبوں میں لگائی جانے والی ایک اینٹ سے راجن پور، لیہ، دیپال پور، قصور، تلہ گنگ جیسے علاقوں کے دور دراز کے دیہات میں نمونیہ سے تڑپتے ہوئے بچے تک دوا پہنچائی جاسکتی تھی۔ ان کی زندگی بچا کر ان کے والدین کو خوشیاں لوٹائی جاسکتی تھیں۔ ان اٹھارہ کروڑ عوام کو زندگی چاہیے اور پھر اس بلا سے بچ نکلیں جسے موت کہتے ہیں تو پھر انہیں تعلیم بھی چاہیے اور باقی ضروریاتِ زندگی بھی۔ موت کے بھیانک پنجے سے نکلیں گے تو میٹرو پر سفر کر سکیں گے۔ لیکن ہمیں تو عالمی معیار کی سواری چاہیے جسے رواں رکھنے کی کوشش پر ہر سال 94 ہزار بچے نمونیا اور اسہال سے اسے کے تیز رفتار پہیوں تلے چیختے چلاتے ہوئے مر جاتے ہیں۔ کیا ان حکمرانوں کو اس خوبصورت سرخ رنگ کی ایرکنڈیشنڈ میٹرو کے پہیے تلے دم توڑتے بچوں کی چیخیں سنائی نہیں دیتیں۔ کیا ان بڑے بڑے میٹرو اسٹیشن کی راہداریوں میں ان معصوم بچوں کی ارواح کا بین نظر نہیں آتا جو پکار رہی ہیں کہ تمہاری اس خوبصورت میٹرو کی قیمت ہم نے اپنی زندگیاں دے کر چکائی ہے۔ تم اس سرمائے سے ہمارے گاؤں کے آس پاس ایک ڈسپنسری بنا سکتے تھے، جہاں میرے ماں باپ مجھے اٹھا کر لے جاتے، مجھے دوا مل جاتی اور میں بھی آپ کے بچوں کی طرح زندگی گزار رہا ہوتا۔ لیکن شاید ہمارے کسی حکمران کا بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، یا نواسی، نواسا کبھی صرف دوائی نہ ہونے کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر نہیں مرا، کسی ممبر پارلیمنٹ، کسی بیوروکریٹ یا کسی جرنیل کی اولاد نمونیا کا شکار نہیں ہوئی ہے اور دوا نہ ملنے کی صورت میں موت کی آغوش میں نہیں چلی گئی۔ اگر ان سیاست دانوں، جرنیلوں، بیوروکریٹوں اور میڈیا کے عظیم دانشوروں کے ساتھ یہ بیت جاتی تو انہیں یہ ساری ترقی زہر لگتی، انہیں میٹرو کے پہیوں تلے اپنے بچے کی لاش پڑی نظر آتی۔

کیا ہے تو نے متاع غرور کا سودا

کس قدر حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ ہم جسے حقائق کی دنیا کہتے ہیں اور جس میں کامیابی وناکامی پر قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں رقم کرتے ہیں میرا اللہ اسے "متاع غرور" یعنی دھوکے کا سامان کہتا ہے۔ یہ دنیا اگر کسی سیاستدان' بادشاہ' سائنسدان' دانشور یا کالم نگار نے تخلیق کی ہوتی تو میں یقیناً اسے حقائق کی دنیا تسلیم کرلیتا اور اپنا تمام ماتم دنیا میں کامیابی اور ناکامی سے منسلک کردیتا۔ لیکن میں کیا کروں، میرا کامل ایمان ہے کہ یہ دنیا اللہ تبارک و تعالیٰ نے تخلیق کی ہے اور وہ اس دنیا کی اس سے زیادہ تعریف نہیں فرماتا کہ یہ دھوکے کا سامان ہے۔ سید الانبیاء ﷺ نے اس دنیا میں رہنے' زندگی بسر کرنے یا ایک معلوم وقت گزارنے کے لئے اس دنیا کی جو تعریف کی ہے اور جس طرح اس کی بے وقعتی کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے خوبصورت اس دنیا کو بیان ہی نہیں کیا جاسکتا۔ آپ ؐ نے اسے "عابر السبیل" یعنی عارضی پڑاؤ' ٹرانزٹ لاؤنج "TransitLounge" کہا ہے۔ اس دنیا میں آنے سے پہلے بھی صدیوں پر محیط ہماری زندگی تھی اور اس دنیا سے جانے کے بعد بھی ایک لامتناہی زندگی ہمارا مقدر ہے اور ہم ایک تھوڑے سے وقفے کے لئے اس عارضی پڑاؤ یا ٹرانزٹ لاؤنج میں آئے ہیں۔ اللہ نے ہمارا یہ سفر اور یہ عارضی پڑاؤ ایک خاص مقصد کے لئے تخلیق کیا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ "ہم نے موت اور حیات کو تخلیق کیا ہے تاکہ دیکھیں کہ تم میں سے اچھے اعمال کون کرتا ہے" (الملک)۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اچھے اعمال کی تعریف میں نہ عبادات آتی ہیں اور نہ ہی دنیا کی مادی کامیابی۔ عبادات تو ایک فرض ہے کہ جسے آپ نے اللہ کے حکم کے مطابق ادا کرنا ہے جبکہ "اچھے اعمال" تو آپ کا وہ تمام طرز عمل ہے جو آپ اس "عارضی پڑاؤ" میں اختیار کرتے ہیں۔ آپ جھوٹ نہیں بولتے' دھوکہ نہیں دیتے' وعدہ خلافی نہیں کرتے' غیبت نہیں کرتے' قتل نہیں کرتے' ملاوٹ نہیں کرتے' لوگوں کا مال ہڑپ نہیں کرتے' اپنے کمائے ہوئے مال سے قرابت داروں' یتیموں' بیواؤں' مسکینوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں' آپ والدین کی خدمت کرتے ہیں اور ان کے سامنے اف تک نہیں کرتے' آپ اولاد کی نیک اور صالح اصولوں پر پرورش کرتے ہیں' آپ زنا نہیں کرتے' آپ غیر فطری فعل سے نفرت کرتے ہیں' غرض اعمال صالح کی ایک طویل فہرست ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بتائی ہے اور اسے ہی دنیا میں کامیابی اور ناکامی کا معیار بتایا ہے۔ آج اس ہنستی بستی دنیا کے ہر معاشرے میں انہی اچھے اعمال کو ہی معاشرے کی کامیابی کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی صاحب عقل شخص کسی معاشرے یا سوسائٹی کی خوبصورتی کی تعریف کرتا ہے تو وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ وہاں بلب کتنے جلتے تھے' کاریں کتنی تھیں' پل کس قدر تھے' بلند وبالا عمارتیں کتنی تھیں' بلکہ وہ معاشرے کی خوبصورتی کا معیار اس ماحول کی انسانی اقدار سے لیتا ہے۔ وہاں چوری' ڈاکہ' زنا بالجبر' دھوکہ' فریب' جھوٹ' قتل' اغوا اور دیگر جرائم کسقدر کم ہیں' وہاں انسان نے انسانوں کی فلاح کے ادارے کس قدر قائم کر رکھے ہیں۔ وہ اپنے بوڑھوں' معذوروں' یتیموں اور بیواؤں کا کس طرح خیال رکھتے ہیں۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ انسان آج کے اس ترقی یافتہ دور سے کہیں زیادہ بہتر طریقے سے یہ اچھے اعمال ان معاشروں میں کرتا تھا جنہوں نے موجودہ شہری زندگی یعنی "اربن لائف" کی شکل تک نہیں دیکھی تھی اور آج بھی دنیا بھر کے دیہی معاشرے انسانی ہمدردی اور اچھے اعمال میں ترقی یافتہ دنیا سے کہیں آگے ہیں۔ دنیا کی کسی سائنسی اور مادی ترقی کا کوئی تعلق انسان کی اخلاقی اور معاشرتی ترقی سے نہیں ہے بلکہ دنیا میں کارپوریٹ کلچر نے بدترین اخلاقیات کی بنیاد رکھی ہے۔ اپنی کاروباری سلطنت کی وسعت کے لئے انہوں نے جنگیں کیں' ملکوں پر قبضے کئے' دھوکے اور فراڈ سے مال بیچ کر کمپنیوں کے سرمائے میں اضافہ کیا' اسی زمین پر کروڑوں لوگوں کا خون بہایا اور آج بھی بہایا جارہا ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں اس قدر انسان قتل نہیں ہوئے جتنے موجودہ مادی ترقی کی دوڑ میں ہوئے۔ جنگ عظیم اول سے لے کر عراق کی جنگ تک کیا ٹیکنالوجی انسانوں کی فلاح' امن اور سکون کے لئے استعمال ہوئی۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ صرف اور صرف انسانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے استعمال ہوئی۔

کیا ہم کسی عارضی پڑاؤ یا ٹرانزٹ لاؤنج میں مستقل پڑاؤ کا رویہ رکھتے ہیں۔ کیا ہم کسی ایئرپورٹ' ریلوے اسٹیشن' یا بس اڈے پر کچھ دیر کے لئے رکیں اور ہم سب کو علم ہو کہ ہماری بس' ٹرین یا جہاز نے کسی بھی وقت آجانا ہے اور ہم نے چند لمحے اس ٹرانزٹ لاؤنج میں گزارنے ہیں تو ہمارا رویہ کیا ہوگا۔ ہم زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کو آرام پہنچانے کی کوشش کریں گے' کسی چیز کو اپنی مستقل ملکیت تصور نہیں کریں گے' ہم بس' ٹرین یا جہاز پر سوار ہوتے ہوئے پریشان نہیں ہوں گے' اس لئے کہ ہمیں یقین ہوگا کہ اگلی سواری پر میرے باپ بھائی' بیوی بچوں اور دوستوں نے بھی میرے ساتھ آکر مل جانا ہے اور جو پہلے چلے گئے ہیں' میں ان سے جاکر ابھی ملاقات کرلوں گا۔ ہمیں ٹرانزٹ لاؤنج میں کونسے لوگ زیادہ اچھے لگتے ہیں' وہی جو ہم پر سب سے زیادہ مہربان ہوں' جو اپنی جگہ ہمارے لئے چھوڑ دیں' اپنا آرام ہمارے لئے قربان کردیں۔ دنیا میں بڑے سے بڑے مادہ پرست کو بھی جب اور جہاں اس بات کا یقین ہوجائے کہ وہ یہاں صرف چند لمحوں کے لئے آیا ہے اور پہلی فلائٹ پر چلا جائے گا تو اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ وہ مستقل رہائش کے بندوبست اور سامان نہیں کرتا۔ "متاع غرور" اور عابر السبیل" یہ دو تصورات ہیں جو انسانی دنیا کو خوبصورت بناتے اور انسانی کامیابی کے اصول متعین کرتے ہیں۔ دنیا کے ہر مہذب معاشرے میں ہر جائز وناجائز طریقے سے دولت کما کر اپنی معاشی سلطنت بڑھانے والا محترم نہیں گردانا گیا بلکہ اپنی معاشی سلطنت مستحق افراد میں بانٹنے کے بعد اس عارضی پڑاؤ سے چلے جانے والا قابل احترام تصور ہوا ہے۔

دنیا کی اس حیثیت کو اگر ہم سمجھ لیں تو پھر ہمارے لئے اللہ کی ذات کا تصور اور کامیابی کا معیار سمجھنا آسان ہوجائے گا۔ اللہ انسانوں کو اپنی ہر نعمت ایک امتحان کے طور پر عطا کرتا ہے۔ امتحان یہ کہ وہ اس نعمت پر اس کا شکر ادا کرتے ہوئے اس سے کس طرح خلق خدا کی خدمت کرتے ہیں اور پھر ایسا کرنے پر اس کا وعدہ ہے کہ وہ نعمتوں میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ مسلمانوں معاشروں اور حکومتوں میں جب یہ چلن عام رہا ان پر نعمتوں کی بارش ہوتی رہی۔ لیکن یہی چلن جب دوسروں نے اختیار کرلیا تو نعمتوں کا رخ ان کی جانب موڑ دیا گیا۔ اللہ کے ہاں کسی بھی معاشرے پر رحمتوں کی بارش ان کی ٹیکنالوجی میں ترقی کی بنیاد پر نہیں بلکہ اچھے اعمال کی صورت میں ہوتی ہے جو اس دنیا میں انسان کو بھیجنے کا مقصد ہیں۔ خالصتاً مادہ پرستی کی کوکھ سے ظلم' زیادتی' ناانصافی اور جبر برآمد ہوتا ہے جس کا تجربہ آج پوری دنیا کو ہے۔ انسان کی ساری ترقی کا صرف اور صرف ایک ہی اعلیٰ اور ارفع مقصد ہوتا ہے اور وہ ہے پرسکون زندگی۔ اگر وہی حاصل نہ ہوسکے تو ساری جدوجہد ناکام۔ کیا پوری انسانیت کی جدوجہد ناکام نہیں۔ کیا پوری انسانیت بے چینی' بے اطمینانی' خوف' غربت' افلاس' جنگ' جہالت' ظلم اور قتل وغارت سے عبارت نہیں۔ ہر معاشرے کی اپنی بے چینی اور اضطراب ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں کا اپنا اور ترقی پذیر اور پسماندہ ملکوں کا اپنا۔ اس لئے کہ موجودہ دنیا کے ہر تجزیہ نگار' معیشت دان' سیاسی ماہر نے ترقی کا ایک ہی پیمانہ بنا رکھا ہے۔ یعنی مادی ترقی' معیشت' ٹیکنالوجی اور مادی سہولیات میں ترقی۔ یہ ہے متاع غرور کا سودا۔ دھوکے کے سامان سے محبت' دھوکے کے سامان کو ترقی کی معراج سمجھنا۔ یہ دھوکے کا سامان ہر کسی کو اس کے مزاج' حیثیت اور مقام کے مطابق دھوکہ دیتا ہے۔ ٹرانزٹ لاؤنج میں بیٹھے لوگ اپنی فلائٹ کے لئے زیادہ بے چین ہوتے ہیں' انہیں جلد اپنی منزل پر پہنچنے کی دھن مضطرب کررہی ہوتی ہے۔ ہمیں یقین ہی نہیں کہ ہماری کوئی منزل ہے' ہم تصور کئے بیٹھے ہیں کہ ہماری فلائٹ کینسل ہوچکی ہے۔ ہم ٹرانزٹ لاؤنج سے اسقدر محبت کرتے ہیں کہ ہمیں اسی کے اجڑنے پر اپنی زندگی اجڑنے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اس سے زیادہ دھوکے کا سامان اور کیا ہوسکتا ہے۔ اقبال نے اس قرآنی اصلاح کا کیا خوب شعری اظہار کیا ہے۔

کیا ہے تو نے متاع غرور کا سودا
فریب سود وزیاں لاالہ الااللہ

کیا ہمیں اختلاف امت کے جرم کی سزا ملنے والی ہے؟

کسی امت کی اس سے بڑھ کر بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ آگ کا ایک طوفان اس کی جانب بڑھ رہا ہو اور وہ اس میں کودنے کے لیے اپنی پوزیشن مضبوط کر رہی ہو۔ یوں تو آگ اور خون کے اس کھیل کو موجودہ دور میں تازہ دم ہوئے تیس سال ہو چکے ہیں۔ اس امت میں شیعہ سنی اختلاف گزشتہ تیرہ سو سال سے چلا آرہا ہے لیکن اس کے فساد کی شکل ہمیشہ اس وقت اختیار کی جب اسے اقتدار کی سیڑھی یا غلبے کا ذریعہ بنا کر دوسرے مسلک کے افراد کو قتل کیا گیا۔ تاریخ میں ایسا اس وقت ہوا جب خلاف عثمانیہ کی اجتماعی حکومت کے مقابل میں ایران میں صفوی بر سر اقتدار آئے۔ صوفیاء کا دیس ایران جہاں سے مولانا روم، سعدی، حافظ اور کیسے نابغہ روز افراد نے جنم لیا، وہاں مسلکی اختلاف سے دور اس روحانی احساس کو ختم کرنے کے لیے صوفیاء کا قتل عام کیا گیا۔ عراق سے ملاؤں کو بلا کر ایک خاص فقہ ترتیب دی گئی اور اسے نافذ کیا گیا۔ صفوی حکمرانوں نے یہ صرف اس لیے کیا کہ وہ خلافت عثمانیہ جو کہ سنی مسلک کی اجتماعی خلافت تھی اس کے مقابلے میں اپنی علیحدہ شناخت اور خود مختاری قائم کرنا چاہتے تھے۔ قتل عام کی یہ داستان بہت طویل اور دلگداز ہے کہ کس طرح وہاں اپنے اقتدار کو مسلک کا تڑکا لگا کر قائم کیا گیا اور کیسے ایران کو ایک ایسے علاقے میں تبدیل کر کے رکھ دیا گیا جہاں تصوف اور صوفیاء کا نام بھی اجنبی ہو گیا۔ وجہ شاید یہ تھی کہ یہ لوگ مسلک کی بجائے اتحاد امت کی بات کرتے تھے۔ دوسری دفعہ یہ قتل عام اس وقت نظر آتا ہے جب 1888ء میں افغانستان پر امیر عبدالرحمٰن کی حکومت تھی تو اس کے چچازاد بھائی محمد اسحاق نے اس کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا۔ یہ ایک خالصتاً قبائلی جنگ تھی اور ہزارہ قبیلے کے افراد نے محمد اسحاق کا ساتھ دیا۔ ہزارہ قبیلہ چونکہ چنگیزی ہونے کی وجہ سے خاصا جنگجو تھا۔ اس لیے امیر عبدالرحمٰن کو شکست کا خوف دامن گیر ہوا۔ چالیس ہزار کے قریب ہزارہ قبائل اس جنگ میں شریک تھے۔ ایسے میں انہیں شکست دینے کا ایک ہی راستہ تھا کہ ان کے خلاف لوگوں کو مسلک کے نام پر متحد کیا جائے۔ پورے افغانستان میں جہاد کا اعلان کیا گیا کہ ہم نے ہزاروں کے خلاف لڑنا ہے کیونکہ وہ شیعہ ہیں۔ ان کا قتل عام کیا گیا۔ ان کی زمینیں ان سے چھین کر پشتونوں کو دے دی گئیں اور انہیں دیگر چھوٹے چھوٹے پیشوں سے رزق کمانے پر مجبور کر دیا گیا۔

جب بھی کبھی اقتدار کی ہوس اور بالادستی کی خواہش کو مسلک کا لبادہ اوڑھانے کی کوشش کی گئی ہے یہ انتہائی خوفناک شکل اختیار کر جاتی ہے۔ امت مسلمہ کی تاریخ میں صرف چند ایک مثالوں کے علاوہ کوئی ایسا بڑا واقعہ نظر نہیں آتا جب دونوں مسالک کے افراد تلواریں سونت کر میدان میں نکل آئے ہوں۔ دونوں مسالک کے ماننے والے ساتھ ساتھ رہتے اور اپنے روزمرہ کاروبار زندگی میں اس کو داخل نہ ہونے دیتے۔ حکومتی کاروبار میں بھی دونوں مسالک کے لوگ سلطنت کے امور نبٹاتے۔ اورنگزیب عالمگیر جیسے شخص جسے سیکولر افراد بہت بدنام کرتے ہیں، اس کی حکومت میں دو شیعہ وزیر تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے اس اختلاف کو ہوا لکھنو کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے دی۔ لکھنو میں عزاء داری کے جلوس کا ایک راستہ متعین تھا۔ اسی دوران شہر کی دوسری سمت شان صحابہ کانفرنس ہوا کرتی تھی۔ 1930ء میں انگریز ڈپٹی کمشنر نے عزاء داری کے جلوس کا راستہ بدل کر اسے عین اس جگہ سے گزرنے کا حکم دیا جہاں شان صحابہ کانفرنس ہوا کرتی تھی۔ یہ شیعہ سنی فسادات کا برصغیر میں آغاز تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی پورے عالم اسلام میں اکا دکا فسادات کے علاوہ کوئی مثال نہیں ملتی کہ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ محلوں میں رہنے والے یہ گروہ آپس میں ایسے لڑے ہوں کہ قتل و غارت رکنے کا نام نہ لے۔ موجودہ دور میں صدام حسین نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے شیعہ اکثریت پر مظالم کیے لیکن وہ ظلم میں شیعوں کے خاص نہ تھا۔ اس نے سب سے زیادہ ظلم سنی کردوں پر کیا جن کی اس نے بستیوں کی بستیاں اجاڑ دیں۔ اس کے ظلم کو مسلکی بالادستی کے زمرے میں نہیں گنا جا سکتا۔ لیکن انقلاب ایران ایک ایسا واقعہ ہے جس نے اس امت میں اس اختلاف کو اس قدر واضح کر دیا کہ یہ دو واضح گروہوں میں تقسیم ہوتی چلی گئی۔ یوں تو ایرانی اس بات کا اعلان کرتے تھے کہ ان کا انقلاب وسیع تر اسلامی انقلاب ہے جو تمام مسالک کی نمائندگی کرتا ہے لیکن حقیقتاً انہوں نے پوری ملت اسلامیہ میں ایسے گروہوں کو منظم کرنا شروع کیا جو ان کے مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ اقتدار پر بزور قوت قبضہ کر کے ایرانی اسلامی انقلاب کو سوویت یونین کے انقلاب کی طرز پر برآمد کرنے کی پالیسی کا آغاز ہوا۔ کوئٹہ میں جولائی 1985ء کا واقعہ اس کی ایسی مثال ہے جو بہت کچھ کہے دیتی ہے۔ جب ایک جلوس کی پولیس کے ساتھ مڈھ بھیڑ ہوئی اور اس واقعہ میں تیرہ پولیس والوں کے سر کاٹ کر کھمبوں پر لٹکا دیئے گئے۔ انقلاب کا اس قدر جنون تھا کہ ایک حاضر سروس کپتان لودھی چھٹی لے کر آیا اور اس جلوس کی قیادت کی۔ بالآخر فوج بلائی گئی، کرفیو لگا لیکن اس کے بعد سے کوئٹہ کا ہزارہ علاقہ امن کو ترس گیا۔ امن ہو جاتا لیکن بالادستی کی خواہش نے اختلاف کو ہوا دی۔ ہزارہ آبادی کوئٹہ کے مشرقی پہاڑ کے دامن میں آباد تھی۔ گورنر موسیٰ کے زمانے میں مغربی پہاڑ کا دامن بلوچوں سے خریدا گیا اور وہاں افغانستان سے ہزارہ قبائل کے افراد کو لا کر آباد کیا گیا۔ ذہنوں میں شاید یہ تصور تھا کہ دونوں جانب کے پہاڑ ہمارے قبضے میں ہوں گے تو پورا کوئٹہ شہر ہمارا۔ لیکن دوسری جانب مخالف مسلک کے افراد بھی منظم ہوتے چلے گئے۔ جھنگ شہر میں خالصتاً شیعہ زمینداروں سے الیکشن جیتنے کے لیے کاروباری طبقے کے افراد نے چند علماء کو ساتھ ملا کر سپاہ صحابہ بنائی اور پھر بالادستی اور غلبے کو مسلک کا ایسا تڑکا لگا کہ شیعوں کا قتل شروع ہو گیا۔ دوسری جانب سپاہ صحابہ کا بھی کوئی سربراہ ایسا نہیں ہے جسے قتل نہ کیا گیا ہو۔ اس کے باوجود بھی یہ جنگ شیعہ سنی جنگ کی شکل اختیار نہ کر سکی۔ پورے پاکستان میں سنی آبادیوں میں چھت پر علم لگائے شیعہ افراد کے گھر کسی قدر امن سے رہ رہے ہیں۔ اس لیے یہاں ابھی اس اختلاف نے وہ شکل اختیار نہیں کی جیسی لبنان میں اختیار کی۔ ایران کے پاسداران کی سربراہی میں شام کی سرپرستی میں حزب اللہ کو منظم کیا گیا تاکہ پورے خطے میں مسلک کی بنیاد پر بالادستی حاصل کی جائے۔ مقصد بہت اعلیٰ وارفع تھا کہ ہم نے اسرائیل سے لڑنا ہے۔ پورے لبنان نے ان کو خوش آمدید کہا۔ لیکن اس نے لبنان، شام، اردن اور فلسطین کے معاشرے کو اس طرح تقسیم کیا کہ آج وہاں قتل و غارت اور ظلم و دہشت کا بازار گرم ہو چکا ہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے لبنان میں صدر منتخب نہیں ہو سکا کیونکہ حزب اللہ نہیں چاہتی۔ شام میں جس بالادستی کی جنگ کا آغاز ہوا بڑی خاموشی سے ہوا تھا۔ اب وہ اس قدر پھیل گئی ہے کہ اس نے پوری مسلم امت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ 34 ممالک کا اتحاد ایک طرف اور تین ملک دوسری جانب۔ اس خوفناک صورتحال کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سب ایک دم جاگ اٹھتے، ایک احساس پیدا ہوتا کہ ہم ایسی خوفناک جنگ میں داخل ہونے والے ہیں جو گلی گلی اور محلہ محلہ شروع ہو جائے گی۔ وہ جنہوں نے منبر و محراب پر بیٹھ کر اس آگ کو ہوا دی انہیں بھی احساس نہیں۔ اب بھی اس بات کا درس دے رہے ہیں کہ اس معرکے میں کود و، آخری فتح تمہاری ہو گی۔ اب بھی اپنی مرضی اور اپنے تعصب پر مبنی تجزیے کیے جا رہے ہیں۔ مسلکی بنیاد پر جذبہ جہاد اور شوق شہادت کو ابھارا جا رہا ہے۔ کسی امت کی اس سے بڑھ کر اور کیا بدقسمتی ہو گی۔ لگتا ہے قضا و قدر نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمیں اختلاف امت کے جرم کی سزا دے دی جائے۔

جب کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن حکیم کو مملکت خداداد پاکستان کا اساسی آئین مان لیا جائے اور یہ مثال بھی دی جاتی ہے کہ اس دنیا کے نقشے پر ایک ملک اسرائیل ہے جس نے اپنی الہامی کتابوں کو اساسی آئین کا درجہ دے رکھا ہے اور وہ آج تک امور مملکت بحسن وخوبی چلا رہا ہے تو سرمایہ دارانہ جمہوریت اور سیکولر طرز زندگی کے دلدادہ طرح طرح کی دلیلیں لے کر سامنے آتے ہیں۔ سب سے پہلی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ قرآن حکیم کی تعبیر اور تشریح پر سو طرح کے اختلافات ہیں تو پھر کون سی تعبیر نافذ العمل ہو گی۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ یہ وہ لوگ کہتے ہیں جو اس آئین پر یقین رکھتے ہیں جس کی تشریح اور تعبیر میں بہتر فرقوں سے بھی زیادہ اختلاف موجود ہے۔

مسلمانوں میں کوئی فرقہ ایسا نہیں جو یہ دعویٰ کرے کہ وہ قرآن کو نہیں مانتا یا پھر یہ کہے کہ قرآن ہمارے مسائل کا حل نہیں جبکہ آئین پاکستان کو نہ ماننے والے یا اس کے بارے میں یہ دعویٰ کرنے والے کہ یہ ہمارے مسائل کا حل نہیں پیش کرتا' بے شمار ہیں' اور کئی ایک تو وزارت اعلیٰ کے منصب پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔ اس آئین پاکستان کی سو طرح کی تعبیریں ہیں۔ پیپلز پارٹی کے زمانے میں پارلیمنٹ ججوں کی بحالی کی ایک طرح تعبیر کرتی اور سپریم کورٹ کی بحالی والے وکلا کوئی اور۔ جماعت اسلامی کی تشریح ایم کیو ایم سے مختلف ہے اور اے این پی کی پی ٹی آئی سے۔ یہاں تک کہ آئین پاکستان کی تشریح کا واحد آئینی ادارہ سپریم کورٹ ہے۔ یہ سپریم کورٹ چند سال پہلے یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اس آئین کا ایک بنیادی ڈھانچہ ہے اور اس کے مخالف کوئی ترمیم پارلیمنٹ نہیں کر سکتی' لیکن موجودہ سپریم کورٹ نے اس فیصلے کے برعکس یہ تشریح اور تعبیر کی کہ قرارداد مقاصد سمیت اس آئین کا کوئی بنیادی ڈھانچہ ہی نہیں ہے اور عوام کی منتخب پارلیمنٹ جب جو چاہے کر سکتی ہے۔ ایک سپریم کورٹ اسے اسلامی قرار دیتی ہے اور دوسری اسے بالکل سیکولر جمہوریت کی طرز کا حق دے دیتی ہے۔ لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود' ان ہزارہا لایعنی تشریحات کے باوصف یہ آئین گزشتہ 42 سال سے نافذ ہے اور کوئی دانشور یہ اعتراض نہیں کرتا کہ کونسی تشریح نافذ کریں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کو اساسی آئین کا درجہ دے کر ماڈرن ریاست کیسے چلائی جا سکتی ہے۔ دنیا کی موجودہ ماڈرن قومی ریاستوں میں دو طرح کے قوانین ہیں۔ ایک اساسی آئین جو رہنما اصول مرتب کرتا ہے اور دوسری اس کی تابع (Sabordinate) قانون سازی۔ اساسی آئین ہمیشہ مختصر اور ملک کے اساسی نظریے کی تشریح کرتے ہیں جیسے جمہوریت' سیکولرزم' انسانی حقوق' آزادی' مساوات وغیرہ۔ جبکہ تابع قانون سازی ان اصولوں کے نفاذ کے طریق کار کو وضع کرتی ہے۔ اسرائیل نے یہی کیا ہے۔ انہوں نے اساسی آئین کی حیثیت تورات اور تالمود کو دی اور پھر کاروبار مملکت چلانے کے لئے تابع قانون سازی کر لی۔ ان قوانین میں پارلیمنٹ' انتخابات' صدارت' معاشی معاملات' سزا و جزا وغیرہ سب شامل ہیں' حتیٰ کہ یروشلم کو اپنا دارالحکومت کہنا بھی ایک تابع قانون ہے' بنیادی آئین نہیں ہے۔ برطانیہ میں یہی حیثیت اقدار و روایات کو حاصل ہے۔ اسی لئے انہوں نے کوئی تحریری آئین مرتب نہیں کیا۔ قرآن پاک کو ملک کا اساسی آئین ماننے کے بعد آپ کو صرف ایک آئینی عدالت بنانے کی ضرورت ہے جس میں ہر فقہ اور ہر تعبیر کے علما جنہیں آپ موجودہ زبان میں مسلم جیورسٹ کہتے ہیں' وہ ممبران ہوں اور وہ ہر تابع قانون کو جانچ پرکھ کر بتا سکیں کہ یہ کس حد تک بنیادی اساسی آئین یعنی قرآن حکیم سے مختلف ہے اور دوسرا یہ کہ قرآن حکیم کی فلاں آیت کا کیا مفہوم ہے جس پر قانون بنایا جائے۔ یہاں برطانیہ کے نظام میں اقدار و روایات کی طریق کار بھی تعبیر و تشریح کے لئے اپنائی جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم کی تعبیر و تشریح صرف اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار ہے اور قرآن ہی اطاعت رسول کو واجب قرار دیتا ہے۔ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ میں جو اقدار و روایات کا ایک تسلسل ہے وہ احادیث اور سنت رسول ﷺ کی حیثیت کو تسلیم کرنے کے بعد اس کی مزید آنے والے حالات کے مطابق تشریح ہے۔ اسلام کے اس نظام حکومت کی ترتیب خود رسول اکرمؐ نے اس وقت بیان فرمائی جب حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا۔ "آپؐ نے پوچھا "اگر کوئی قضیہ پیش ہوا تو تم کیسے فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا "قرآن مجید میں پائے جانے والے احکام کے ذریعے۔ آپ نے دریافت فرمایا "اگر قرآن میں نہ پاؤ" معاذ نے کہا ان فرمودات کے ذریعے جو رسول ﷺ کی سنت میں ہوں' آپؐ نے دریافت فرمایا اگر رسول کے فیصلوں میں ایسا کوئی حکم نہ ملا تو؟ معاذؓ نے کہا "میں اپنی سوچ اور رائے کام میں لاؤں گا اور کوتاہی ہرگز نہ کروں گا"۔ آپؐ نے ان کا سینہ تھپک کر فرمایا "شکر ہے اللہ کا جس نے رسول اللہؐ کے رسول کو اس بات کی توفیق دی جو رسول اللہؐ کو پسند ہے۔ (ابو داؤد' ترمذی)۔ یہ ہے اسلام کا اساسی دستور اور آئین جو صرف قرآن و سنت ہے۔ اس کے ساتھ کسی دوسری تحریر کو منضمی کر کے یا اسے کسی آئینی دستاویز میں تحفظ دینا مقصود نہیں بلکہ اسے مکمل طور پر ایک اساسی آئین تسلیم کرنا ہے۔ اس کے بعد باقی تمام تابع قوانین اس کی تشریحات کی بنیاد پر مرتب کیے جاتے ہیں۔ یار لوگوں نے میثاق مدینہ کو موجودہ مغربی سیکولر جمہوری قومی ریاستوں کے تحریری آئین کا ماخذ قرار دیا ہے حالانکہ اس کی حیثیت ایک آئین نہیں بلکہ ایک تابع حکم نامے کی ہے۔ اس کی پہلی شق ہی اس کی تشریح کرتی ہے۔ "یہ ایک حکم نامہ ہے نبی اور اللہ کے رسول ﷺ کا قریش اور اہل یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانے والوں اور ان لوگوں کے مابین جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اور ان کے ہمراہ جنگ کریں"۔ یہاں دیگر مذاہب کے لوگوں کو تابع کہا گیا اور پھر دوسری شق میں یہ اعلان کیا گیا "تمام دنیا کے لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ سیاسی وحدت (امت) ہو گی"۔ یعنی امت کا تصور میں ایک ایسی سیاسی وحدت ہے جس میں مسلمان حکمران ہوں اور دیگر مذاہب کے لوگ تابع ہوں۔ اس حکم نامے کی پہلی 23 شقیں مسلمانوں کے متعلق ہیں جنہیں "فی کتابہ ل لم ھاجر بن وانصار" کہا گیا اور 24 سے 47 شقیں یہودیوں سے متعلق ہیں جنہیں "ووقع می کتاب رسول اللہ صلعم لی ھود"۔ یہاں واضح کیا گیا کہ یہ یہود کے نام رسول ﷺ کا حکم نامہ ہے۔ اس حکم نامے کے تحت تمام عدالتی' تشریحی' فوجی اور دیگر انتظامی اختیارات رسول ﷺ کی ذات میں مرکوز تھے جو وحی الٰہی سے فیصلہ کرتے تھے۔ اس حکم نامے کو صرف وحی الٰہی منسوخ کر سکتی تھی۔ کسی پارلیمنٹ کو یہ اختیار نہ تھا۔ اسی لئے جب یہ حکم آیا کہ حرم کی حدود سے تمام غیر مسلموں کو نکال دو تو کیا آج کسی میں جرات ہے کہ میثاق مدینہ کو دلیل بنا کر دوبارہ ان کو مکہ اور مدینہ میں آباد کرے اور ویسا ہی طرز حکومت اختیار کرے۔ اس کا مطلب ہے کہ مسلم امہ کے لئے اساسی آئین قرآن ہے جس کی تشریح و تعبیر سنت رسول اللہ ہے۔ مثالیں دی جاتی ہیں کہ امام ابو یوسف نے بادشاہ کے کہنے پر کتاب الخراج لکھی اور محاصل کا نظام وضع کیا۔ کیا ایسی کسی بھی قسم کی کوشش کو آئین کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے۔ کیا دنیا کے کسی بھی آئین میں اس کے ٹیکس کے قوانین درج کیے جاتے ہیں۔ موجودہ ریاستوں کا آئین یہ طے کرتا ہے کہ ہمارا معاشی نظام سودی معیشت اور آزادانہ منڈیوں کی تجارت پر مبنی ہے اور اس کے زیر سایہ قوانین بنتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے ہمارا نظام معیشت غیر سودی ہے اور اس تجارت آزادانہ نہیں اسلامی اخلاقیات کی پابند ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن وہ تمام اصول اور پالیسی گائیڈ لائن فراہم کرتا ہے جو آج کے موجودہ آئین کی ضرورت ہے تو پھر اس کو آئین کیوں نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یہی وہ مقام اختلاف ہے۔ اس لئے کہ مروجہ آئین کی مقدس کتاب کی خلاف ورزی کی سزا موت بھی رکھ دیں پھر بھی اسے توڑا' بدلا اور معطل کیا جا سکتا ہے۔ عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا آئین اور یہ طرز زندگی خود مرتب کریں۔ لیکن اگر ایک دفعہ قرآن کو اساسی دستور مان لیا گیا تو اسے صرف وحی الٰہی ہی تبدیل کر سکتی ہے اور وحی کا دروازہ خاتم النبیینؐ کی رسالت کے ساتھ بند ہو چکا۔ یہ اللہ کی بادشاہت اور حاکمیت کے ساتھ عوام کی بادشاہت اور حاکمیت کی جنگ ہے۔ میرا ان تمام فقہیان ملت اور علمائے امت سے سوال ہے جو خلافت علیٰ منہاج ال بنوہ پر یقین رکھتے ہیں یا پھر رسول اللہ کی بشارت کے مطابق حضرت مہدی کی خلاف یا پھر غیبت کبریٰ کے بعد صاحب الزمان امام مہدی کی آمد پر یقین رکھتے ہیں اور تمام سنی اور شیعہ فقہیان اس پر متفق ہیں۔ کیا امام مہدی کی حکومت موجودہ مغربی استعمار کی بنائی گئی اقوام متحدہ کی ممبر ہو گی' کیا وہ ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے سودی نظام کی محتاج ہو گی۔ کیا وہ عالمی قوانین حقوق نسواں اور مذہبی آزدی کی تابع ہو گی' کیا اس کا عدالتی نظام رومن لاء کی پیوند کاری ہو گی۔ تمام علماء و فقہا اس کا جواب یقیناً نفی میں دیں گے۔ اس لئے کہ رسول ﷺ کی دعوت کا ایک مقصد ایسے آئین کی بادشاہی ہے جو صرف اور صرف قرآن اور سنت رسول اللہ ہے۔

براہمداغ بگٹی [illegible] لازم ہے احتیاط

نواب اکبر بگٹی کے بڑے بھائی عبدالرحمٰن بگٹی باپ سے ناراض ہو گئے۔ اپنے والد نواب محراب خان بگٹی کے خلاف ایک کتاب ''محراب گردی'' تحریر کی جس میں انہیں انگریزوں کا وفادار اور بلوچ عوام کا مخالف ثابت کیا۔ وڈیرہ خان محمد کلپر اس وقت جوان تھا۔ اس نے عبدالرحمٰن بگٹی کا ساتھ دیا۔ ایک قبائلی جنگ شروع ہوئی۔ عبدالرحمٰن بگٹی کو حالات اپنے لیے مناسب معلوم نہ ہوئے تو وہ افغانستان بھاگ گئے۔ اب محراب خان بگٹی کو فکر لاحق ہوئی، اس لیے کہ اپنے علاقے اور اپنے قبیلے کے درمیان انسان کا پتہ چلتا رہتا ہے کہ وہ کس قدر مضبوط ہے، کہاں سے وار کر سکتا ہے لیکن ایک دوسرے ملک میں بیٹھ کر تو وہ بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔ محراب خان بگٹی نے فوراً ڈپٹی کمشنر سبی کو درخواست کی کہ ان کے بیٹے کو افغانستان سے کسی نہ کسی طور پر واپس بلایا جائے چونکہ قبائلی علاقوں میں ریاستی رٹ قبائل کے ذریعے ہی قائم کی جاتی تھی اس لیے ان کا یکجا، پرامن اور ایک نظام کے تحت متحد ہونا ضروری تھا۔ اس لیے فوراً ڈپٹی کمشنر کوئٹہ کو تحریر کیا گیا کہ ناراض عبدالرحمٰن بگٹی کو واپس لایا جائے کیونکہ وہ ایک دن صرف بگٹی قبیلہ ہی نہیں بلکہ انگریز سرکار کے لیے بھی خطرہ بن سکتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کوئٹہ نے اپنی تحصیل گلستان میں افغان سرحد کے قریب آباد محمود خان اچکزئی کے والد عبدالصمد اچکزئی سے رابطہ کیا اور وہ عبدالرحمٰن بگٹی کو منا کر افغانستان سے واپس لائے۔ اب یہاں اس قبائلی جھگڑے کی کوکھ سے ایک انقلابی بننے والے عبدالرحمٰن کو مستقل طور پر پرامن بنانے کا مرحلہ تھا۔ انگریز سرکار نے انہیں فوری طور پر تحصیلدار کی نوکری کا پروانہ تھمایا اور نوشکی میں تعیناتی بھی کر دی۔ چونکہ نواب خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس لیے گھریلو سامان وغیرہ خریدنے کے لیے پانچ سو روپے بھی دیئے جو اس زمانے میں لاکھوں کے برابر تھے۔ اس وقت سے لے کر آج تک عبدالرحمٰن بگٹی اور ان کا خاندان ایک پرامن اور قانون پسند شہری کے طور پر زندگی گزار رہے ہیں۔ البتہ خان محمد کلپر ایک طویل صلح کے وقفے کے بعد دوبارہ نواب اکبر بگٹی سے لڑائی پر آمادہ ہو گیا۔ اس لڑائی کو کسی نے سلجھانے کی کوشش نہ کی بلکہ الٹا اس آگ کو ہوا دینے میں ریاستی اداروں اور پس پردہ طاقتوں نے اپنا کردار ادا کیا۔ ایک جانب نواب اکبر بگٹی تھا جس نے ریاستی طاقتوں کا اس وقت ساتھ دیا جب پورا بلوچستان ذوالفقار علی بھٹو کی ذاتی انا کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔ عطاء اللہ مینگل کی حکومت اس وقت ختم کی گئی جب وہ میزان چوک کوئٹہ میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کر رہے تھے اور کسی کو یقین تک نہ تھا کہ نواب اکبر بگٹی کو گورنر لگا دیا جائے گا۔ آج تبصرہ نگار ہزاروں افسانے تراشتے ہیں کہ اس وقت ایران کا دباؤ تھا، امریکی نہیں چاہتے تھے کہ روس کی جانب اچھے رویے رکھنے والے بلوچ برسراقتدار رہیں۔ یہ افسانے صرف اور صرف ذوالفقار علی بھٹو کی آمرانہ سوچ کو چھپانے کے لیے تراشے گئے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نواب بگٹی نے اپنی قبائلی عصبیت کی بنیاد پر بھٹو کی آمرانہ سوچ کا ساتھ دیا۔ اس دوران ریاستی رٹ قائم کرنے والے نواب اکبر بگٹی اور خان محمد کلپر میں جب جھگڑا شروع ہوا تو حکومتی اہلکاروں اور پس پردہ کام کرنے والوں کو سو طرح کے خیال سوجھنے لگے۔ نواب اکبر بگٹی اگر کمزور ہوتا ہے تو وہ ہماری بات آسانی سے مانے گا۔ خان محمد کلپر کو اگر ہم سپورٹ کرتے ہیں تو کل کو وہ ہمارے لیے ایک سرمایہ ثابت ہو گا۔ اس دوغلی پالیسی نے بگٹی قبیلے کو آگ اور خون میں نہلا دیا۔ کسی نے عبدالرحمٰن بگٹی والے معاملے کی طرح اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش نہ کی۔ شاید امن اس وقت کی انتظامیہ کی خواہش نہ تھی۔ قتل و غارت کا سلسلہ جو خان محمد کلپر کے بیٹے کے قتل سے شروع ہوا، نواب اکبر بگٹی کے بیٹے سلال بگٹی کے قتل پر اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ حکومتی افراد نواب اکبر بگٹی سے مسلسل رابطے میں رہتے، ان سے اپنے تعلقات مستحکم رکھتے اور ساتھ ساتھ خان محمد کلپر اور اس کے قبیلے کی مدد بھی مستقل جاری رکھتے۔ سلال بگٹی کے بعد یوں لگتا تھا، نواب اکبر بگٹی کی کمر ٹوٹ گئی ہو۔ وہ سلال بگٹی کو قبیلے کا مستقبل سمجھتے تھے اور وہ ان کی ذاتی تربیت میں تھا۔ سلال کی موت کے بعد براہمداغ کو نواب بگٹی نے اپنی تربیت میں لے لیا۔

میری نواب اکبر بگٹی سے آخری گفتگو اس وقت ہوئی جب وہ اپنے بگٹی قبیلے کی سرزمین چھوڑ کر مری قبیلے کے علاقے میں موجود ایک غار میں پناہ لینے جا رہے تھے۔ یہ غار اور گوریلا جنگ پر لکھی ہوئی فرانسیسی ادیب کی کتاب "FLFA "WAR OF THE'' ''مکھی کی جنگ'' جنگ نواب بگٹی کے دلچسپ موضوعات تھے۔ میرے سوالات بہت تھے لیکن ان کا جواب ایک ہی تھا کہ میرے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں بچا۔ نواب اکبر بگٹی اپنے تمام معاملات پر گفتگو اور ان کے حل کے لیے پرویز مشرف سے ملاقات پر راضی ہو گئے تھے۔ وہ اپنے قبیلے سے مشورے کے بعد ڈیرہ بگٹی سے سوئی روانہ ہوئے جہاں ایک بہت بڑا قافلہ انہیں چھوڑنے آیا۔ سوئی ایئرپورٹ پر کئی گھنٹے انتظار کے بعد بھی طیارہ نہ آیا اور کئی بہانے تراشے گئے۔ یہ راز اب بلوچستان کے بچے بچے کو معلوم ہے کہ وہ لوگ کون تھے جو یہ صلح اور امن نہیں چاہتے تھے۔ ایک مایوس، ناکام نواب اکبر بگٹی کے لیے قبیلے میں اپنی عزت و ناموس بچانے کے لیے اور کوئی راستہ نہیں بچا تھا کہ وہ ایک دوسرے قبیلے کی جانب کوچ کرے اور ان کے علاقے میں موجود غار میں پناہ لے لے۔ اس کے بعد کی کہانی انتہائی خونچکاں ہے۔ پرویز مشرف کے پرغرور فقرے کہ ''اب وہ زمانہ نہیں رہا، اب انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ ہم نے کدھر سے ان کو ''ہٹ'' کیا'' نے جس طرح جلتی پر تیل کا کام کیا اور پھر نواب بگٹی کی موت کے سانحے نے جس طرح بلوچستان کو ایک الاؤ کی شکل دے دی۔ اسے اس قوم نے دس سال بھگتا۔ جو الاؤ ہم نے خود روشن کیا تھا اور جس کی آگ کی تپش سے بھی ہم جلتے تھے۔ اس پر تیل تو پھر Raw نے بھی ڈالنا تھا۔ خاد نے بھی اور سی آئی اے نے بھی۔ وہ جنہیں اپنے خطے میں امن کی فکر ہوتی تھی ایک عبدالرحمٰن بگٹی کے افغانستان جانے پر ایک دم پریشان ہو جاتے تھے۔ ہم عجیب تھے 1948ء میں پرنس عبدالکریم اپنے بھائی خان آف قلات سے ناراض ہو کر افغانستان چلا گیا اور ایک انقلابی کی صورت جلوہ گر ہوا، ہمیں کوئی فکر لاحق نہ ہوئی۔ 1974ء میں کتنے پشتون اور بلوچ قبائل افغانستان گئے، وہاں روس اور افغانستان سے مدد لیتے رہے، ہم نے آرمی ایکشن سے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی، مسئلہ الجھتا گیا، کیا کوئی تاریخ کا یہ سبق نکال کر بغیر کسی تعصب سے پڑھ سکتا ہے کہ بلوچستان میں 1977ء سے 2005ء تک 28 سال کس وجہ سے امن قائم ہوا اور قائم رہا۔ یہ وہ دور تھا جب ہم افغان جنگ لڑ رہے تھے لیکن بلوچستان پرامن تھا۔ اس لیے کہ ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی منتقمانہ روش چھوڑ کر سب سے پہلے حیدرآباد غداری کیس ختم کیا اور پھر پورے بلوچستان میں عام معافی کا اعلان کر دیا۔ افغانستان میں بیٹھے کسی بلوچ یا پشتون کو واپس آنے کے لیے کوئی ''را''، کوئی ''خاد'' یا کوئی ''کے جی بی'' نہ روک سکی۔ سب واپس اپنے گھروں میں لوٹ آئے۔ میں اس وقت بلوچستان یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا، وہاں اکثریت ایسے طلبہ کی تھی جو افغانستان سے لوٹے تھے اور وہ آج بلوچستان کی انتظامیہ میں اہم عہدوں پر فائز ہیں۔ آپ اپنے لوگوں کو سینے سے لگائیں تو کوئی ان کو آپ سے دور نہیں کر سکتا۔ بلوچستان کا بلوچ اور اس کی لیڈرشپ اچھی طرح جانتی ہے کہ پاکستان کے سوا ان کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔ ایران میں اتنے ہی بلوچ ہیں جتنے پاکستان میں لیکن وہ تو وہاں انتہائی غربت و افلاس میں ہیں، سیاست میں ان کا حصہ صفر ہے اور انتظامیہ میں نہ ہونے کے برابر یہاں تک کہ وہ اپنے مسلک کے مطابق نماز بھی ادا نہیں کر سکتے۔ افغانستان کے پشتون ان پر چڑھ دوڑیں گے، عرب ریاستیں انہیں اپنا باج گزار بنا لیں گی۔ انہیں علم ہے کہ پاکستان ہی ان کی پناہ گاہ اور ان کا مستقبل ہے۔ لیکن اگر پناہ گاہ کے لوگ ہی ان پر بندوق تان لیں تو وہ کہاں جائیں۔ مدتوں کے بعد موجودہ عسکری و سیاسی قیادت نے ضیاء الحق ہی کی اس پالیسی کو دوبارہ زندہ کیا۔ عام معافی کا اعلان کیا گیا اور آج اس کے ثمرات پورے بلوچستان میں نظر آ رہے ہیں۔ میں چند ہفتے قبل کوئٹہ گیا تو مجھے کوئٹہ ویسا تو نہیں لیکن بہت بہتر نظر آیا۔ اسی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ براہمداغ بگٹی واپس آنا چاہتا ہے۔ یہاں احتیاط لازم ہے۔ جو لوگ بلوچ نفسیات سے واقف ہیں وہ اسے کبھی بھی اپنی فتح نہیں کہیں گے بلکہ ناراض بھائی کی واپسی کہیں گے اور دوسری احتیاط یہ ہے کہ اب اسے واپس لے آئیں کہ یہی امن کا راستہ ہو گا۔ بہت سے مشورہ دینے والے موجود ہیں، ایسے دانشور جن کا بلوچستان سے رابطہ ہے پریس کلب کے صحافیوں اور اعلیٰ پولیس افسروں سے زیادہ نہیں رہا۔ وہ طرح طرح کے مشورے دے رہے ہیں' قبائلی مخالف اپنی فتح چاہتے ہیں لیکن براہمداغ کی واپسی امن کی ضمانت ہو گی۔ قبائلی زندگی میں قبیلہ ایک اکائی ہوتا ہے کوئی ٹکری وڈیرے کی، وڈیرہ سردار کی اور سردار نواب کی جگہ نہیں لے سکتا اور نہ خاندان بدلے جا سکتے ہیں۔ انگریز نے مری اور مینگل قبیلے میں ایسا کرنا چاہا، منہ کی کھائی۔ احتیاط لازم ہے۔ ایسا نہ ہو کہ براہمداغ بھی نواب اکبر بگٹی کی طرح ایئرپورٹ پر طیارے کا انتظار کرتا رہے اور پھر بلوچستان ایک بار پھر امن کو ترس جائے۔

مادہ پرستی اور ٹیکنالوجی کی پوجا

ٹیکنالوجی اور مادہ پرستی کے مقابلے میں آپ اللہ کی نصرت اور تائید کی گفتگو کر کے دیکھیں، ٹیکنالوجی اور مادہ پرستی کے بت کے پجاری یوں پنجے جھاڑ کر آپ کے پیچھے پڑ جائیں گے جیسے آپ نے ان کے خدا کو برا بھلا کہہ دیا ہو۔
گزشتہ دنوں توکل علی اللہ اور جذبہ ایمانی پر گفتگو شروع ہوئی تو مخالفت میں کتنے لکھاری میدان میں کود پڑے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کبھی بھی اپنے اس ٹیکنالوجی کے بت کی شکست برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی عالمی طاقت کسی نہتی قوم سے شکست کھا جائے تو پہلے تو اس شکست کو شکست ہی تسلیم نہیں کریں گے۔ ڈھیلا سامنہ بنا کر کہیں گے وہ عالمی طاقت خود وہاں سے جانا چاہتی تھی، اس بے آب و گیاہ علاقے میں انہوں نے کیا لینا۔ اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ پھر وہاں لینے کیا آئے تھے، اپنے فوجی مروانے؟ اپنی شاندار ٹیکنالوجی کا مذاق اڑوانے؟ ایسے میں جواب دیں گے، کیا حاصل کر لیا اس قوم نے بڑی طاقت سے لڑ کے، خود کو ہی تباہ کروالیا۔ ایسی جیت کا کیا فائدہ۔ چرچل کا برطانیہ تباہ ہو جائے لیکن وہ جنگ جیت جائے تو چرچل ہیرو۔ وہاں کوئی یہ گفتگو نہیں کرتا کہ ایسی لڑائی اور جیت کا فائدہ جس میں ملک ہی تباہ ہو جائے۔ آخر "حکمت عملی" بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک کسی ایسی طاقت کی فتح ناممکن ہے، جس کی قوت انسانی ذہن کے ادراک میں نہ آسکے۔ جہاں کوئی کمزور فتح یاب ہونے لگتا ہے تو اسے اللہ کی نصرت سے تعبیر نہیں کرتے بلکہ "شاندار حکمتِ عملی" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ غزوہ احد میں وہ شکست کو اللہ کی طرف سے مسلمانوں کا امتحان تصور نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی حکمت عملی پر صحابہ کا عمل نہ کرنا ہے۔ لیکن میرا اللہ جو دلوں کے بھید جانتا ہے اور جسے علم ہے کہ دلوں میں کونسا کوڑھ چھپا ہوا ہے اس نے ٹیکنالوجی اور مادہ پرست لوگوں کا قرآنِ پاک میں کیسا منہ توڑ جواب دیا ہے۔ اُحد کی شکست کے بعد چند مسلمان جو نئے داخل اسلام ہوئے تھے یہ سوچنے لگے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود ہیں اور پھر بھی ہمیں شکست ہو گئی۔ ایسے میں اللہ تبارک و تعالی نے سورۃ آلِ عمران میں اس شکست کی وجوہات پر کئی آیات نازل کیں۔ اللہ فرماتا ہے "اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے، تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے، اور حق یہ کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف کر دیا کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے (آل عمران 152) اللہ نے اُحد کی شکست کی ایک ہی وجہ بتائی اور وہ تھی چند مسلمانوں کی طلب دنیا کی خواہش کی لغزش تھی۔ ایک اور جگہ کسقدر واضح طور پر اللہ نے اُحد کی لڑائی کے بارے میں بتایا کہ مسلمانوں پر یہ مصیبت اللہ کی اجازت سے نازل ہوئی۔ اللہ فرماتا ہے "جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ دیکھ رہا ہے کہ تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون (آل عمران 166) اُحد کے اس معرکے کے بعد مسلمانوں کا ایمان اللہ کی ذات پر اور مستحکم ہو گیا تھا اور اسی پختہ ایمان کے ساتھ ہی وہ اگلے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی میں کفار مکہ کا پیچھا کرنے کے لیے حمرا الاسد تک گئے تھے۔ اُحد کی شکست کے بعد نازل ہونے والی تمام آیات اللہ کا یہ اصول بتاتی ہیں کہ فتح و نصرت نہ افرادی قوت سے ہے اور نہ ہی ٹیکنالوجی سے بلکہ صرف اور صرف اللہ کی مہربانی ہے۔ اسی شکست کے بارے اللہ فرماتا ہے کہ انسان کی موت سے حفاظت بھی اللہ کی مرضی ومنشاء پر ہی منحصر ہے۔ اُحد کے بعد منافقین یہ طعنہ دیتے تھے کہ اگر یہ شہید ہونے والے لوگ جنگ کیلیے نہ نکلتے تو آج زندہ ہوتے۔ اللہ نے انہیں اسی سورۃ آل عمران میں جواب دیا ہے۔ "کہہ دو کہ، اگر تم گھروں میں ہوتے تب بھی جن کا قتل ہونا مقدر میں لکھا جا چکا تھا وہ خود باہر نکل کر اپنی اپنی قتل گاہوں تک پہنچ جاتے (آل عمران 155)"
ٹیکنالوجی اور مادہ پرستی کے پجاریوں کو اگر آپ قادسیہ میں دنیا کی سپر پاور ایران کی چند فاقہ کش مگر اللہ پر توکل رکھنے والوں کے ہاتھوں شکست کی داستان سنائیں، مصر، شام اور سپین کی فتح کے قصے بتائیں تو کہیں گے کہ یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ ہوتے ہوں گے معجزے، کون سا ہم نے دیکھے ہیں۔ تم آج کے دور کی بات کرو۔ لیکن آج کے دور میں افغانستان ان کے گلے کی ایسی ہڈی ہے کہ انہیں اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے سو سو وضاحتیں کرنا پڑتی ہیں۔ کیسے مان لیں یہ طاقت کے پجاری کہ صرف سو سالوں کے اندر تین عالمی طاقتوں نے یہاں شکست کھائی ہے۔ انگریز جس نے شکست کھائی اس کے مورخین اور جرنیل تک تسلیم کرتے ہیں، لیکن یہ ٹیکنالوجی کے پجاری وضاحتیں دیتے پھرتے ہیں۔ انگریز تو وہاں چلا گیا تھا، فتح بھی حاصل کر لی تھی۔ لیکن پھر حکمتِ عملی کے طور پر افغانستان کو بفر زون بنا کر وہاں سے نکل آیا۔ انگریز تو وہاں رہنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ روس اور افغانستان کی جنگ میں ان لکھاریوں کو سجدہ کرنے کے لیے امریکہ کا بہت بڑا بت مل گیا تھا اور وہ آج بھی کہتے پھرتے ہیں کہ اگر سٹنگر میزائل نہ ہوتے اور امریکی امداد نہ ہوتی تو روس کو یہ نہتے افغان شکست نہ دے سکتے تھے۔ ان کے اس امریکہ بہادر کی یہ ٹیکنالوجی اس وقت فتح کیوں نہ حاصل کر سکی جب وہ ماوزے تنگ کے مقابلے میں چیانگ کائی شیک کی مدد کو آئی تھی اور ذلیل ہو کر نکلی تھی۔ ویت نام میں اس ٹیکنالوجی کو کیا زنگ لگ گیا تھا؟ ساٹھ ہزار لاشیں اٹھا کر چوہے کی طرح بھاگے۔ نیپام بموں سے لے کر ڈیزی کٹر تک سب کچھ تو تھا۔ ایک ایسا ہی طاقت کا پجاری لکھاری اکثر طعنے دیتا رہتا ہے کہ تم لوگ اسپرو کی گولی تک ایجاد نہیں کر سکتے اور امریکہ سے لڑنے چل پڑتے ہو۔ کوئی پوچھے ذرا وہ تاریخ ہی بتا دیں جب ویتنام نے اسپرو کی گولی ایجاد کی تھی اور پھر اس کے نتیجے میں امریکہ کو شکست دی تھی۔ افغانستان میں فتح ان فرزانوں کی تھی جن کا توکل صرف اللہ پر تھا۔ ایسی فتح کہ جس کے نتیجے میں ایک عالمی طاقت ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اگر امریکہ کی مدد یا ٹیکنالوجی نے ہی جیتنا ہوتا تو آج سارا لاطینی امریکہ، امریکہ کا غلام ہوتا۔ وہاں بدترین شکست اس کا مقدر ہوئی۔ افغانستان میں تیسری شکست کھانے والی طاقت خود امریکہ ہے۔ جو اپنے 48 حواریوں کے ساتھ افغانستان میں داخل ہوا۔ کوئی پڑوسی ساتھ نہیں۔ دوست ملک پاکستان سے 57 ہزار امریکی جہاز اڑے اور افغان سرزمین پر انہوں نے بم برسائے۔ لیکن جیت کس کا مقدر ہوئی۔ یہ آج کا سب سے کڑوا سچ ہے۔ برابری کی سطح پر قطر میں آج مذاکرات کون کر رہا ہے اور ہر روز بھیک کون مانگ کر رہا ہے، روز امریکہ کی جھڑکیاں، طعنے اور کبھی کبھی گالیاں کون سن رہا ہے۔ صرف گریبان میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ ملا محمد عمر نے کہا تھا "افغانستان گوند کا تالاب ہے" آپ طاقت کے بل بوتے پر اس میں چھلانگ تو لگا دیتے ہو لیکن موت تمہارا مقدر ہوتی ہے۔
شاید کوئی نئی تحقیق کرنے والا بر آمد ہو جائے جو ثابت کرنے پر تل جائے کہ افغانستان کو ہمیشہ شکست ہی ہوئی ہے۔ طاقت اور ٹیکنالوجی کے پجاریوں کا بس نہیں چلتا کہ تاریخ کو ایک نئے انداز سے تحریر کریں، اور بتائیں کہ محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری نے ہندوستان میں ذلت آمیز شکست کھائی تھی۔ یزدگرد نے خود اپنا علاقہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں کو دے دیا تھا، کیونکہ وہ اپنی قوم سے ناراض، تھا جنہوں نے اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ شیواجی کے پاس چار لاکھ کی عظیم فوج تھی، دیکھو تاریخ نے کس قدر جھوٹ لکھا ہے کہ صرف 35 ہزار سپاہیوں کے ساتھ احمد شاہ ابدالی نے اسے شکست دے دی تھی اور مرہٹوں کا غرور خاک میں ملایا تھا۔ کیا ایسا ممکن ہے، انسانی عقل اس کو مان سکتی ہے۔ ہو سکتا ایسی تاریخ کل لکھی جائے تاکہ ان ٹیکنالوجی اور مادہ پرستی کے پجاریوں کو چین کی نیند نصیب ہو سکے۔ اس لیے کہ انہیں چین اسی وقت نصیب ہوتا ہے جب کوئی مسلمانوں کی ذلت ورسوائی کی داستان بیان کرے اور ان کی ناکامی کی کہانی انہیں سنائے۔
یہی لکھاری ہی تو ہیں جو طویل بحثیں کرتے ہیں۔ کالم لکھتے ہیں کہ نصاب سے جہاد کی آیات خارج کرو۔ ظاہر بات ہے اگر بچپن سے جہاد سے محبت کا درس نہ ہو گا تو کس کو حیدر کرارؓ کی شجاعت یاد ہو گی اور کون نشان حیدر سے محبت کرے گا، اور کس کا خون یہ ترانہ سن کر جوش مارے گا "اے راہ حق کے شہید وفا کی تصویرو" اور کسی کو علم تک نہ ہو گا کہ "علی تمہاری شجاعت پہ جھومتے ہوں گے" کا اشارہ کس جانب ہے۔ جب قوم کے بچے بوڑھے، جوان جہاد کے درس سے ناآشنا ہوں گے تو کس قدر آسان ہو گا پوری قوم کو یہ قائل کرنا کہ بھارت پانچ گنا بڑی طاقت ہے اور ہم کس قدر بے وقوف ہیں کہ وسائل کی اس دنیا میں بے سروسامانی کے عالم میں بھارت کے مقابل میں کھڑے ہیں۔ جذبہ ایمانی اور توکل علی اللہ جیسی باتیں لوگوں کے دماغ سے نکل جائیں گی اور ٹیکنالوجی کے یہ پجاری کس قدر مسرت سے ناچیں گے۔ لیکن میرا اللہ یہ نہیں چاہتا: اس لیے کہ اسے شرک سخت ناپسند ہے خواہ وہ اس کے ساتھ ٹیکنالوجی کو شریک کر کے ہی کیا جائے۔

من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

انسانی تاریخ میں کہے جانے والے چند بڑے اقوال میں سیدنا عمرؓ کا قول "ماؤں نے لوگوں کو آزاد جنا تھا تم نے انہیں غلام بنانا کہاں سے سیکھ لیا" انسانیت کے آسمان پر صدیوں سے کہکشاں کی طرح جگمگا رہا ہے۔ چودہ سو سال پہلے کہا جانے والا یہ قول یقیناً اسلام کی تعلیمات اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تربیت کا نتیجہ ہے ورنہ عرب کے بادیہ نشین قبائلی معاشرے میں گندھے ہوئے عمرؓ ابن خطاب کو انسانی معراج کی بلندیوں کا کہاں علم تھا۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں انسانوں پر انسانوں کی بادشاہت ہر سطح پر موجود ہو گھروں میں غلام اور کنیزیں معاشرے میں اکھڑ اور مغرور سردار اور علاقوں پر ظالم بادشاہ اور فرمانروا۔ ایسے معاشرے میں صرف 23 سال کی تربیت کا یہ عالم کہ خطبہ حجتہ الوداع میں میرے آقا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یہ اعلان کریں کہ "آج تمہاری جاہلیت کے نسل رنگ اور عصبیت کے بت میرے پاؤں تلے کرچی کرچی ہو چکے"۔ اگر کوئی سیاح 612 عیسوی کے لگ بھگ جزیرہ نمائے عرب کا دورہ کرتا جب ابھی رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت نہیں ہوئی تھی اور اپنے ذہن میں عرب کے معاشرے کا ایک نقشہ بٹھا لیتا۔ اس نقشے کو بیان کرنے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ دنیا اس تہذیب و تمدن سے الگ تھلگ جنگ و جدل اور عصبیت میں رچے ہوئے عرب معاشرے کو خوب جانتی ہے۔ دنیا کے نقشے پر نہ وہ ایک عظیم سلطنت تھے اور نہ ہی علوم و فنون سے آراستہ کوئی قوم۔ سیاح 23 سال کے بعد واپس لوٹتا تو دم بخود رہ جاتا۔ حیرت سے ان انسانوں کو دیکھتا جنہیں وہ صرف دو دہائیاں پہلے انسانیت کے نچلے ترین درجے پر دیکھ کر گیا تھا آج یہ لوگ کیسے پوری دنیا کے لئے انسانی اخلاقیات اور احترام آدمیت کے مشعل بردار بن چکے ہیں۔ اسے یقیناً اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا۔ اس لئے کہ یہ انفراسٹرکچر اور عمارات کی تبدیلی نہیں تھی انسانوں کی تبدیلی تھی۔ آپ کسی بھی شہر میں ہزاروں لاکھوں مزدور لگا کر بڑے بڑے پلازہ عالیشان عمارتیں بہترین پل دلکش باغات اور حیرت انگیز سہولیات فراہم کر سکتے ہیں اور یہ سب 23 سال کے عرصے بلکہ اس سے بھی کم میں ممکن ہے۔ محنت سے آپ ایک پورا شہر نیا آباد کر سکتے ہیں لیکن آپ ایک ایسا معاشرہ تخلیق کر دیں جس میں غرور و نخوت میں ڈوبے ہوئے عرب معاشرے میں حضرت عمرؓ جیسا فرد پوری زندگی ایک حبشی غلام حضرت بلالؓ کو سیدنا بلال یعنی میرے آقا بلال کہہ کر پکارے۔ جہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک بستی سے گزریں اور ایک شخص اپنے غلام پر سختی کر رہا ہو اور آپ فرمائیں دیکھو جتنا اختیار تمہیں آج اس غلام پر حاصل ہے اللہ کو روز قیامت اس سے کئی گنا اختیار تم پر حاصل ہو گا تو وہ تھر تھر کانپنے لگے اور فوراً یہ پکار اٹھے "میں نے اللہ کی رضا کے لئے اس غلام کو آزاد کیا۔ عصبیت سے بھرے معاشرے میں کوئی سوچ سکتا تھا کہ خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اللہ کے گھر کی جانب بلانے کا اعزاز ایک حبشی غلام سیدنا بلالؓ کو حاصل ہو گا۔ کسی نے کبھی تصور بھی کیا تھا کہ لوگوں میں آخرت کی جوابدہی کا احساس اس قدر پختہ ہو جائے گا اور افراد اللہ کے سامنے جانے سے اس قدر ڈریں گے کہ ان کی خواہش یہ ہو گی کہ ان کے گناہوں کی سزا انہیں یہیں مل جائے۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ ماعزؓ نے زنا کا ارتکاب کیا۔ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے ماعز ہلاک ہو گیا۔ فرمایا اللہ سے معافی طلب کرو وہ غفور و رحیم ہے۔ دوسری دفعہ پھر دہرایا "ماعز ہلاک ہو گیا"، وہی جواب ملا تیسری دفعہ دہرایا اور کہا میں اپنے جرم کی سزا یہیں بھگتنا چاہتا ہوں اللہ کے سامنے پیش ہونے سے ڈرتا ہوں۔ سنگسار کر دیئے گئے تو آپؐ نے فرمایا ماعز نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر پورے مدینے پر تقسیم کر دی جائے تو کافی ہے۔ غرور و نخوت سے بھرپور معاشرہ جس کی حالت یہ کہ جب ابو جہل بدر کے میدان میں معاذ و معوذ کے ہاتھوں زخمی ہو کر گر پڑا اور موت کی گھڑیاں گن رہا تھا تو عبداللہ بن مسعودؓ اس کے سینے پر چڑھ گئے۔ یہ وہی عبداللہ بن مسعود جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا جاؤ مکہ کے بازار میں جا کر قرآن سنانا شروع کرو۔ ان کو اللہ نے خوش الحانی بخشی تھی۔ آپؐ ان سے رمضان میں قرآن پاک سنا کرتے تھے اور فرماتے تھے اللہ نے تمہیں حضرت داؤد علیہ السلام کے مضامیر میں سے ایک مضامیر عطا کیا ہے۔ انہوں نے قرآن سنانا شروع کیا تو ابو جہل کے حکم سے لوگوں نے انہیں تھپڑ مارنا شروع کر دیئے لیکن آپ بازار کے آخر تک قرآن سناتے گئے۔ آج وہ عبداللہ بن مسعود ابو جہل کے سینے پر سوار ہوئے تو سرداری زعم میں بولا، مجھے آج یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ پھر کہنے لگا دیکھو آج اگر میرا سر قلم کرو تو گردن کے نیچے سے کاٹنا تاکہ کٹے ہوئے سروں میں پڑا ہوا معلوم ہو کہ سردار کا سر ہے۔ ایسے معاشرے میں خوف خدا کا تصور جاگزیں کرانا، لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کر کے اللہ کی غلامی کا اسیر بنانا اور پھر اعلان کرنا کہ تم میں سے کسی کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر، کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ ہاں فضیلت اس کو ہے جو اللہ سے تم سب سے زیادہ ڈرتا ہے۔ یہ تھا معاشرہ جس سے ایسے افراد نے جنم لیا جو پڑوسی کی ناراضی سے ڈرتے تھے۔ یتیم، مسکین، لاچار اور بیوہ کا حق ادا نہ کرنے سے ڈرتے تھے۔ ایسے معاشرے میں ہی یہ قول تاریخ کی راہداریوں میں گونجتا ہے کہ "ماؤں نے لوگوں کو آزاد جنا تھا، تم نے انہیں غلام بنانا کہاں سے سیکھ لیا۔"

چودہ سو سال پہلے جس معاشرے نے جنم لیا تھا وہ معاشرہ زیادہ آزاد اور انسانی غلامی سے دور تھا یا آج کا جمہوریت اور جمہوری اقدار کا امین معاشرہ۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ترتیب دیئے گئے اور تربیت سے نکھرے ہوئے گروہ کو اگر ایک پارٹی تصور کر لیا جائے تو ان میں ہر کوئی صرف اور صرف اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کا پابند تھا۔ ان کے گلے میں صرف اللہ کی غلامی اور سید الانبیاء کی فرمانبرداری کا طوق ہے۔ اب ذرا اس جمہوری اقدار کے معاشرے میں قائم پارٹیوں، گروہوں، انجمنوں، یونینوں اور ایسوسی ایشنوں کو دیکھیے تو آپ حیرت میں گم ہو جائیں گے۔ امریکہ اور یورپ سے لے کر ترقی پذیر جمہوری ممالک تک سب جگہ یہ گروہ بدترین غلامی کی مثال ہے۔ مغرب میں جو گروہ پارٹی فنڈنگ کرتا ہے اس کی مرضی کی پالیسی پارلیمنٹ یا کانگرس میں چلتی ہے۔ کوئی اس کے خلاف بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ جس تنظیم کے بورڈ آف گورنرز یا ڈونرز بورڈ کے افراد جس قدر سرمایہ فراہم کریں گے وہ تنظیم اسی قدر ان کی رائے کا احترام اور ان کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہو گی۔

ہمارے جمہوری معاشرے کا کیا کہنا۔ پارٹی کے لیڈر دن میں اتنا اللہ کا ذکر نہیں کرتے جتنا میرے قائد، میرے لیڈر، یا میرے رہنما کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ جرم کرے، کرپشن کرے، بددیانتی کرے، کسی کو قتل کرے یا قتل کروائے، کسی کو بھری محفل میں ذلیل و رسوا کر دے، وہ قائد ہی رہتا ہے اس کے سامنے زبان نہیں کھولی جا سکتی۔ سب سے اہم بات یہ کہ ان تمام افراد کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ بددیانت ہے، چور ہے، ظالم ہے لیکن مسلسل جھوٹ بول کر اس کا دفاع کرتے ہیں۔ یہ وہ غلامی ہے جو بظاہر نظر آتی ہے۔ کبھی ان گروہوں، پارٹیوں، انجمنوں اور ایسوسی ایشنوں میں شامل ہو کر دیکھیں آپ کو انسانوں کی انسانوں پر حکومت اور بدترین غلامی کی وہ صورت نظر آئے گی کہ آپ کانپ اٹھیں۔ اقبالؒ نے اسی غلامی کو کتے کی زندگی سے بھی بدتر تعبیر کیا ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرے داشت و لے نذر قباد و جم کرد
یعنی در خوئے غلامی ز سگان خوار تر است
من نہ دیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

انسان اپنی بصیرت کی کمی کی وجہ سے انسان کی غلامی کرتا ہے۔ اسے اللہ نے آزادی کی نعمت عطا کی لیکن وہ اسے بادشاہوں کے سامنے بیچ دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ غلامی تو کتے کی زندگی سے بھی بدتر ہے۔ میں نے آج تک کسی کتے کو دوسرے کتے کے سامنے سر خم کرتے نہیں دیکھا۔

مرد درویش مرد قلندر

جو لوگ تاریخ کو حرف آخر سمجھتے ہیں اور اس کی بنیاد پر شخصیات کا تعین اور خصوصاً عقیدے کی بنیاد رکھتے ہیں ان کے لئے کیا صرف ایک یہی گواہی کافی نہیں کہ اس ملک میں سنی سنائی کہانیوں پر مبنی کتنے افسانے ملا محمد عمر کی زندگی اور طالبان کے دور حکومت کے بارے میں عام مل جاتے ہیں۔ یہ بنی امیہ' بنی عباس اور بنی فاطمی ملوکیت کا دور نہیں کہ ظلم اور جبر کے تحت تاریخ لکھوائی جاتی ہو۔ یہ جمہوریت' آزادی اظہار اور قلم کی حرمت و تقدس کا دور ہے۔ لیکن اس دور میں بھی آپ کو ملا محمد عمر کے بارے میں گفتگو کرنے' لکھنے والے اور تبصرے کرنے والے اکثریت میں ایسے ملیں گے جن کی ان سے زندگی بھر کبھی ملاقات تک نہیں ہوئی۔ جبکہ طالبان کے افغانستان میں چھ سالہ سنہری دور پر لکھنے والوں کی بھی اکثریت ایسی ہے جنہوں نے کبھی بھی تورخم یا سپین بلدک کے دوسری جانب قدم نہیں رکھا' جنہیں افغانستان میں بولنے والی ایک زبان بھی نہیں آتی' جن کے تجزیات عالمی اخبارات کے تراشوں' تعصب کی ملاوٹ سے بھرپور تحریروں اور من گھڑت خفیہ رپورٹوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ آج اگر کوئی مورخ پاکستان میں ملا محمد عمر اور افغانستان میں طالبان کے دور حکومت کے بارے میں کتاب لکھنا چاہے تو اسے جو عمومی تصور یہاں ملے گا وہ نوے فیصد سے زیادہ بے بنیاد اور گروہی و فرقہ وارانہ تعصب کی عینک لئے ہوئے ہوگا۔ یہ صرف پندرہ سال پہلے کی تاریخ ہے' اس دور کے لوگ ابھی زندہ ہیں لیکن سچ اس قدر دھندلا دیا گیا ہے کہ کسی کو بولنے کا یارا نہیں۔ تاریخ کی سچائی کا اندازہ اس طرح کی ہزاروں موجودہ دور کی مثالوں سے دیا جاسکتا ہے۔ ضیاء الحق کے دور میں تحریروں پر اعلیٰ ترین سول ایوارڈ لینے والے آج ان کے سب سے بڑے ناقد ہیں۔ پاکستان کے گزشتہ تیس سالوں کی آمریتوں کے اپنے اپنے مورخ اور مداحین ہیں اور وہ اعلیٰ پایہ کے نثر نگار بھی ہیں' اپنے زمانے کے طبری' واقدی اور بلاذری۔ ان تین مورخوں نے افسانے تو تین سو سال بعد تحریر کئے' لیکن ان دانشوروں نے تو اپنی زندگی میں ہی افسانوں کو حقیقت بنا دیا۔

ملا محمد عمر۔ قندھار کے ایک کچے گھر کے چھوٹے سے کمرے سے چھ سال تک افغانستان کو ایک پرامن اور خوشحال ملک میں بدلنے اور پندرہ سال دنیا کی چالیس کے قریب عالمی طاقتوں سے تن تنہا لڑنے والا مرد مجاہد۔ کیا آج ایسا تصور اس کے بارے میں پاکستان میں پایا جاتا ہے۔ کیا ہمارا میڈیا اور اس پر جلوہ گر ہونے والے تجزیہ نگار اور مورخین سچ بولتے ہیں۔ تعصب اور نفرت نے جھوٹ ان کی زبانوں پر جاری کر رکھا ہے۔ لیکن کوئی تو سچ بولے' کوئی تو یہ بتائے کہ 1995ء سے 2000ء تک اس کا گر چمن' پشین' لورالائی' ژوب' پشاور' مردان' سوات یا پاکستان کے کسی بارڈر کے قریبی شہر جانے کا اتفاق ہوا تھا اس نے سرحد کے اس پار سے ملا محمد عمر اور طالبان کے حکومتی انصاف کی خوشبو ضرور محسوس کی ہوگی۔ اس نے عام آدمی کی زبان پر یہ دعا ضرور دیکھی ہوگی کہ ہمارے ہاں کوئی ایسا حکمران کیوں نہیں آجاتا۔ ایسی خواہش لوگوں کے دلوں میں دو دفعہ جاگی۔ ایک جب ایران میں آیت اللہ خمینی نے اقتدار سنبھالا اور دوسری دفعہ ملا محمد عمر کے زمانہ حکومت کے دوران۔ سرحدی شہروں کے کتنے لوگ تھے جو اپنے مقدمات فیصلوں کے لئے طالبان کے پاس لے جاتے تھے۔ 1997ء میں جان محمد دشتی ڈپٹی کمشنر کوئٹہ تھا۔ میں چاغی سے اسے ملنے گیا۔ اس کے دفتر میں چند پشتون بیٹھے تھے۔ دشتی بلوچ آدمی تھا' اس کی پشتو کمزور تھی' مجھے ترجمے کے لئے بٹھا لیا۔ کہانی یہ تھی کہ چار لوگوں نے ان افراد کے کئی کروڑ افغانی اور ایک موٹر سائیکل فراڈ سے ہتھیا لئے تھے۔ چاروں پکڑے گئے۔ دو کو ایس ایچ او نے مقدمے سے فارغ کر دیا اور دو کو سیشن جج نے بری کر دیا۔ دو لوگ بھاگ کر قندھار چلے گئے۔ وہ اپنا مقدمہ لے کر قندھار گئے' گواہ پیش ہوئے۔ آدھے پیسے اور موٹر سائیکل طالبان نے واپس کروا دیئے' باقی آدھے ان دونوں کے پاس تھے جو پاکستان میں تھے۔ وہ لوگ ڈپٹی کمشنر سے درخواست کر رہے تھے کہ ان دونوں کو ہمارے حوالے کریں' ہم قندھار لے جاکر طالبان سے انصاف کروائیں گے۔

روس افغانستان سے رخصت ہوا تو تباہ حال افغانستان بدامنی' لوٹ مار اور قتل و غارت کا گڑھ بن گیا۔ افغان مجاہدین کے گروہ آپس میں اس طرح دست و گریبان ہوئے کہ چاروں جانب اسلحہ و بارود کی بو پھیل گئی۔ چمن سے قندھار تک صرف ستر میل کا فاصلہ ہے لیکن اس تھوڑے سے فاصلے میں جگہ جگہ مختلف افغان مجاہدین گروہوں نے اپنی چیک پوسٹیں لگا رکھی تھیں جو ہر گزرنے والی گاڑی سے جبری ٹیکس وصول کرتی تھیں۔ امن و امان کا یہ عالم کہ نہ کسی کی جان محفوظ اور نہ مال۔ کابل شہر کے دونوں اطراف توپیں نصب تھیں اور شہر کھنڈر بن چکا تھا۔ نجیب اللہ ایک بے طاقت اور مجبور محض حکمران کی صورت موجود تھا۔ ملا محمد عمر سے میری ملاقات اسی دور آشوب میں ہوئی جب روس ابھی رخصت ہوا تھا۔ ایک درد دل رکھنے والا مسلمان جو مسلمانوں کی اس باہمی لڑائی پر ہر وقت کڑھتا رہتا۔ اس کے لئے یہ تمام لوگ اجنبی نہ تھے' اس نے ان کے شانہ بشانہ جہاد میں حصہ لیا تھا لیکن طاقت اور غلبے کی ہوس نے انہیں کیا بنا دیا تھا۔ چمن شہر سے قندھار تک وہ ہر ذی روح کے دکھ سے واقف تھا۔ یہ لوگ تو واقعی قریہ ظالم کے شہری تھے کہ جو سورہ نساء کی آیت کے مطابق پکار پکار کر کہتے تھے کہ اللہ ہمارے لیے کوئی مددگار بھیج دے۔ تجزیہ نگار جو چاہے کہہ لیں' طاقت کے پجاری بے شک اسے ایک جھوٹی' لغو اور بے بنیاد کہانی کے ذریعے امریکہ اور آئی ایس آئی کی تخلیق کہہ لیں لیکن بلوچستان کے اس خطے کے رہنے والے ہزاروں لوگوں کو وہ وقت اب بھی یاد ہے کہ ایک صبح ملا محمد عمر نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں نے خواب میں سید الانبیاء ﷺ کو دیکھا ہے جو مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ اٹھو جہاد شروع کرو اور امن قائم کرو' اللہ تمہیں نصرت دے گا۔ اس کے بعد اس خطے کے میرے جیسے لاکھوں لوگ جانتے ہیں کہ کیسے ملا محمد عمر نے قندھار میں موجود سید الانبیاء ﷺ کے جبہ مبارک کو نکالا اور پھر کس طرح لوگوں نے جوق در جوق اس جبہ مبارک کو سامنے رکھتے ہوئے ملا محمد عمر کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد رسول اکرم ﷺ کی دی گئی بشارت کا وقت آیا۔ ایک گولی چلائے بغیر قندھار کی تمام فوج نے ملا محمد عمر کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کی نصرتوں کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ چند ہزار لوگ جس جانب بڑھے فتح و نصرت ان کے قدم چومتی رہی' اتنی کم مزاحمت کہ صرف چند مہینوں میں نوے فیصد افغانستان ملا محمد عمر کے زیر نگیں تھا۔ میں اس وقت ایک ایسے ضلع کا ڈپٹی کمشنر تھا جس کا کئی سو میل بارڈر افغانستان سے ملتا تھا۔ تمام صوبائی انتظامیہ سے لے کر بڑی سے بڑی خفیہ ایجنسیوں کے فرشتوں تک کو بھی خبر نہ تھی کہ سب کیسے ہو رہا ہے۔ ایک ایسا افغانستان وجود میں آچکا تھا جہاں گزشتہ سو سال کی تاریخ میں سب سے زیادہ امن تھا۔ اس دوران ہونے والے انتظامیہ کے بڑے بڑے اجلاسوں میں شرکت کے دوران یہ احساس ہوتا تھا کہ ہر کوئی حیران ہے۔ ان سب کے نزدیک طالبان کا از خود ایک قوت کے طور پر ابھرنا حیرت انگیز تو تھا ہی لیکن اصل حیرت انہیں اس بات پر ہوتی تھی کہ ان کے مقابل میں قوتیں خود بخود پسپا ہو رہی ہیں۔ یہ تو افغانوں کی گزشتہ کئی سو سالہ تاریخ کے خلاف تھا۔ جب طالبان افغانستان میں قوت کے طور پر مستحکم ہوگئے۔ ملا محمد عمر امیر المومنین کی حیثیت سے مانے جانے لگے تو اس دوران حکومت پاکستان کو بھی خیال آیا کہ اب انہیں تسلیم کر لینا چاہئے۔ ایک ایسی حکومت اس پسماندہ ملک میں قائم ہوئی جو سیاسیات کے کامیاب ترین اصول "کامیاب ریاست وہ ہے جہاں ریاست کا وجود نظر نہ آئے اور لوگ کاروبار زندگی جاری رکھیں"۔ ہر بڑے شہر میں دس اور چھوٹے شہر میں سات طالبان سپاہی ہوتے تھے اور سپین بلدک جیسی منڈی جہاں اربوں کا کاروبار تھا وہاں لوگ دکانیں کھلی چھوڑ کر نماز پڑھنے جاتے تھے۔

(جاری ہے)

مردِ درویش، مردِ قلندر (آخری قسط)

یہ ایک پُرامن افغانستان تھا۔ ایسا افغانستان جس کا تصور تک بھی ایک پشتون سربراہِ مملکت کی حیثیت سے کسی نے کیا نہ ہوگا۔ صدیوں کی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی پشتون کو اقتدار میسر آیا اس نے اپنے بھائی سے پرانے بدلے چکانے کی ریت ڈالی۔ "تربور۔۔" پشتو زبان میں ایک ایسے رشتے کے بھائی کو کہتے ہیں جس سے اندر ہی اندر عداوت چل رہی ہوتی ہے۔ اس عداوت کو "تربور گردی" کہا جاتا ہے۔ لیکن ملا محمد عمر کی ذات تو اس سے بالاتر تھی۔ گزشتہ ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں یہ دور امن و آشتی اور عدل و انصاف کا ایسا دور تھا جس کی خوشبو اردگرد کے علاقوں میں جا نکلی تھی۔ افغان معاشرہ میں اسلحہ مرد کا زیور سمجھا جاتا ہے۔ ہر کوئی ہتھیار کندھے پر لٹکا کر چلنے کو مردانگی خیال کرتا ہے۔ گزشتہ سولہ سالہ افغان جنگ نے افغانوں کو اسقدر اسلحہ دیا تھا کہ شہر کے شہر اسلحہ کے گودام بن گئے تھے۔ ریاست کی کامیابی کا دوسرا اہم اصول یہ ہے کہ لوگوں کو یہ اطمینان ہو جائے کہ اب ان کی حفاظت کرنے کو ریاست موجود ہے تو وہ بے فکری کی نیند سونے لگتے ہیں۔ ملا محمد عمر نے اعلان کیا کہ امارتِ اسلامی اللہ کی دی گئی ذمہ داری کے تحت آپ لوگوں کی جان و مال کی ذمہ دار ہے، آپ لوگ اپنا اسلحہ جمع کروادیں۔ کوئی تصور کر سکتا ہے کہ صرف بیس دن کے اندر تمام لوگوں نے اپنا اسلحہ اپنے علاقے کے طالبان کے نامزد کردہ گورنروں اور "اولس والوں" (ضلعی سربراہوں) کو جمع کروادیا۔ پاکستان میں معین الدین حیدر صاحب نے فوج اور دیگر ایجنسیوں کے ذریعے یہ کرنے کی کوشش کی تھی، نتیجہ ہر کسی کو معلوم ہے۔ دنیا میں درجنوں ایسے ممالک ہیں جہاں منشیات کی کاشت اور کاروبار ہوتا ہے لیکن افغانستان ان میں سب سے زیادہ افیون کاشت کرنے والا ملک تھا۔ افیون جس سے ہیروئن تیار ہوتی ہے اور یہ ہیروئن افغانستان کی سرحد پر قائم فیکٹریوں میں تیار ہوتی۔ دنیا کے ہر ملک نے جہاں منشیات کی کاشت اور دھندا ہوتا تھا، انہوں نے جنگی جہازوں، ہیلی کاپٹروں اور ٹینکوں کے ذریعے اس دھندے اور کاشت کو ختم کرنے کی کوشش کی، کولمبیا سے لے کر تھائی لینڈ تک، سب جگہ آرمی ایکشن ہوا، نتیجہ دس سے پندرہ فیصد کمی۔ لیکن افغانستان جہاں سے نوے فیصد افیون عالمی مارکیٹ میں جاتی تھی، ملا عمر کا ایک حکم نامہ نکلنے کی دیر تھی، کھیتوں میں کھڑی کروڑوں کی فصل کو لوگوں نے خود ہی آگ لگادی اور وہاں پوست کی کاشت صفر ہو گئی۔

1997ء میں میرے پاس چاغی کے ڈپٹی کمشنر کی ذمہ داری تھی۔ افغانستان کے علاقے شوراوک سے ایک نالہ آتا ہے جو نوشکی کے اردگرد مینگل، بادینی اور جمالدینی قبائل کی زمینوں کو سیراب کرتا۔ ایک دن ان تینوں قبیلوں کے سردار آئے کہ افغانستان کے علاقے میں اکبر بڑیچ نامی شخص نے بند باندھ کر پانی روک لیا ہے۔ میں نے سرحد پار ہلمند کے گورنر سے رابطہ کیا جو لشکر گاہ میں بیٹھتا تھا۔ اس نے کہا میں ابھی آپ کے دفتر آرہا ہوں، اس لئے کہ میں یہیں قریب ہی سرحد پار موجود ہوں۔ وہ ایک موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھے ہوئے تشریف لائے۔ ایک سادہ سا مولوی جسے آج لوگ طالبان رہنما کے طور پر جانتے ہیں۔ کہنے لگا موقع پر چلتے ہیں، آپ اپنے دو مولوی لے آئیں، میں اپنے دو مولوی لے آتا ہوں۔ انگریزی نظام میں پلے بڑھے قبائلی ایک دم تمسخرانہ انداز میں بولے، مولوی کا کیا کام۔ اس نے کہا ہماری جانب مولوی کا ہی کام ہے۔ خیر ہم نے مولوی بھی لئے اور ساتھ تحصیلدار، گرداور، پٹواری اور ریکارڈ بھی اٹھا لیا۔ موقع پر پہنچے، بلڈوزر سے ایک بہت بڑا بند بنا ہوا تھا اور سارا پانی روک کر اپنے کھیتوں کی جانب اس کا رخ موڑ دیا گیا تھا۔ طالبان کے گورنر نے چاروں مولویوں سے پوچھا، بہتے ہوئے پانی کے بارے میں فقہ کا کیا حکم ہے۔ چاروں نے بیک زبان کہا "اپنی ضرورت کا لے سکتے ہیں لیکن نیچے والوں کا پانی نہیں روک سکتے۔" طالبان کے اس گورنر نے جس کے ساتھ نہ تو کوئی سپاہی تھا اور نہ ہی مسلح دستے، بس اتنا کہا "یہ بند تم توڑو گے یا ہم" اور پھر صبح ہونے تک وہ ہفتوں میں بنا ہوا بند ٹوٹ چکا تھا۔

یہی زمانہ تھا جب 1947ء کے بعد پہلی دفعہ سروے آف پاکستان کی ٹیم نے ڈیورنڈ لائن یعنی پاک افغان سرحد پر برجیاں نصب کیں اور زمینی سروے مکمل کیا ورنہ ظاہر شاہ کے دور سے لے کر مجاہدین کے انتشار تک کسی حکومت کے دوران اس سرحد پر جانے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ وہ افغانستان جو کبھی پاکستان سے چوری کی گئی گاڑیوں اور تاوان کے لئے لے جائے جانے والے مغویوں کا مسکن تھا۔ طالبان کے شروع کے زمانے میں وہ مغوی اور گاڑیاں پکڑ کر واپس کی جاتیں اور اس کی گواہی بارڈر کا ہر ڈپٹی کمشنر دے گا اور ایک سال بعد تو کسی کی جرأت نہ کہ چوری یا اغوا کر کے ادھر کا رخ کرے۔ پاکستان کے کسی مخالف قوم پرست کو افغانستان میں پر مارنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ وہ جو انگریز کے زمانے سے بھاگ کر وہاں پناہ لیتے تھے بھیگی بلی بنے پاکستان میں پڑے ہوئے تھے۔ یہاں کی خفیہ ایجنسیوں نے ایک رپورٹ دے کر ایک وفد کو ملا عمر کے پاس بھیجا کہ آپ کے ہاں راس کوہ میں لشکر جھنگوی کا کیمپ ہے جہاں وہ قتل کر کے پناہ لیتے ہیں۔ وہ جرنیل صاحب شکایت جمع کروا کر واپس آگئے، لیکن اس کے بعد چاغی کے پاس جا کر جب طالبان نے معلومات کیں تو یہ کیمپ راس کوہ میں دالبندین سے آگے پاکستان کے بارڈر پر تھا اور اس کی سرپرستی کرنے والوں کا نام لیتے ہوئے بھی پر جلتے ہیں۔

وہ افغانستان جو ہر جہادی تنظیم کے لئے ایک کھلا میدان تھا، جو کوئی جس ملک سے اٹھتا بغیر سوچے سمجھے وہاں آکر آباد ہو جاتا۔ ملا محمد عمر نے کہا کہ پہلے اسلام کے اصولوں کے مطابق بیعت کرو، ریاست کا حصہ بنو اور پھر ہمارے ساتھ مل کر جو چاہے کرو۔ اسامہ بن لادن اور القاعدہ نے بیعت کی۔ بیعت ان کے نزدیک شہریت کا نام تھا۔ اس بیعت کی اسقدر لاج اور شرم رکھی گئی کہ اس شخص یعنی اُسامہ بن لادن کے لئے وہ دنیا کی 48 طاقتوں سے ٹکرا گئے۔ کیا زمانہ تھا۔ پاکستان کا سہما سہما وفد، امریکیوں کے ہمراہ اس مٹی کے گھر میں سادہ سی چٹائی پر بیٹھا تھا اور سمجھا رہا تھا کہ تم اُسامہ بن لادن کو حوالے کر دو ورنہ تمہاری اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی۔ ملا محمد عمر نے کہا اس کے خلاف ثبوت فراہم کرو۔ امریکی تمام ثبوت لے کر آگئے۔ سوال صرف ایک تھا، کیا ان ثبوتوں کی بنیاد پر امریکہ کی عدالت اُسامہ کو سزا سنا سکتی ہے، امریکی بولے ناممکن، ملا محمد عمر بولے پھر ہم سے یہ توقع کیوں۔ اب ڈرانے کی باری تھی۔ کہا مان جاؤ، ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ انہوں نے کہا تباہ ہونے سے نہ ڈراؤ، ہم مٹی کے گھر میں رہتے ہیں، مٹی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں، اور ایک دن ہم نے مٹی میں چلے جانا ہے۔ صرف یہ بتاؤ ہماری وجہ سے پاکستان کو تو کوئی مسئلہ نہ ہوگا کیونکہ تم ہمارے بھائی ہو۔ پاکستانی وفد نے کہا ہمیں کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔ بات ختم ہو گئی۔ اور پھر وہ جنہوں نے غیرت و حمیت کا درس تاریخ کو دینا تھا اور حق کی گواہی پر کھڑے ہونا تھا وہ ڈٹ گئے اور آج بھی ڈٹے ہوئے ہیں ہم نے تو سید الانبیاء کے اس ارشاد کی بھی لاج نہ رکھی کہ "وہ مسلمان نہیں جس کی ایذا سے اس کا پڑوسی محفوظ نہیں"۔ پڑوسی کے لئے مسلمان ہونا بھی شرط نہیں۔ لیکن ہماری سرزمین سے 57 ہزار دفعہ امریکی جہاز اڑے اور انہوں نے ان سرفروشوں کو اپنے اللہ کے حضور سرخرو کرنے کے لئے شہادت سے سرفراز کیا۔ مورخ آج بھی تاریخ لکھ رہا ہے اور ویسی ہی لکھ رہا ہے جیسی اس کا تعصب اسے مجبور کرتا ہے۔ ملا محمد عمر کے خلاف تین قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو شروع شروع میں ان کے داڑھی اور حجاب کے حکم کے خلاف تھے۔ افغانستان کے ننانوے فیصد لوگ داڑھی اور حجاب والے تھے اور ایک فیصد ملا عمر کو ظالم کہنے والے۔ دوسرے وہ جن کا رزق منشیات کے دھندے سے وابستہ تھا اور تیسرے مسلک کے تعصب میں اندھے کہ جنہیں کسی دوسرے مسلک کا سچ بھی جھوٹ لگتا ہے۔ لیکن قدرت کا عجیب انتقام ہے کہ وہ سب لوگ جو کل تک طالبان اور ملا محمد عمر کے خلاف بولتے نہیں تھکتے تھے اب ان کے تبصرے اور تحریریں بتاتی ہیں کہ امن کی کُنجی تو طالبان کے پاس ہے۔ ہر کسی کو علم ہے کہ خوف داعش کا ہے اور ڈر کس نوعیت کا ہے۔ لیکن طالبان کے افغان دور کے پانچ سالوں کی خوشبو کی ایک مہک ہے جو اس زمانے میں پاکستان کے سرحدی اضلاع کے ہر فرد نے محسوس کی تھی۔ یہ خوشبو کیوں نہ پھیلتی، جس تحریک کا آغاز ملا محمد عمر نے رسول اکرم ﷺ کے جبہ مبارک پر بیعت لے کر کیا تھا، اس خوشبو نے تو پھیلنا ہی تھا۔

میلے کے شوقین

سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ یہ محاورہ کسی ایک ملک تک محدود نہیں بلکہ دنیا میں جہاں کہیں سیاست کا بازار گرم ہوا' لوگوں نے ہزاروں سال کے تجربے سے سیکھا کہ سیاستدان اکھاڑے میں اترے ہوئے اس منہ زور بھینسے کی طرح ہوتا ہے جسے صرف اور صرف جیت اور مخالف کو زیر کرنے سے غرض ہوتی۔ یہ سیاسی مفاد جمہوری ہو یا بادشاہانہ' آمرانہ ہو یا عوامی' ہر صورت میں مقصد اور مدعا صرف اور صرف ایک ہوتا ہے کہ ہم اقتدار کی کرسی پر کس طرح پہنچتے ہیں اور کتنی دیر تک اس پر براجمان رہتے ہیں۔ بادشاہ بھی اپنے ساتھ طاقتور گروہوں اور قبیلوں کو ملایا کرتا اور ان کی قوت و طاقت سے اپنا رعب و دبدبہ قائم کرتا تھا۔ اقتدار پر براجمان ہونے کے بعد وہ عام آدمی کو راضی رکھنے کے لئے انصاف اور امن و امان کو یقینی بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ ان میں اکثریت کا مقصد عوام کی خدمت نہیں ہوتی تھی بلکہ انہیں اس بات پر سیاسی تجربے سے یقین ہوتا تھا کہ اگر عوام مطمئن نہ ہوئے تو اندر سے کوئی اور طاقتور طالع آزما اقتدار پر قبضہ کر کے بادشاہ بن جائے گا یا پھر پڑوس کا کوئی حکمران حملہ کر کے اس کی سلطنت کو اپنا حصہ بنا لے گا۔ ان دونوں صورتوں میں غیر مطمئن عوام اس کا ساتھ نہیں دیں گے اور شکست یقینی ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے بادشاہ لوگوں کے مزاج کو دیکھتے ہوئے وہاں مختلف کام کرتا تھا۔ ایسے کام جن سے رعایا خوش رہے اور اس کے خلاف نہ ہو جائے۔ معمولی طور پر یہ کام میلوں ٹھیلوں' کھیلوں' بڑی بڑی پر شکوہ عمارات اور شاندار تقریبات کے ذریعے کیا جاتا۔ پر شکوہ عمارت کی تعمیر ہو یا رنگا رنگ تقریبات' ان میں لوگوں کے لئے رزق کا سامان بھی ہوتا اور دلچسپی اور دل بستگی کا وسیع ذریعہ بھی۔ روم کے بادشاہ جہاں بڑے بڑے سٹیڈیم بناتے اور عمارات تعمیر کرتے وہیں ہر سال کھیلوں کی تقریبات بھی منعقد کرتے جو مہینوں جاری رہتیں۔ ان تقریبات کے دوران شہر کے فواروں میں خوشبودار پانی چلایا جاتا' گلیوں بازاروں میں موسیقار دھنیں بجاتے' رقاص رقص کرتے' مصر میں دریائے نیل کے ساحلوں سے باریک ریت منگوائی جاتی اور وہاں بچھائی جاتی جہاں بگھیوں کی دوڑ کا مقابلہ ہوتا۔ غلام کئی سال تک اچھی خوراک پر پالے جاتے' انہیں ورزشیں کروا کر صحت مند اور توانا بنایا جاتا اور پھر ایک دن عوام سے بھرے ہوئے سٹیڈیم میں بھوکے شیروں سے لڑنے کے لئے چھوڑا جاتا۔ یہ سب تماشا جہاں عوام کے لئے دلچسپی اور تفریح کا باعث تھا وہیں ان کے لئے رزق کا سامان بھی پیدا کرتا تھا۔ وہ اتنا رزق ضرور کما لیتے کہ سال بھر فاقوں میں نہ گزرتے۔ یہی حال دنیا میں ہر بادشاہت کا تھا۔ مصر کے اہرام سے لے کر بابل کے ہوا میں معلق باغات تک اور چین کی عظیم دیوار سے تاج محل اور شالامار باغ تک آپ کو پر شکوہ عمارات کی قطار نظر آئے گی جنہیں لاکھوں انسانوں نے اپنی محنت سے تعمیر کیا اور اس صورت اپنا رزق بھی کمایا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کو دنیا کی تمام بادشاہتوں میں ماہانہ اور سالانہ تقریبات کا سلسلہ بھی ملے گا جن میں کھو کر لوگ بھول جایا کرتے تھے کہ انہیں انصاف ملا ہے یا نہیں ملا' وہ کس قدر شدید بیمار ہیں' انہیں ان کی محنت کا مناسب معاوضہ نہیں ملتا۔ انہیں تو اس بات کی عادت ڈال دی گئی تھی کہ وہ بیمار ہوں' مظلوم ہوں' بیکس و بے نوا ہوں' بھوکے ننگے ہوں لیکن انہوں نے میلہ اور تہوار ضرور منانا ہے اور اگر شہر آ جائیں تو ان بڑی بڑی پر شکوہ عمارات کو حیرت سے ضرور دیکھنا ہے۔ یہ مزاج جن معاشروں میں بھی راسخ کیا گیا' وہاں موجودہ دور کے سیاستدانوں نے بھی اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ایسے معاشروں کے ڈکٹیٹر اور جمہوری حکمران دونوں کے مزاج یکساں تھے۔ دونوں نے عوام کے اس شوق سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

آج سے تیس سال قبل جب اسلام آباد سے مری جانے والی سڑک دنیا کے بہترین معیار پر تعمیر ہو رہی تھی تو تبصرہ نگار اسے کسی ایک شخص کی شاہانہ مزاجی سے تعبیر کر رہے تھے' اس نے چونکہ ویک اینڈ مری میں گزارنا ہوتا ہے اس لیے وہ اپنی سہولت کے لئے ایسا کر رہا ہے۔ ایسا ہرگز نہ تھا' وہ تو ہیلی کاپٹر پر بھی مری جا سکتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ اسے اس قوم کے مزاج کا اندازہ ہو گیا تھا۔ یہ لوگ بیمار رہیں' ان پڑھ ہوں' انصاف سے محروم اور طاقتور طبقوں کے ظلم کا شکار رہیں' ان کے گھروں میں کھانے کو میسر نہ ہو' روز و شب مصیبت میں گزرتے ہوں' لیکن پھر بھی دل کا بوجھ ہلکا کرنے' زندگی کی سانسیں درست کرنے' میلہ دیکھنے ضرور جائیں گے' عمارتوں پر چراغاں ہو یا کوئی نئی عمارت بنے اس کو دیر تک حیرت سے ضرور دیکھیں گے اور پھر اپنے گھر کے اندھیروں میں لوٹ جائیں گے۔ حکمرانوں کو اندازہ تھا کہ مری ایک ایسا مقام ہے جہاں ملک بھر سے لوگ آتے ہیں۔ حسب استطاعت چند دن گزار کر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ اگر اس مقام کو خوبصورت بنا دیا گیا تو پورا سال لوگ اس کا تذکرہ گلی گلی کرتے رہیں گے۔ جس نے دیکھا' وہ بیان کرے گا' جس نے نہیں دیکھا وہ حیرت میں گم ہوتا چلا جائے گا لیکن ایک بات پر سب متفق ہونگے کہ کام بہت غضب ہوا ہے۔ اسی طرح بڑے شہروں میں جشن بہاراں کے نام پر میلوں ٹھیلوں کا سلسلہ شروع کیا گیا جو کہیں پر بسنت کے تہوار تک جا نکلا جس پر اربوں روپے خرچ کیے جانے لگے۔ میلے کے شوقین لوگ ان دنوں میں خوب ہلا گلا کرتے' کچھ تماشہ کرنے والے' کچھ شریک تماش بین اور لاکھوں دور سے تماشہ دیکھ کر خوش ہونے اور اپنے افلاس زدہ گھروں کی جانب لوٹ جانے والے۔ میلے اور جشن منائے جاتے رہے۔ موٹروے تعمیر ہونا شروع ہوا۔ کچی سڑکوں پر رہنے والے دیہاتیوں کے لئے دور سے یہ بھی ایک تاج محل نظر آتا تھا۔ وہ جن کے دیہات میں نہ بجلی تھی نہ پانی' اسکول تھانہ ہسپتال' گندے پانی کے جوہڑ سے انسان اور حیوان ایک ساتھ مستفید ہوتے۔ ان کے درمیان تارکول کی چمکتی پٹری گزری اور پھر اس پر رنگا رنگ گاڑیاں بھی گزرنے لگیں۔ موٹروے کے دونوں جانب زندگی آج بھی اسی طرح ایک ہزار سال پرانے سہولیات سے عاری ماحول میں زندہ ہے اور اس پر سفر کرنے والے اس بات پر خوش ہیں کہ وہ چند گھنٹے میں لاہور پہنچ جاتے ہیں۔ پشاور سے چلنے والا ٹرک آج بھی جی ٹی روڈ سے جاتا ہے۔ اس کے گودام اور روڈ سائیڈ ہوٹل وہیں آباد ہیں لیکن ہم خوش ہیں کہ موٹروے نام کا ایک تاج محل ہمیں میسر آ گیا ہے۔ آمروں کو عمارتیں بنانے اور میلے ٹھیلوں کا شوق ایسا ہوتا ہے کہ ہر چوک میں ٹریفک ٹھیک طرح چلے یا نہ چلے وہاں ایک یادگار ضرور تعمیر ہوتی ہے جس کے ساتھ کھڑے ہو کر لوگ تصاویر بناتے ہیں۔ اسلام آباد کے شاندار بلیو ایریا میں اب ایسی کئی عمارات ہیں جن کی سرخ چھتیں اور شیشے کے آر پار زندگی آپ کو اچھی لگتی ہے۔ آپ وہاں لوگوں کو تصاویر بناتے دیکھتے ہوں گے۔ لوگ اپنی گاڑی کھڑی کرتے ہیں' تصاویر بناتے ہیں' بیس روپے کا ٹکٹ خریدتے ہیں اور ایک اچھی سی "رائڈ" لے کر اپنی گاڑی میں واپس گھر لوٹ جاتے ہیں۔ لاہور ہو یا اسلام آباد' اس میں لوگ سفر بھی کرتے ہیں۔ وہ لوگ جن کی زندگیاں سکون و اطمینان سے خالی ہیں جو ایسے ہسپتال کے سٹاپ پر اترتے ہیں جہاں انہیں دوائی نہیں ملتی' ایسی عدالت کے دروازے پر پہنچتے ہیں جہاں وہ سالوں سے انصاف حاصل کرنے کے لئے دھکے کھا رہے ہیں' ایسی سرکاری عمارات کے سامنے میٹرو سے باہر آتے ہیں جہاں وہ کئی سالوں سے نوکری کی درخواست دے رہے ہیں لیکن ملازمت کسی سیاسی اثر و رسوخ والے یا رشوت دینے والے کو مل جاتی ہے۔ وہ ایک ایسے تعلیمی ادارے تک جانے کا ٹکٹ لیتے ہیں جہاں وہ قابلیت کے حساب سے داخل تو ہو سکتے ہیں لیکن اس کے اخراجات اٹھانے سے قاصر ہیں۔ اس کے باوجود بھی یہ سب لوگ جو موٹروے' میٹرو' مری روڈ' جشن بہاراں یا سپورٹس فیسٹیول جیسی تقریبات میں تصویریں کھنچواتے ہیں' انہیں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ آدھا گھنٹہ ایئر کنڈیشنڈ بس میں بیس روپے دے کر گزارتے ہیں اور پھر اسے ایک سہولت سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں یہ اسی مزاج کے حامل ہیں جن کے گھر میں کھانے کو ہو یا نہ ہو انہوں نے میلہ دیکھنے ضرور جانا ہوتا ہے اور حکمرانوں نے ان کی نبض پہ ہاتھ رکھا ہوا ہے' وہ ان کی کمزوریوں کو جانتے ہیں۔ انہیں پتہ ہے یہ میلے کے شوقین لوگ ہیں۔ سیاست کے سینے میں دل ہوتا تو کوئی ان میلے کے شوقین لوگوں سے اتنا ضرور کہتا' پہلے گھر بہتر کر لو پھر میلہ دیکھ لینا۔

مسلم ہولوکاسٹ امت کا اجتماعی قتل عام

اسقدر غصہ' آنکھوں میں انتقام کے شعلے' کیا یہ سب ان کے مزاج کا حصہ ہے' ان کا گھریلو ماحول ہی ایسا تھا' یا یہ کسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں سے جذبہ رحم ختم ہو جاتا ہے۔ دنیا میں بسنے والے تمام انسان اپنے اندر خوبصورت دل' محبت کے جذبات اور ایک دوسرے کے ساتھ رحم اور ہمدردی کی خو رکھتے ہیں۔ انہیں خونخوار اور ظالم دو خواہشات بناتی ہیں۔ ایک طاقت' غلبے اور اقتدار کی خواہش اور دوسری مسلسل ظلم اور جبر سہنے کے بعد ظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا جذبہ۔ دنیا کی تاریخ میں یہی دو جذبے ہیں جنہوں نے انسانی سروں کی فصلیں کاٹی ہیں' کھوپڑیوں کے مینار بنائے ہیں' شہروں' بستیوں اور قصبوں کو آگ لگائی ہے اور اپنے اقتدار کو مضبوط کیا ہے' یا پھر لوگوں کا جم غفیر اٹھا ہے' انہوں نے عدالتیں لگائیں' بڑے بڑے تیز چھروں سے بادشاہوں' ان کے حواریوں کے سر کاٹے' ان کے سروں کو لڑھکاتے ہوئے ٹھوکروں سے روندتے رہے۔ عوام سے غداری کر کے ظالموں کا ساتھ دینے والوں کے گھروں کو آگ لگائی گئی' انہیں قطار میں کھڑا کر کے گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اقتدار اور غلبے کی خواہش سے جنم لینے والا ظلم اور قتل و غارت انسانوں میں انتقام اور غصے کو جنم دیتا ہے اور یہی دنیا کی تاریخ ہے۔ لیکن ہر دور کا مورخ بزدل' شاہ پرست اور اقتدار کا پروردہ ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ طاقتور بادشاہوں کے ظلم کو جائز اور ان کے خلاف جنم لینے والے انتقام کو غیر انسانی' غیر مہذب اور غیر اخلاقی تحریر کرتا رہا ہے۔ وہ حکومتوں کے خلاف اٹھنے والے لوگوں کو امن کے دشمن' بھیڑیئے اور باغی کے القابات سے یاد کرتا رہا ہے۔

آج کا مورخ موجودہ دور کا میڈیا ہے۔ یہ بھی اسی طرح طاقتوروں کے شکنجے اور حکمرانوں کے خوف سے سہما ہوا ہے' جیسے ہر صدی کا مورخ ہوتا ہے۔ اس میڈیا کو پالنے اور پوسنے والے بہت چالاک ہیں۔ وہ خود تو عالمی اقتصادی جبر کا حصہ ہیں' اپنے مفادات کے لئے وہ ملکوں کے ملک تباہ کرتے ہیں لیکن اپنے سرمائے سے چلنے والے میڈیا کا چہرہ انہوں نے آزاد رکھا ہوا ہے۔ جن عالمی کمپنیوں کے لئے ملکوں میں ظالم حکمرانوں کے اقتدار کو قائم رکھا جاتا ہے' انہیں انسانوں کے قتل عام کی کھلی چھوٹ دی جاتی ہے' جن عالمی کمپنیوں کے وسائل کی ہوس کے لئے ملکوں پر حملہ کیا جاتا ہے' ان کی بستیاں تاراج کی جاتی ہیں' وہی عالمی کمپنیاں دنیا بھر کے اس ''آزاد' اور ''خود مختار'' میڈیا کو سرمایہ فراہم کرتی ہیں۔ یہ آج کا مورخ میڈیا اسی کو ظالم ثابت کرتا ہے جس کے بارے میں یہ سرمایہ فراہم کرنے والے اقتدار پر قابض ظالم اسے حکم دیتے ہیں۔ کس قدر حیران کن بات ہے کہ انقلاب فرانس کے دوران بڑے بڑے تیز دھار چھروں سے گردنیں کاٹنے والے' ان سروں کو گلیوں میں لڑھکانے والے' یہاں تک کہ بادشاہ لوئی کے سر سے دیر تک والی بال کھیلنے والے تو انسانی تاریخ کا رخ موڑنے والے تحریر کیے جاتے ہیں اور بادشاہ کو ظالم۔ لیکن آج کے میڈیا کے نزدیک عالمی امن قائم کرنے اور جمہوریت اور آزادی کے نفاذ کے لئے لاکھوں لوگوں کو قتل کرنا جائز ہے اور اس کے مقابلے میں اٹھنے والے' انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے لوگ اگر سر کاٹتے نظر آئیں تو انہیں انسانی تاریخ کے درندے' وحشی اور جنگلی ثابت کیا جاتا ہے۔ یوکرین میں کمیونسٹ روسی انقلاب کے دوران پچاس ہزار لوگوں کو گھروں سے نکال کر لائن میں کھڑا کر کے گولیوں سے بھون دیا جائے تو اسے زار روس کے مظالم کے خلاف اٹھنے والی تحریک کا سنگ میل کہا جاتا ہے لیکن موجودہ کارپوریٹ سرمائے سے جنم لینے والی عالمی طاقتوں کی غنڈہ گردی اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی قومی ریاستوں کے ظلم کے خلاف اٹھنے والوں کو دہشت گرد' شدت پسند اور عالمی امن کے دشمن قرار دیتے ہیں۔

اس ''با اختیار'' ''آزاد'' اور ''خود مختار'' میڈیا کا کمال دیکھیں کہ 9 جنوری 2010ء کو آسٹریلیا کے ایک سوچنے سمجھنے والے فرد ڈاکٹر گڈیون پولیا "GideonPolya" نے عالمی عدالت انصاف میں ایک درخواست جمع کروائی جس کا عنوان ہے "MuslimHolocaust,MuslimGenocide" یعنی ''مسلمانوں کا منصوبہ بندی کے ساتھ اجتماعی قتل عام''۔ اس درخواست کا کوئی ذکر عالمی یا علاقائی میڈیا میں نہیں ملتا۔ یہ ایک ضخیم دستاویز ہے جس میں اس نے بے شمار شواہد کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ گزشتہ پچاس ساٹھ سالوں کے دوران مسلمانوں کے عالمی سطح پر قتل عام کی گنتی کروڑوں تک جا پہنچتی ہے۔ اس نے اس قتل عام کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ مسلمان جن کو جنگوں' خانہ جنگیوں اور براہ راست حملوں کے ذریعے قتل کیا گیا' لیکن ان کے ساتھ ساتھ ان مسلمانوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جنہیں اس طرح قتل کیا گیا کہ ان تک خوراک کی رسائی روکی گئی' ان کو بیماری میں دوائی نہ پہنچائی گئی' ان پر مختلف انداز سے وبائی امراض کے دروازے کھولے گئے اور انہیں بے موت مرنے دیا گیا ہے۔ اس کی مثال وہ 1943ء سے 1945ء تک بنگال میں پیدا کیے گئے مصنوعی قحط سے دیتا ہے جس میں چرچل جیسے دنیا کے ''محبوب'' رہنما نے وہاں خوراک کی ترسیل روکی تھی اور تقریباً 70 لاکھ لوگوں کو مرنے دیا گیا تھا جن میں 95 فیصد کے قریب مسلمان تھے۔ جنگ عظیم کے دوران یہ سب سے بڑا مسلم ہولوکوسٹ تھا جس کا کوئی ذکر تک نہیں کرتا جبکہ اسی دوران یہودی ہولوکوسٹ جو 50 لاکھ کے قریب بتایا جاتا ہے اسے آج تک میڈیا بھولنے نہیں دیتا۔ اس درخواست میں افغانستان کا مقدمہ سب سے پہلے بیان کیا گیا ہے جس میں اس نے اعداد و شمار سے ثابت کیا ہے کہ افغانستان میں امریکی حملے کے بعد سے اب تک 45 لاکھ افراد مر چکے ہیں اور تیس لاکھ لوگ ہجرت پر مجبور کیے گئے ہیں۔ مرنے والوں میں 37 لاکھ وہ عورتیں' بچے اور بوڑھے ہیں جن تک اس جنگ کی وجہ سے نہ دوائی پہنچنے دی گئی اور نہ خوراک۔ ان سب میں ظالم ترین عمل یہ تھا کہ طالبان نے افیون کی کاشت مکمل طور پر ختم کر دی تھی لیکن امریکہ نے آتے ہی اسے بحال کر دیا کیونکہ اس افیون کی کاشت سے امریکی معیشت میں سالانہ 60 ارب ڈالر کا اضافہ ہوتا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ منشیات استعمال کرنے والے امریکہ میں ہیں۔ افغانستان سے کوڑیوں کے مول پر منشیات لی جاتی ہے اور ڈالروں میں وہاں بیچی جاتی ہے۔ اس وقت امریکہ کی سرپرستی میں دنیا کی 90 فیصد منشیات افغانستان سے جاتی ہے جبکہ طالبان نے اسے 2 فیصد تک کر دیا تھا۔ اس افیون کی کاشت سے افغانستان میں ہر سال ایک لاکھ لوگ "OpiateDrugRelated" موت کا شکار ہوتے ہیں اور یوں چودہ سالوں میں چودہ لاکھ لوگ اس بھیانک کاروبار کی وجہ سے موت کی آغوش میں جا چکے ہیں۔ براہ راست قتل و غارت سے افغانستان میں 2 لاکھ لوگ مارے گئے جبکہ عراق میں اس سے تین گنا لوگ لقمہ اجل بنے۔ سب سے بھیانک وہ اموات ہیں جو پانچ سال سے کم عمر بچوں کی ہوتیں جو بھوک اور بیماری سے مر جاتے ہیں۔ افغانستان میں امریکہ کے آنے کے بعد 26 لاکھ ایسے بچے دنیا کی بہاریں دیکھنے سے قبل ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ عراق میں یہ صورت حال 1991ء میں پہلی عراق جنگ سے جاری ہے جب اس پر خوراک اور دواؤں کی پابندی لگائی گئی تھی۔ اس وقت ایک اندازے کے مطابق 25 لاکھ عراقی براہ راست اور غیر محسوس پابندیوں کے ذریعے ہلاک ہوئے ہیں۔ اس کے بعد فلسطین کا مقدمہ اس درخواست میں ہے جس پر امریکہ برطانیہ یورپی یونین اور آسٹریلیا نے مل کر اسرائیل کو مسلط کیا ہے جس کی وجہ سے ایک لاکھ فلسطینی قتل ہوئے' 2 لاکھ 5 سال سے کم عمر بچے بیماریوں سے مارے گئے اور ستر لاکھ بے گھر ہوئے۔ 1990ء سے لے کر 2005ء تک فرانس نے افریقہ کے مسلمان ملکوں الجزائر وغیرہ پر قبضہ کیا اور اپنے منظور نظر ظالم حکمران وہاں مسلط کئے جن ملکوں میں اب تک چودہ کروڑ کے قریب ایسی اموات ہو چکی ہیں۔ اریٹیریا' صومالیہ اور دیگر افریقی ممالک میں تو اموات کا شمار نہیں۔ آخر میں اس نے کہا ہے کہ اس دنیا میں ہوس اور حرص کا شکار کارپوریٹ بدمعاشوں نے فیکٹریاں لگا کر جو عالمی موسموں کو تباہ کیا ہے' جس سے گلوبل وارمنگ پیدا ہوئی ہے' اس گلوبل وارمنگ سے گزشتہ پچاس سالوں میں کئی ارب لوگ لقمہ اجل بنے ہیں جو غریب ممالک کے تھے اور ان میں تین ارب مسلمان تھے۔ کیا اس درخواست میں دی گئی تصویر اور خونچکاں داستان کا آج کے مورخ میڈیا نے کہیں ذکر کیا' کوئی بریکنگ نیوز' کوئی ڈاکومنٹری' کوئی ٹاک شو' شاید کبھی نہیں لیکن آج ایک امریکی' یورپی باشندہ اس قتل عام کے نتیجے میں جنم لینے والے انتقام کی وجہ سے اغوا ہو جائے' قتل ہو جائے' پھر دیکھیں ٹیلی ویژن' اخبارات' ریڈیو کیسے شور مچاتے ہیں' اتنا شور کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔

....

نوٹ: تاریخ طبری کے حوالے سے ایک قرض تھا جو میں نے ادا کیا ہے۔ میں اسے رسول اکرم ﷺ کے بارے میں دو گستاخانہ من گھڑت افسانے تخلیق کرنے کا مصنف سمجھتا ہوں جن کا ذکر اس طرح نہ قرآن پاک میں ہے اور نہ احادیث کی کتب میں اور میں سید الانبیاء ﷺ سے شدید محبت کی وجہ سے طبری سے نفرت کرتا ہوں۔ ایک واقعہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے طلاق کا جسے کمال بے ہودگی سے اس نے تحریر کیا اور دوسرا واقعہ غرانیق۔ کسی معترض کالم نگار اخبار نویس یا دانشور میں حوصلہ ہے تو صرف سیدہ زینب رضی اللہ عنہا والا افسانہ پڑھ کر دیکھ لے اور اگر اس کے باوجود جرأت رکھتا ہے تو اسے من و عن اپنے کالم کی زینت بنا کر دکھا دے۔

پیرس نشانہ کیوں؟

یہ وہ شہر ہے جس میں آج سے تقریباً ڈھائی سو سال قبل لاکھوں لوگ سڑکوں پر امڈ آئے تھے، یہ بھوکے ننگے اور غربت وافلاس کے مارے ہوئے لوگ تھے۔ عوام کی طاقت سے بادشاہت کو گرانے کا مظاہرہ دنیا نے پہلی دفعہ اسی شہر میں وقوع پذیر ہوتے دیکھا تھا۔ یہ لوگ اپنی نفرت اور انتقام کی انتہا پر تھے۔ کارلائل ان لوگوں کی تصویر کھینچتے ہوئے لکھتا ہے "محنت ومشقت کرنے والے عوام کی حالت مسلسل ابتر تھی، بدقسمت لوگ جن کی تعداد دو سے ڈھائی کروڑ کے درمیان تھی۔ ہم ان سب کو ایک دھندلی اکائی یا انسانوں کا ایک ڈھیر سمجھتے ہیں۔ اتنا بڑا ہجوم مگر کمزور لوگوں کا ہجوم، کم ذات اور کمینے، اچھے لفظوں میں انہیں عوام کہہ لو، بظاہر عوام نام کی ایک اکائی، سارے فرانس میں اپنے مٹی کے گھروندوں اور چھپروں میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہر گھر کے اپنے دکھ تھے، اپنے مسائل تھے، ان گھروں میں پائی جانے والی مخلوق اپنی ہڈیوں پر محض کھال اوڑھے ہوئے تھی...... کھال بھی خستہ حال کہ چٹکی بھرو تو اس میں سے خون رسنے لگے"۔ یہ 1789ء کا فرانس تھا جس کی تصویر کارلائل بیان کر رہا تھا۔ کئی سالوں سے فرانس کے یہ حالات تھے اور دن بدن ابتر ہو رہے تھے۔ وہ 1777ء سے ہنگامے اور بغاوتیں کر رہے تھے۔ اسی سال سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ فرانس میں گیارہ لاکھ بھکاری ہیں۔ لیکن دس بارہ سالوں میں یہ لوگ اسقدر بڑھے کہ لوگوں کا بازاروں میں چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ پھر ایک دن چودہ جولائی 1786ء میں عوام کا بپھرا ہوا ہجوم پیرس کی سڑکوں پر نکل آیا۔ انہوں نے سب سے بڑے جیل خانے بیسٹائل پر قبضہ کر لیا۔ وہ تمام قیدی جو بادشاہ کے خلاف آواز بلند کرنے کے جرم میں قید کیے گئے تھے رہا ہو گئے۔ 14 جولائی آج بھی فرانس کا قومی دن ہے۔ یہ آغاز تھا، انجام تو بہت ہی خون آشام تھا۔ جگہ جگہ عدالتیں لگی ہوئی تھیں۔ بپھرے ہوئے لوگ انسانوں کو روکتے، ان کے ہاتھ دیکھتے، اگر وہ نرم ہوتے اور ان پر محنت کے نشان نہ ہوتے تو انہیں قتل کر دیتے، ان کی قمیض کا کالر اور آستین دیکھتے، اگر ان پر میل نہ ہوتا تو گردن اڑا دیتے۔ بادشاہ کو جس طرح کھینچ کر اس بلند مقام پر لایا گیا جہاں ایک بہت بڑا چھرا اس کی گردن کاٹنے کا منتظر تھا، وہ عجیب منظر تھا۔ جب یہ سروں کی فصل کٹ رہی تھی تو کوئی آنکھ اشکبار نہ تھی۔ پورے فرانس میں جشن کا ایک سماں تھا۔ رقص گاہوں میں رقص جاری تھے اور شراب خانوں میں جام لنڈھائے جا رہے تھے۔ انقلاب فرانس کی تاریخ لکھنے والے ان تمام واقعات کو اسی طرح بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ وہ سب اسے عوام کا غصہ، غضب اور انتقام تصور کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ول ڈیورانٹ جیسا شخص انقلاب فرانس کے دوران اس طرح لوگوں کی گردنیں اڑانے کا ایک جواز تحریر کرتا ہے۔ وہ اپنی کتاب Heros of History میں لکھتا ہے کہ انگلینڈ میں فرانس سے زیادہ غربت وافلاس تھی بلکہ انگلینڈ کے لوگ تو پرانے چمڑوں کو ابال کر سوپ تیار کر کے زندگی گزارتے تھے لیکن وہ سب لوگ فرانس کے عوام کی طرح سڑکوں پر نہیں نکلے، انہوں نے امراء اور روساء کا قتل نہیں کیا۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتا ہے کہ انگلینڈ میں فرانس کے بادشاہوں کی طرح عوام کی غربت کا مذاق اڑانے والا کوئی نہ تھا۔ کسی ملکہ نے یہ الفاظ نہیں بولے تھے کہ "لوگوں کو اگر روٹی نہیں ملتی تو وہ کیک کیوں نہیں کھاتے" یا پھر انگلینڈ میں فوج کے کسی سپہ سالار نے فرانس کے روہان کی طرح یہ فقرہ نہیں کہا تھا کہ لوگ بھوکے ہیں تو پورے فرانس میں اسقدر گھاس اگی ہوئی ہے، وہ کیوں نہیں کھاتے۔" یہ وہی شخص ہے جسے لوگوں نے پکڑا، اس کے منہ میں گھاس بھری اور پھر گردن کاٹ دی۔ حیرت کی بات ہے کہ لوگ بھوک اور افلاس برداشت کرتے رہتے ہیں لیکن اپنا تمسخر برداشت نہیں کرتے اور آتش فشاں کی طرح اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور قتل وغارت کی ایسی تاریخ رقم کرتے ہیں جس میں کوئی پوچھتا تک نہیں کہ کون قصوروار ہے اور کون نہیں۔ بس جو شکل وصورت یا لباس سے سرمایہ دار امیر نظر آتا ہے اس کی گردن اڑا دی جاتی ہے۔ یہ انقلاب فرانس تھا جس کی کوکھ سے دو چیزوں نے جنم لیا۔ ایک سیکولرازم اور دوسرا نپولین۔ ان کے اپنے اپنے اہداف تھے، ایک سلطنت کو وسعت دینا چاہتا تھا اور وہ افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے مسلمان علاقوں پر چڑھ دوڑا اور سیکولرازم نے مذہب سے ایسی آزادی کو جنم دیا جس میں ہر اس تصور کا تمسخر اڑایا گیا جو مذہب سے وابستہ تھا۔ فرانسیسی ادب میں پادری اور نن کے حوالے سے جس قدر کہانیاں اور افسانے تراشے گئے وہ صرف اور صرف ان کی کردار کشی کے لیے تھے۔ لطیفوں کی ایک قطار ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ فلموں میں چرچ کی زندگی کو نشانہ بنایا گیا' یہاں تک فحش فلموں کے کرداروں میں بھی نن کو شامل کر کے رسوائی کا سامان مہیا کیا گیا۔ عیسائیت نے چونکہ صلیبی جنگوں کے بعد فرانس پر بذریعہ چرچ اپنا غلبہ قائم کیا تھا اور پادری وہاں کی سب سے بڑی طاقت تھے جو انسانوں کو مخالف نظریات کی بنیاد پر پکڑتے، فیصلہ صادر کرتے کہ ان میں شیاطین کی ارواح داخل ہو گئی ہیں۔ پھر ان کو اکٹھا کر کے آگ کے الاؤ میں جھونک دیا جاتا۔ فرانس کے سب سے بڑے سرمایہ دار اور جاگیر دار پادری تھے کیونکہ انہوں نے صلیبی جنگوں کے نام پر عوام سے جو سرمایہ اکٹھا کیا تھا اسے اپنی جائیدادیں بنانے پر خرچ کیا۔ اسی لیے جب ان کے خلاف دو صدیاں نفرت اور تمسخر سے بھرا پراپیگنڈا کیا گیا تو کوئی ان کی ہمدردی میں نہ اٹھا۔ کسی نے ان کا ساتھ نہ دیا بلکہ وہ خود بھی خاموش ہو کر بیٹھے رہے۔ چرچ کی اس خاموشی کو سیکولرازم کے کرتا دھرتا لوگوں نے آزادیٔ اظہار کی فتح قرار دیا اور یہ گمان کر لیا کہ کسی بھی مذہب یا اس کے ماننے والوں کی محترم شخصیت کا اگر کبھی مذاق اڑایا گیا تو کم از کم فرانس یا پیرس میں ہمارا سامنا کوئی نہیں کرے گا۔ ہم آزادیٔ اظہار کے نام پر سب کچھ اور سب کے ساتھ جاری رکھ سکیں گے۔ ادھر فرانس کے مفتوح افریقی اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کے افراد یہاں آباد ہونا شروع ہوئے جن کی اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ مراکش، الجزائر، مصر، شام، لبنان اور دیگر ملک۔ ان سب نے پیرس کے اس رنگا رنگ ماحول کو اوڑھ لیا جس نے سیکولرازم کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ اس ماحول کو ارباب اقتدار فرانسیسی تہذیب اور ثقافت کہتے ہیں اور اس کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اسے ہر حال میں قائم رکھا جائے گا بلکہ ان سیکولر اخلاقیات کو بزور نافذ کیا جائے گا۔ اس کا پہلا شکار وہ 92 عورتیں ہوئیں جو پیرس شہر میں نقاب اوڑھتی تھیں۔ ان کے بارے میں کہا گیا کہ یہ فرانسیسی تہذیب وثقافت پر حملہ ہے۔ ان 92 عورتوں کے مقابلے میں فرانس کی اسمبلی کے کئی سو ارکان اکٹھا ہوئے اور نقاب پر پابندی لگا دی۔ یہ کسی شخص کے ذاتی انتخاب لباس پر قدغن ہی نہیں بلکہ اس کا تمسخر اڑانا بھی تھا۔ اس کے بعد چارلی ہیبڈو نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کارٹون شائع کیے۔ اس اخبار کو بخوبی علم تھا کہ فرانس میں پچاس لاکھ سے زیادہ مسلمان رہتے ہیں اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ فرانس یورپ کا وہ واحد ملک ہے جہاں اسلام اختیار کرنے والوں کی تعداد روزانہ تین سے چار افراد ہے جو اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو رہے ہوتے ہیں۔ لیکن کسی کو یاد نہ تھا کہ لوگ غربت وافلاس اور بھوک اور بیماری برداشت کر لیتے ہیں لیکن تمسخر نہیں۔ 2015ء میں چارلی ہیبڈو کے کارکن قتل ہوئے۔ اسی پیرس شہر میں جہاں ڈھائی سو سال قبل انتقام سے بھرپور لوگوں نے اپنے تمسخر کا انتقام ہر قصوروار اور بے قصور سے بلاامتیاز لیا تھا۔ پورا یورپ وہاں اکٹھا ہو گیا۔ ان کے ساتھ یکجہتی کا مظاہرہ کیا گیا۔ پیرس کی سڑکوں پر ایک ہجوم دوبارہ نکل آیا۔ لیکن اس دفعہ وہ تمسخر اڑانے والوں کی گردنیں کاٹنے کے حق میں نہیں تھا۔ بلکہ ان کے تحفظ اور ان کی حمایت میں کھڑا ہو گیا۔ اس ہجوم نے دنیا بھر کے دکھی اور رنجیدہ مسلمانوں کو ایک پیغام دیا کہ پیرس ہر اس شخص کا ساتھ دے گا جو تمہاری محبوب ترین شخصیت کا تمسخر اڑائے اور اگر وہ قتل کر دیا جائے تو وہ ہمارا ہیرو ہے۔ انتقام کی اپنی سرشت ہوتی ہے۔ الجزائر میں فرانسیسی افواج اتریں کہ وہاں اسلام پسند حکمران نہ بن جائیں، بلاامتیاز بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کیا۔ لیبیا کے پرامن ملک کو فضائی حملوں سے تباہ وبرباد کر دیا گیا۔ عراق، بیروت، مصر اور شام میں اپنے اتحادیوں کے ساتھ وہ سب کچھ روا رکھا گیا جو عام شہریوں کے قتل عام کا سبب تھا۔ جہاز کئی ہزار فٹ سے بم برساتے اور ان کے شور میں کسی کو معصوم بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کی چیخیں تک سنائی نہ دیتیں۔ لوگ گھروں سے نکلے، ہجرت کرتے ہوئے سمندروں میں غرق ہوئے، دربدر خاک بسر ان لوگوں کی آنکھوں میں صرف ایک ہی آگ تھی جسے انتقام کی آگ کہا جاتا ہے جس شخص نے اپنے ہاتھوں اپنے پیاروں کو دفنایا ہو اسے اردگرد خوشیاں مناتے لوگ اچھے نہیں لگتے۔ وہ ذاتی اور نسلی انتقام کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے۔ وہ شام سے تعلق رکھتا ہے اور شام کا انتقام لیتا ہے۔ شام جس پر پورا مغرب اور روس سب ٹوٹ پڑے ہیں۔ لیکن فرانس کا شہر پیرس کیوں۔ اس لیے کہ یہی شہر تھا جہاں دنیا بھر کے حکمران تمسخر اڑانے والوں کے ساتھ یکجہتی کے لیے جمع ہوئے تھے اور ول ڈیورانٹ کے نزدیک لوگ بھوک برداشت کر لیتے ہیں، تمسخر نہیں۔

قومی، علاقائی، بین الاقوامی دھارا

گزشتہ چند سالوں سے انگریزی کا ایک لفظ مین سٹریم "MainStream" بہت زیادہ استعمال کیا جانے لگا ہے۔ "مین" کا لفظی ترجمہ سب سے بڑا، بنیادی یا سب سے اہم ہے اور سٹریم ندی یا دریا کو کہتے ہیں۔ اسی طرح انسانی تہذیب و تمدن کی بھی ایک مین سٹریم ہوتی ہے جو دو طریقوں سے اپنا راستہ متعین کرتی ہے۔ تاریخ میں ایک راستہ وہ ہے جو اللہ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے دنیا کو بتلایا اور ابتدائے آفرینش سے لے کر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ و سلم تک اخلاق، اقدار، چال چلن، انسانی رویوں اور اللہ کے سامنے جوابدہی کے تصور سے دنیا کو ایک لائف سٹائل یعنی طرز زندگی عطا کیا۔ یہ طرز زندگی یا الوہی لائف سٹائل دراصل پہلی قسم کی "مین سٹریم" ہے۔ دوسری "مین سٹریم" وہ ہے جو اس الوہی "مین سٹریم" یا لائف سٹائل کی ضد اور مخالفت میں انسان خود ترتیب دیتا ہے۔ صدیوں سے انسانوں نے پیغمبروں کی مخالفت اس طرح کی کہ ان کے مقابلے میں اپنے ایک لائف سٹائل کو جنم دیا اور اس کے تحفظ کے لئے لڑتے بھی رہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے غیر فطری فعل کو اپنے لائف سٹائل کا جزو لاینفک بنایا اور ان کی اکثریت نے عین جمہوری مزاج کے طور پر اسے اپنے لئے جائز قرار دیا۔ یہ ان کا مین سٹریم یا قومی دھارا تھا۔ اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے کم تولنے کو ایک لائف سٹائل کے طور پر اپنایا اور پوری قوم میں سے صرف چند لوگ ایسے تھے جو اس مین سٹریم سے علیحدہ اور حضرت شعیبؑ کا ساتھ دیتے تھے۔ نمرود، شداد، فرعون اور ہر اس فرد جس نے پیغمبروں کی مخالفت کی ہمیشہ دنیا کو ایک مختلف لائف سٹائل دیا اور پھر اس کے تحفظ کی لڑائی لڑتا رہا۔ یہ دوسرا طریقہ ہے دنیا کو ایک طرز زندگی دینے کا۔ یہ دونوں طریقے ازل سے لے کر آج تک ایک دوسرے کی ضد رہے ہیں لیکن جدید تہذیب کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنے لائف سٹائل کو مین سٹریم کا نام دے کر پوری دنیا کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ دیگر مذاہب کے جدید مین سٹریم کا حصہ بن جائیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک بین الاقوامی دھارا ہے جس میں علاقائی اور قومی دھارائیں ضم ہو جائیں۔ انہیں تھوڑی دور علیحدہ چلنے کی اجازت ہے لیکن ان کا رخ اور سمت بین الاقوامی دھارا یا مین سٹریم کی طرف ہی ہونا چاہئے ورنہ ہم بزور طاقت ان کا رخ بدل دیں گے اور انہوں نے اس کا مظاہرہ بار بار کیا جاتا رہا۔ گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد دنیا میں دو طاقتیں اپنے دو لیڈروں کی زبانی اس جنگ کا اعلان کرتی نظر آتی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ، جارج بش اور ٹونی بلیئر۔ ان دونوں نے ایک ہی بات کی کہ "ہم اپنے لائف سٹائل کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں"۔ اس مین سٹریم کے مقابلے میں کوئی افغانستان یا عراق میں نظر آیا تو تہہ و بالا کر دیں گے اور اگر ہمارے ملکوں میں ہوا تو سکیورٹی قوانین اس قدر سخت بنا دیں گے کہ سانس لینا مشکل کر دیں گے اور دنیا کے دیگر تمام ممالک کو مجبور کریں گے کہ وہ اپنے تمام طبقات کو اس مین سٹریم اور بین الاقوامی دھارے کا حصہ بنائیں۔ اس بین الاقوامی دھارے اور لائف سٹائل کو دو بنیادی ادارے آج کے دور میں جنم دیتے ہیں۔ ایک میڈیا اور دوسرا نظام تعلیم۔ میڈیا چونکہ مکمل طور پر ان کے کنٹرول میں ہے اور وہ ہر ملک میں اس کی مخصوص آزادی کا خود تحفظ کرواتے ہیں۔ لیکن دنیا کے ہر اس ملک میں جہاں اس لائف سٹائل کے مخالف ایک واضح اکثریت موجود ہے وہاں ان کے تعلیمی ماہرین آن دھمکتے ہیں۔ ان کے تعلیمی ادارے جابجا کھل جاتے ہیں۔ وظائف کے انبار لگا دیئے جاتے ہیں تاکہ لوگ ان کی یونیورسٹیوں میں جا کر تعلیم حاصل کریں اور واپس آکر ان کے لائف سٹائل کے وکیل بن جائیں۔ نرسری نظموں سے لے کر اے لیول اور او لیول کی کتابوں، یہاں تک کہ ملک کے علاقائی سلیبس میں بھی ایسے ماحول کو پیش کیا جاتا ہے جو اس "مین سٹریم" لائف سٹائل سے مطابقت رکھتا ہو۔ انسانی تاریخ میں اس لائف سٹائل کے مقابل ہمیشہ سے ہی ایک دوسرا لائف سٹائل رہا ہے جسے الوہی ہدایت یافتہ طرز زندگی کہتے ہیں۔ لیکن گزشتہ تین سو سالہ تعلیمی نظام اور گزشتہ ایک سو سالہ معاشی اور عسکری برتری نے ایک نیا راستہ نکالا ہے کہ اس الوہی نظام کے پیروکاروں کو بھی اپنی مین سٹریم کا حصہ بنایا جائے۔ پچاس کی دہائی میں رینڈ کارپوریشن نے ایک رپورٹ مرتب کی تھی، تمام دنیا میں مسلمان مذہبی گروہوں، تنظیموں اور پارٹیوں کو اگر مین سٹریم سیاست یعنی الیکشن اور جمہوریت کا حصہ بنا دیا جائے تو ان میں جدید مغربی لائف سٹائل کی مخالفت دم توڑ جائے گی۔ اگر وہ ایسا کریں گی بھی تو سسٹم کے اندر رہ کر کریں گی جس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس وقت سے اب تک اسلامی سیاسی پارٹیاں شکست در شکست کھاتی ہیں اور اگر جیتنے بھی لگیں تو الجزائر اور مصر کی طرح انہیں طاقت سے کچل دیا جاتا ہے۔ لیکن انہیں اصل خطرہ اس نظام تعلیم سے ہے جو مدرسوں کی صورت آج تک اس روح کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس لائف سٹائل کے تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے چودہ سو سال پہلے عطا کیا تھا۔ یوں تو عام لوگوں کو اس بات کا عادی کر دیا گیا ہے کہ تم بچوں کو مین سٹریم تعلیم یعنی ایم اے، ایم بی اے، میڈیکل، انجینئرنگ وغیرہ پڑھاؤ تاکہ دنیا میں کامیاب ہو جائیں اور اگر دل چاہے تو شروع میں ناظرہ قرآن پاک پڑھا کر دینی ذمہ داری پوری کر دو۔ یوں اکثریت کے نزدیک مین سٹریم تعلیم دنیا کی کامیابی کے لئے ہے اور آخرت کی کامیابی کے لئے تھوڑی بہت اضافی تعلیم کافی ہے۔ یہ وہی لائف سٹائل ہے جو مغرب نے عیسائیت کو ریاست سے نکال کر سیکولر اخلاقیات نافذ کر کے عطا کیا تھا۔ جب کہ ہمارے اسلاف کا لائف سٹائل یہ تھا کہ اصل تعلیم آخرت کی فلاح کے لئے ہے اور اس کے ساتھ دنیا کی فلاح کی تعلیم بھی پڑھنی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ سات صدیاں مسلمانوں میں سے دنیا کے علوم کی سربراہی کرنے والے ایسے عالم پیدا ہوئے جن کا طرز زندگی اللہ کے بنائے اصولوں کے مطابق تھا۔ بو علی سینا سے لے کر ابن الہیثم اور جابر بن حیان تک جو سب فزکس، کیمسٹری اور میڈیسن کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں، اپنی طرز زندگی میں سچے اور کھرے مسلمان تھے کیونکہ ان کے ہاں تعلیم میں ترجیح اول وہ تعلیم تھی جو اللہ کے قرب اور آخرت میں سرخروئی کا باعث بنے۔ لیکن گزشتہ چار سو سالوں سے مسلم دنیا پر مغربی قبضے نے ایک ایسے لائف سٹائل کو جنم دیا ہے جس میں انسانی زندگی کی مین سٹریم دنیاوی تعلیم ہو گئی ہے اور دینی علم کو چرچ کی طرح دینی مدرسوں تک محدود کر دیا۔ یورپ میں یہ تجربہ کامیاب تھا۔ پادری بپتسمہ دینے، شادی کرانے اور دفن کی رسومات تک محدود ہو گیا۔ یہاں بھی جب تک گورے کا اقتدار رہا، مولوی کو محدود رکھا گیا لیکن اس کے باوجود ساری بغاوتیں اسی مدرسے کے مولوی نے کیں، پھانسیاں، جیلیں اور کالے پانی کی سزائیں اسی نے کاٹیں۔ اب یہ اپنے سخت جان رویے کی صورت پوری مغربی تہذیب کے لئے ایک خطرہ بن کر ابھرا ہے۔ پوری دنیا کے میڈیا کا رخ اسے بدنام کرنے کی جانب ہے۔ اس کے لئے ایک عجیب و غریب نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔ انہیں مین سٹریم میں لایا جائے۔ انہیں قومی، علاقائی اور بین الاقوامی دھارے کا حصہ بنایا جائے۔ ان تمام مدارس کو جدید نصاب تعلیم بھی ساتھ ساتھ پڑھانے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے لئے لفظ یہ استعمال ہوتا ہے کہ انہیں مین سٹریم میں لایا جائے، یعنی انسانی زندگی کی معراج، ترقی اور کامیابی کو صرف دنیا کی کامیابی اور ترقی مان لیا جائے اور آخرت کی کامیابی کو ایک اضافی کامیابی تصور کر کے تھوڑی بہت تعلیم دی جائے۔ یوں اس ساری دینی تعلیم کا رخ مین سٹریم یا دھارے کی طرف مڑ جائے گا۔ جو لوگ مدرسے کے طالب علم کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ دنیا میں کامیاب ہوں۔ وہ عام سکولوں میں مذہبی تعلیم کا نام تک سننا گوارا نہیں کرتے۔ کیا او لیول، اے لیول یا میٹرک کے طالب علم کو آخرت کی کامیابی اور اس کے حصول کے علم اور عمل کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے قومی دھارے یا مین سٹریم اداروں میں دین کو اضافی حیثیت دینے کو بھی تیار نہیں اور مدارس کو قومی دھارے میں لانے کا عزم کئے ہیں۔ یہ ترقی، تہذیب اور دہشت گردی نہیں بلکہ لائف سٹائل کی جنگ ہے۔ یہ قومی، بین الاقوامی یا علاقائی دھارا نہیں طرز زندگی ہے۔ یہ خسارے کا سودا ہے۔ دنیا میں کامیابی اور آخرت میں خسارے کا سودا۔

رویبضہ

یوں تو تاریخ تعصبات، ذاتی مفادات اور مطلق العنان حکمرانوں کے زیر اثر تحریر کیا جانے والا وہ قصوں، کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں سچ تلاش کرنا ایسے ہی ہے جیسے اندھیرے کمرے میں سیاہ پتھر پر کالی چیونٹی کو ڈھونڈنا۔ ہر کسی کو تاریخ کے افسانوں میں اپنی مرضی کا سچ مل جائے گا اور وہ اس افسانے کو حق اور سچ مان کر اپنی محبت اور نفرت میں اضافہ کرتا پھرے گا۔ اس سب کے باوجود اگر کسی نے سچ ڈھونڈنا ہو، حقیقت سے آگاہ ہونا ہو تو تعصبات کو ذہن سے جھٹک کر خالصتاً سچ جاننے کی نیت سے مطالعہ کرے تو ایک بات طے ہے کہ سچ ملے یا نہ ملے اسے جھوٹ کا مکمل ادراک ضرور ہو جاتا ہے۔ وہ صرف تاریخ مرتب کرنے والے کے مقام، مرتبے، حیثیت، خاندان اور عقیدے کو جان لے اور عقل کی کسوٹی پر رکھ کر اس کے تحریر کردہ واقعات کو جانچے تو جھوٹ، ملاوٹ اور من گھڑت افسانہ طرازی کھل کر سامنے آجائے گی۔ یہ تو گزشتہ ادوار کی تحریر کردہ تاریخ کی بات ہے' جسے صدیاں بیت گئیں اور اس کا جھوٹ آج تک عام آدمی کی زبان پر جاری ہے۔ نہ عام آدمی کو یہ مہلت میسر ہے کہ تحقیق کے کام پر نکلے اور نہ ہی اس تک یہ سہولت موجود ہے کہ تمام تاریخیں اس کے سامنے ہوں۔ اسے جو مسجد کا مولوی، امام بارگاہ کا ذاکر، سکول کا استاد، محلے کا نیم خواندہ دانشور، سیاست دان یا کالم نگار بتا دیتا ہے وہ اس پر یقین کر لیتا ہے۔ موجودہ دور کا عام آدمی تو سخت مشکل میں ہے۔ وہ اس دور میں زندہ ہے جس میں صرف اور صرف جھوٹ کی بادشاہی ہے اور کذب کا غلبہ ہے۔ یہ دور رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی اس حدیث کے مصداق اور آپ کی پیش گوئی کے عین مطابق ہے۔ آپ نے فرمایا "حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا "دجال کے خروج سے پہلے چند سال دھوکہ و فریب کے ہوں گے۔ سچے کا جھوٹا بنایا جائے گا اور جھوٹے کو سچا بنایا جائے گا۔ خیانت کرنے والے کو امانت دار بنا دیا جائے گا اور امانت دار خیانت کرنے والا قرار دیا جائے گا اور ان میں رویبضہ بات کریں گے۔ پوچھا گیا رویبضہ کون؟ فرمایا گھٹیا (فاسق و فاجر) لوگ۔ وہ لوگوں کے اہم معاملات پر بولا کریں گے۔ (مسند احمد 1332، مسند ابی یعلی 3715، السنن الواردۃ فی الفتن)

ہم اس دور میں زندہ ہیں جس پر جھوٹ کا غلبہ اور کذب کی حکمرانی ہے۔ یہ دور میڈیا کا دور ہے۔ کیا کسی سچے کو جھوٹا، جھوٹے کو سچا، امانت دار کو خائن اور خائن کو امانت دار ثابت کرنا میڈیا کے بائیں ہاتھ کا کھیل نہیں۔ کیا دنیا بھر میں لوگوں کے اہم معاملات پر رویبضہ فاسق و فاجر لوگ روز گفتگو نہیں کرتے، تجزیہ نہیں پیش کرتے، کیا کوئی سنجیدہ، صاحب کردار، صاحب علم شخص آج کے میڈیا میں باوقار ہے۔ دنیا کا تمام میڈیا جس چکا چوند میں لوگوں کی آنکھیں چندھیائے ہوئے ہے۔ اس کا ایک ہی مقصد ہے کہ اپنی مرضی کا سچ، مرضی کا کلچر اور مرضی کی اطلاع لوگوں تک پہنچے جس سے ایک خاص مقصد کے مطابق نفرت اور محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو۔

میڈیا ایک تاریخ مرتب کر رہا ہے جو گزشتہ تاریخوں سے زیادہ متعصب، جھوٹی اور ناقابل اعتبار ہے۔ لیکن کس خوبصورتی سے وہ اپنے جھوٹ کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ لوگوں کو وہی اصل حقیقت اور سچ محسوس ہوتا ہے۔ چونکہ موجودہ میڈیا نے اپنے اس جھوٹ کو سچ بنا کر پوری دنیا پر جنگ، قتل و غارت، بے سکونی اور موت مسلط کی ہے، اس لیے وہ اصل سچ، اصل حقیقت اور صحیح تصویر پیش کرنے والے کو اس قدر مطعون اور قابل نفرت بنا دیتا ہے کہ لوگ اصل سچ پر یقین ہی نہیں کرتے۔ جھوٹ کا یہ کاروبار پہلی جنگ عظیم میں تیز رفتاری سے آگے بڑھا، دوسری جنگ عظیم میں اسے اس قدر عروج حاصل ہوا کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم برسانے کے بعد دو امریکی صحافی وہاں کا دورہ کرتے ہیں اور واشنگٹن پوسٹ میں رپورٹ شائع ہوتی ہے کہ دونوں شہروں کی آبادی میں کوئی تابکاری اثرات نہیں پائے گئے۔ ہٹلر کے وزیر گوئبلز کا قول مشہور ہوتا ہے کہ اتنا جھوٹ بولو کہ سچ محسوس ہو۔ لیکن جوں جوں اس میڈیا کو عروج اور ترقی ملتی گئی' دھوکے اور فراڈ کا ماحول مزید مستحکم ہوتا گیا۔

میڈیا کی اس متعصب اور جھوٹی تاریخ نویسی کا سب سے بڑا شکار موجودہ دور کا افغانستان، طالبان اور ملا محمد عمر ہے۔ جوں جوں انسان ان کی حقیقت جاننے کی کوشش کرتا ہے دنیا بھر میں پھیلایا گیا جھوٹ واضح ہوتا چلا جاتا ہے۔ گزشتہ دنوں افغانستان میں پاکستان کے سفیر ایاز وزیر نے میرے پروگرام "متبادل" میں ایک واقعہ سنایا کہ میں وزارت خارجہ میں تعینات تھا تو طالبان کے وزیر خارجہ عبدالوکیل متوکل مجھ سے ملنے آئے۔ اتنے میں کابل میں پاکستانی سفارت خانے سے فون آیا کہ پاکستانی سفارتی عملے کے دو ارکان کو اس وجہ سے چیک پوسٹ پر روکا گیا ہے کہ ان کی داڑھی نہیں۔ ایاز وزیر نے عبدالوکیل متوکل سے کہا' تو انہوں نے فوراً کابل کے طالبان کے انچارج سے گفتگو کی کہ ایسا کوئی حکم نہ ملا محمد عمر نے دیا ہے اور نہ کسی اور قیادت کی جانب سے ایسا ہے' تو پھر یہ سب کیا ہے۔ جس نے بھی یہ حرکت کی ہے اسے گرفتار کرو اور سفارت خانے کے عملے کو عزت و احترام سے چھوڑ کر آؤ اور معافی بھی مانگو۔

اس سچ کے سامنے آنے کے بعد بھی کیا اس جھوٹ کا اثر ختم ہو سکتا ہے جو گزشتہ بیس سال سے پھیلایا جا رہا ہے۔ میڈیا کی اسی چکا چوند میں ایک صحافی عابد اللہ جان 2001ء سے سچ کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اسے کتابوں کی شکل میں تحریر کر رہا ہے۔ اس نے نائن الیون سے چند ماہ قبل افغانستان میں گزارے جہاں اس نے اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری سے انٹرویو کیے لیکن کسی اخبار میں انہیں شائع کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں پیدا ہونے اور نشو و نما پانے والے اس صحافی نے اب تک چھ کتابیں تحریر کی ہیں۔ اس وقت اس کی آخری کتاب کا ترجمہ "افغانستان آخری صلیبی جنگ کا نقطۂ آغاز" میرے سامنے ہے جسے مکتبہ خدام القرآن لاہور نے شائع کیا ہے۔ یہ حیران کن انکشافات سے بھری ہوئی ایک کتاب ہے جس میں اس نے تمام حوالے مغربی میڈیا میں شائع ہونے والی اطلاعات کے دیئے ہیں جنہیں جان بوجھ کر دبا دیا گیا تاکہ طالبان کا ایک مسخ شدہ چہرہ دنیا کو دکھا کر ان پر جنگ مسلط ہو۔ ہم سب کے لیے یہ سچ حیران کن ہو گا کیونکہ ہم جھوٹے پراپیگنڈے کے عادی ہو چکے ہیں۔ وہ لکھتا ہے "جس کو بھی طالبان کا صحیح علم ہے وہ جانتا ہے کہ طالبان دور میں سماجی بہبود کی وزارتیں بدخشانی فارسی خواں اقلیت کے ہاتھ میں تھیں، پکتیا ایک پختون اکثریتی صوبہ ہے اس کا گورنر بدخشانی فارسی خوان تھا۔ اسی نسلی اقلیت کو فوج کی انفنٹری ڈویژن کی ذمہ داری تھی جس میں شیعوں پر مشتمل ڈویژن بھی تھی جو سنیوں کے شانہ بشانہ طالبان مخالفوں سے لڑتی تھی۔ اس نے اقوام متحدہ کی رپورٹوں کے حوالے دیئے اور بتایا کہ کابل یونیورسٹی میں خواتین کی کلاسیں 1999ء میں شروع کی گئیں تھیں۔ قندھار، ہرات اور جلال آباد میں خواتین نرسز کے سکول کھولے گئے۔ ان کے دور میں خواتین تمام ہسپتالوں میں کام کرتی تھیں۔ دنیا بھر کے ڈاکٹرز اور اقوام متحدہ نے ان کی تمام امداد بند کر دی تھی کیونکہ ان کا مطالبہ تھا کہ مخلوط تعلیم نافذ کرو۔ پہلی دفعہ 8 مارچ 2000ء کو کابل میں خواتین کا عالمی دن منایا گیا جس میں سات سو خواتین جمع ہوئیں وہاں وائس چانسلر نے تقریر میں کہا کہ ہمارے پاس خواتین کی تعلیم کے مسئلے کا حل تو ہے لیکن اس مسئلے کا کوئی حل نہیں کہ دنیا ہم سے مخلوط تعلیم کا نفاذ چاہتی ہے۔ وہ لکھتا ہے اور تمام مغربی حوالوں سے لکھتا ہے کہ "باہم متصادم گروہوں کو غیر مسلح کرنے کے علاوہ طالبان نے عصمت دری، لوٹ مار، ڈکیتی اور قتل و غارت جیسے جرائم کا کامیابی سے خاتمہ کیا۔ سب سے بڑی بات افغانستان میں قانون کی حکمرانی تھی۔ اس کے نزدیک طالبان کے جرائم میں سرفہرست موجودہ عالمی نظام سے آزادی، دوسرا ایک کامیاب اسلامی ریاست کا قیام، تیسرا تیل کی صنعت سے وابستہ افراد کے اثر و رسوخ سے انکار، چوتھا کارپوریٹ میڈیا کے مقابل میں میڈیا کا فقدان اہم ترین جرائم تھے۔ کتاب انکشافات کا مجموعہ ہے اور یہ انکشافات عابد اللہ جان نے مغربی میڈیا کی رپورٹوں سے اکٹھے کیے ہیں۔ وہ انکشاف جنہیں میڈیا کی چکا چوند نے چھپا دیا تھا۔ وہ سچ جو بکھرا ہوا تھا اسے اکٹھا کیا گیا ہے۔ ورنہ میڈیا تو دنیا بھر میں ان لوگوں کے کنٹرول میں ہے جو سروں کی فصلیں کاٹ کر ترقی کی سیڑھیاں چڑھتے ہیں اور اس مقصد کے لیے ان کے پاس چیلوں کی طرح رقص کرتے دانشوروں، تجزیہ نگاروں، ادیبوں، شاعروں اور مؤرخوں کی کمی نہیں ہے۔ ایسے لوگ تاریخ کے ہر دور میں میسر رہے ہیں۔ "رویبضہ" جن کے ہاتھ میں اہم معاملات پر گفتگو کرنے کا لائسنس میڈیا نے عطا کیا ہے۔

”رویبضہ“

یوں تو تاریخ تعصبات، ذاتی مفادات اور مطلق العنان حکمرانوں کے زیر اثر تحریر کیا جانے والا وہ قصوں، کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں سچ تلاش کرنا ایسے ہی ہے جیسے اندھیرے کمرے میں سیاہ پتھر پر کالی چیونٹی کو ڈھونڈنا۔ ہر کسی کو تاریخ کے افسانوں میں اپنی مرضی کا سچ مل جائے گا اور وہ اس افسانے کو حق اور سچ مان کر اپنی محبت اور نفرت میں اضافہ کرتا پھرے گا۔ اس سب کے باوجود اگر کسی نے سچ ڈھونڈنا ہو، حقیقت سے آگاہ ہونا ہو تو تعصبات کو ذہن سے جھٹک کر خالصتاً سچ جاننے کی نیت سے مطالعہ کرے تو ایک بات طے ہے کہ سچ ملے یا نہ ملے اسے جھوٹ کا مکمل ادراک ضرور ہو جاتا ہے۔ وہ صرف تاریخ مرتب کرنے والے کے مقام، مرتبے، حیثیت، خاندان اور عقیدے کو جان لے اور عقل کی کسوٹی پر رکھ کر اس کے تحریر کردہ واقعات کو جانچے تو جھوٹ، ملاوٹ اور من گھڑت افسانہ طرازی کھل کر سامنے آجائے گی۔ یہ تو گزشتہ ادوار کی تحریر کردہ تاریخ کی بات ہے‘ جسے صدیاں بیت گئیں اور اس کا جھوٹ آج تک عام آدمی کی زبان پر جاری ہے۔ نہ عام آدمی کو یہ مہلت میسر ہے کہ تحقیق کے کام پر نکلے اور نہ ہی اس تک یہ سہولت موجود ہے کہ تمام تاریخیں اس کے سامنے ہوں۔ اسے جو مسجد کا مولوی، امام بارگاہ کا ذاکر، سکول کا استاد، محلے کا نیم خواندہ دانشور، سیاست دان یا کالم نگار بتا دیتا ہے وہ اس پر یقین کر لیتا ہے۔ موجودہ دور کا عام آدمی تو سخت مشکل میں ہے۔ وہ اس دور میں زندہ ہے جس میں صرف اور صرف جھوٹ کی بادشاہی ہے اور کذب کا غلبہ ہے۔ یہ دور رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اس حدیث کے مصداق اور آپ کی پیش گوئی کے عین مطابق ہے۔ آپ نے فرمایا ”حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ”دجال کے خروج سے پہلے چند سال دھوکہ و فریب کے ہوں گے۔ سچے کا جھوٹا بنایا جائے گا اور جھوٹے کو سچا بنایا جائے گا۔ خیانت کرنے والے کو امانت دار بنا دیا جائے گا اور امانت دار خیانت کرنے والا قرار دیا جائے گا اور ان میں رویبضہ بات کریں گے۔ پوچھا گیا رویبضہ کون؟ فرمایا گھٹیا (فاسق و فاجر) لوگ۔ وہ لوگوں کے اہم معاملات پر بولا کریں گے۔ (مسند احمد 1332، مسند ابی یعلی 3715، السنن الواردۃ فی الفتن)

ہم اس دور میں زندہ ہیں جس پر جھوٹ کا غلبہ اور کذب کی حکمرانی ہے۔ یہ دور میڈیا کا دور ہے۔ کیا کسی سچے کو جھوٹا، جھوٹے کو سچا، امانت دار کو خائن اور خائن کو امانت دار ثابت کرنا میڈیا کے بائیں ہاتھ کا کھیل نہیں۔ کیا دنیا بھر میں لوگوں کے اہم معاملات پر رویبضہ فاسق و فاجر لوگ روز گفتگو نہیں کرتے، تجزیہ نہیں پیش کرتے، کیا کوئی سنجیدہ، صاحب کردار، صاحب علم شخص آج کے میڈیا میں باوقار ہے۔ دنیا کا تمام میڈیا جس چکا چوند میں لوگوں کی آنکھیں چندھیائے ہوئے ہے۔ اس کا ایک ہی مقصد ہے کہ اپنی مرضی کا سچ، مرضی کا کلچر اور مرضی کی اطلاع لوگوں تک پہنچے جس سے ایک خاص مقصد کے مطابق نفرت اور محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو۔

میڈیا ایک تاریخ مرتب کر رہا ہے جو گزشتہ تاریخوں سے زیادہ متعصب، جھوٹی اور ناقابل اعتبار ہے۔ لیکن کس خوبصورتی سے وہ اپنے جھوٹ کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ لوگوں کو وہی اصل حقیقت اور سچ محسوس ہوتا ہے۔ چونکہ موجودہ میڈیا نے اپنے اس جھوٹ کو سچ بنا کر پوری دنیا پر جنگ، قتل و غارت، بے سکونی اور موت مسلط کی ہے، اس لیے وہ اصل سچ، اصل حقیقت اور صحیح تصویر پیش کرنے والے کو اس قدر مطعون اور قابل نفرت بنا دیتا ہے کہ لوگ اصل سچ پر یقین ہی نہیں کرتے۔ جھوٹ کا یہ کاروبار پہلی جنگ عظیم میں تیز رفتاری سے آگے بڑھا، دوسری جنگ عظیم میں اسے اس قدر عروج حاصل ہوا کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم برسانے کے بعد دو امریکی صحافی وہاں کا دورہ کرتے ہیں اور واشنگٹن پوسٹ میں رپورٹ شائع ہوتی ہے کہ دونوں شہروں کی آبادی میں کوئی تابکاری اثرات نہیں پائے گئے۔ ہٹلر کے وزیر گوئبلز کا قول مشہور ہوتا ہے کہ اتنا جھوٹ بولو کہ سچ محسوس ہو۔ لیکن جوں جوں اس میڈیا کو عروج اور ترقی ملتی گئی‘ دھوکے اور فراڈ کا ماحول مزید مستحکم ہوتا گیا۔

میڈیا کی اس متعصب اور جھوٹی تاریخ نویسی کا سب سے بڑا شکار موجودہ دور کا افغانستان، طالبان اور ملا محمد عمر ہے۔ جوں جوں انسان ان کی حقیقت جاننے کی کوشش کرتا ہے دنیا بھر میں پھیلایا گیا جھوٹ واضح ہوتا چلا جاتا ہے۔ گزشتہ دنوں افغانستان میں پاکستان کے سفیر ایاز وزیر نے میرے پروگرام ”متبادل“ میں ایک واقعہ سنایا کہ میں وزارت خارجہ میں تعینات تھا تو طالبان کے وزیر خارجہ عبدالوکیل متوکل مجھ سے ملنے آئے۔ اتنے میں کابل میں پاکستانی سفارت خانے سے فون آیا کہ پاکستانی سفارتی عملے کے دو ارکان کو اس وجہ سے چیک پوسٹ پر روکا گیا ہے کہ ان کی داڑھی نہیں۔ ایاز وزیر نے عبدالوکیل متوکل سے کہا‘ تو انہوں نے فوراً کابل کے طالبان کے انچارج سے گفتگو کی کہ ایسا کوئی حکم نہ ملا محمد عمر نے دیا ہے اور نہ کسی اور قیادت کی جانب سے ایسا ہے‘ تو پھر یہ سب کیا ہے۔ جس نے بھی یہ حرکت کی ہے اسے گرفتار کرو اور سفارت خانے کے عملے کو عزت و احترام سے چھوڑ کر آؤ اور معافی بھی مانگو۔

اس سچ کے سامنے آنے کے بعد بھی کیا اس جھوٹ کا اثر ختم ہو سکتا ہے جو گزشتہ بیس سال سے پھیلایا جا رہا ہے۔ میڈیا کی اسی چکا چوند میں ایک صحافی عابد اللہ جان 2001ء سے سچ کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اسے کتابوں کی شکل میں تحریر کر رہا ہے۔ اس نے نائن الیون سے چند ماہ قبل افغانستان میں گزارے جہاں اس نے اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری سے انٹرویو کیے لیکن کسی اخبار میں انہیں شائع کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں پیدا ہونے اور نشو و نما پانے والے اس صحافی نے اب تک چھ کتابیں تحریر کی ہیں۔ اس وقت اس کی آخری کتاب کا ترجمہ ”افغانستان آخری صلیبی جنگ کا نقطہ آغاز“ میرے سامنے ہے جسے مکتبہ خدام القرآن لاہور نے شائع کیا ہے۔ یہ حیران کن انکشافات سے بھری ہوئی ایک کتاب ہے جس میں اس نے تمام حوالے مغربی میڈیا میں شائع ہونے والی اطلاعات کے دیئے ہیں جنہیں جان بوجھ کر دبا دیا گیا تاکہ طالبان کا ایک مسخ شدہ چہرہ دنیا کو دکھا کر ان پر جنگ مسلط ہو۔ ہم سب کے لیے یہ سچ حیران کن ہو گا کیونکہ ہم جھوٹے پراپیگنڈے کے عادی ہو چکے ہیں۔ وہ لکھتا ہے ”جس کو بھی طالبان کا صحیح علم ہے وہ جانتا ہے کہ طالبان دور میں سماجی بہبود کی وزارتیں بدخشانی فارسی خواں اقلیت کے ہاتھ میں تھیں، پکتیا ایک پختون اکثریتی صوبہ ہے اس کا گورنر بدخشانی فارسی خوان تھا۔ اسی نسلی اقلیت کو فوج کی انفنٹری ڈویژن کی ذمہ داری تھی جس میں شیعوں پر مشتمل ڈویژن بھی تھی جو سنیوں کے شانہ بشانہ طالبان مخالفوں سے لڑتی تھی۔ اس نے اقوام متحدہ کی رپورٹوں کے حوالے دیئے اور بتایا کہ کابل یونیورسٹی میں خواتین کی کلاسیں 1999ء میں شروع کی گئیں تھیں۔ قندھار، ہرات اور جلال آباد میں خواتین نرسز کے سکول کھولے گئے۔ ان کے دور میں خواتین تمام ہسپتالوں میں کام کرتی تھیں۔ دنیا بھر کے ڈاکٹرز اور اقوام متحدہ نے ان کی تمام امداد بند کر دی تھی کیونکہ ان کا مطالبہ تھا کہ مخلوط تعلیم نافذ کرو۔ پہلی دفعہ 8 مارچ 2000ء کو کابل میں خواتین کا عالمی دن منایا گیا جس میں سات سو خواتین جمع ہوئیں وہاں وائس چانسلر نے تقریر میں کہا کہ ہمارے پاس خواتین کی تعلیم کے مسئلے کا حل تو ہے لیکن اس مسئلے کا کوئی حل نہیں کہ دنیا ہم سے مخلوط تعلیم کا نفاذ چاہتی ہے۔ وہ لکھتا ہے اور تمام مغربی حوالوں سے لکھتا ہے کہ ”باہم متصادم گروہوں کو غیر مسلح کرنے کے علاوہ طالبان نے عصمت دری، لوٹ مار، ڈکیتی اور قتل و غارت جیسے جرائم کا کامیابی سے خاتمہ کیا۔ سب سے بڑی بات افغانستان میں قانون کی حکمرانی تھی۔ اس کے نزدیک طالبان کے جرائم میں سرفہرست موجودہ عالمی نظام سے آزادی، دوسرا ایک کامیاب اسلامی ریاست کا قیام، تیسرا تیل کی صنعت سے وابستہ افراد کے اثر و رسوخ سے انکار، چوتھا کارپوریٹ میڈیا کے مقابل میں میڈیا کا فقدان اہم ترین جرائم تھے۔ کتاب انکشافات کا مجموعہ ہے اور یہ انکشافات عابد اللہ جان نے مغربی میڈیا کی رپورٹوں سے اکٹھے کیے ہیں۔ وہ انکشاف جنہیں میڈیا کی چکا چوند نے چھپا دیا تھا۔ وہ سچ جو بکھرا ہوا تھا اسے اکٹھا کیا گیا ہے۔ ورنہ میڈیا تو دنیا بھر میں ان لوگوں کے کنٹرول میں ہے جو سروں کی فصلیں کاٹ کر ترقی کی سیڑھیاں چڑھتے ہیں اور اس مقصد کے لیے ان کے پاس پتلیوں کی طرح رقص کرتے دانشوروں، تجزیہ نگاروں، ادیبوں، شاعروں اور مورخوں کی کمی نہیں ہے۔ ایسے لوگ تاریخ کے ہر دور میں میسر رہے ہیں۔ ”رویبضہ“ جن کے ہاتھ میں اہم معاملات پر گفتگو کرنے کا لائسنس میڈیا نے عطا کیا ہے۔

صف بندیاں ہو رہی ہیں

یوں لگتا ہے پورے عالم اسلام میں صف بندی ہو رہی ہے۔ دوستیاں اور دشمنیاں واضح ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ عالمی صورت حال، دو طرفہ تعلقات اور باہمی امن کے نام پر جو منافقت ہو رہی تھی اس کا خاتمہ ہو رہا ہے جو جس کے خلاف سازش یا پس پردہ دشمنی کر رہا تھا اب اس کا کردار واضح ہوتا جا رہا ہے۔ گزشتہ تیس سال سے پاک بھارت دوستی کی منافقت زور و شور سے چل رہی تھی۔ دو طرفہ تعلقات اور علاقائی امن کے نام پر کانفرنسیں بھی منعقد ہوتی تھیں، وفود کا تبادلہ بھی ہوتا تھا اور مسائل کے حل کے لئے سربراہان مملکت بھی آپس میں ملتے تھے۔ ان سب کے علاوہ ایک اور ہجوم تھا۔ این جی اوز، سول سوسائٹی اور امن کے پرچم بردار گیندے کے پھولوں کے ہار لے کر ایک دوسرے کا واہگہ بارڈر پر استقبال کرنے والے، بارڈر پر شمعیں جلا کر امن کے پیامبر بننے والے۔ یہ عجیب لوگ اپنی مخصوص منطق کے ساتھ ٹیلی ویژن پروگراموں، سیمیناروں اور جلسوں میں تشریف لاتے۔ ان سے کوئی سوال کرتا کہ بھارت میں کشمیر پر ظلم ہو رہا ہے وہاں مسلمان اقلیت بدترین معاشی اور معاشرتی حالات میں زندگی گزار رہی ہے تو ایک دم بھڑک اٹھتے اور کہتے کہ ہم بھی تو اپنی اقلیتوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہے، ہم نے بھی تو ان کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے پاکستان میں وہ بھارت کے وکیل ہیں۔ ان سب لوگوں کی بھارت یاترا لگی رہتی اور وہاں سے آنے والوں کی پاکستان یاترا۔ ان سب کا نشانہ کسی نہ کسی طور پر پاکستان کی افواج ہوتیں۔ بنگلہ دیش ان کا محبوب ترین موضوع ہوتا۔ یہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو صرف اور صرف افواج پاکستان کی زیادتیوں سے تعبیر کرتے۔ ان کی زبان پر نہ کبھی مکتی باہنی کے مظالم آئے اور نہ ہی انہیں یہ یاد رہتا کہ بھارت نے وہاں افواج اتار کر اس حصے کو علیحدہ کیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی ان کے ہاں فوج سے نفرت کی علامت تھی۔ اسی لیے وہ اس کے تمام گناہ صاف کر دیتے۔ بلوچستان میں سیاسی حکومت کا دھڑن تختہ ذوالفقار علی بھٹو نے کیا تھا اور وہاں آرمی ایکشن بھی اسی کے حکم سے شروع ہوا لیکن یہ اس کا نام تک نہ لیتے بلکہ صرف اور صرف فوجی کارروائی یا آپریشن کہتے۔ حبیب جالب کی برسیاں مناتے لیکن ذکر تک نہ کرتے کہ حبیب جالب پر غداری کا مقدمہ ذوالفقار علی بھٹو نے بنایا تھا۔ عالمی امن، حقوق نسواں، علاقائی امن اور حقوق انسانیت ان کے خوبصورت چہرے تھے لیکن کسی مسلمان پر اگر بھارت میں تشدد ہوتا، کوئی شہر جیسے احمد آباد بدترین قتل و غارت کا شکار ہوتا۔ کشمیر میں مظالم ڈھائے جاتے لیکن ان کی زبان سے احتجاج نام کا لفظ تک نہ نکلتا۔ نہ شمعیں جلائی جاتیں اور نہ ہی پلے کارڈ لے کر بازاروں میں نکلا جاتا لیکن اگر پاکستان میں کسی اقلیت پر تھوڑا سا بھی تشدد ہوتا تو یہ اس کی دہائی عالمی سطح پر لے جاتے۔ یہ دہائی اس قدر شدت سے مچائی جاتی کہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک ان اقلیتوں کو سیاسی پناہ دینے لگے اور پاکستان ان ممالک میں شمار ہونے لگا جہاں اقلیتیں غیر محفوظ ہیں۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ کشمیر میں ایک لاکھ شہداء کی قبروں کے باوجود بھارت ایک عظیم جمہوری ملک ہے اور وہاں اقلیتوں کو ہر طرح کا تحفظ حاصل ہے جبکہ پاکستان کو ان آستین کے سانپوں نے دنیا بھر میں بدنام کیے رکھا۔

گیارہ ستمبر کے بعد تو ان کی لاٹری نکل آئی۔ پوری دنیا کے نزدیک مسائل کی جڑ اور فتنے و فساد کا موجد صرف اور صرف مسلمان تھے۔ ان میں سے بھی وہ مسلمان جو پاکستان اور افغانستان میں یا اس کے آس پاس کے علاقوں میں بستے تھے۔ بم برسائے گئے، شہری آبادیاں مسمار کی گئیں، بچوں، عورتوں کو نشانہ بنایا گیا۔ افغانستان کے دشت لیلیٰ کا وہ واقعہ کہ جس میں تین ہزار افغانوں کو کنٹینروں میں بند کر کے دھوپ میں کنٹینر رکھ دیئے گئے تھے اور وہ افراد ان کنٹینروں میں تڑپتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ دنیا کی انسانی حقوق کی تنظیموں کے نقشے اور ریکارڈ میں اس واقعے کی کوئی حیثیت تک نظر نہیں آتی۔ آپ کو کہیں بھی یہ دلدوز واقعہ تاریخ کے سیاہ ترین واقعات میں نظر نہیں آئے گا۔ امریکہ اس کے حواری نیٹو ممالک اور پاکستان یہ سب وہ ممالک تھے جن میں ان تمام انسانی حقوق، عالمی امن اور انسانی بھائی چارے کے نام پر بننے والی تنظیموں کو پذیرائی حاصل رہی۔ ایسی تمام سیاسی جماعتیں، سیاسی رہنما جن کا رجحان سیکولرزم اور بھارت پرستی کی طرف تھا ان کے لئے اقتدار کے راستے کھل گئے۔ بھارت شاندار ہمسایہ اور گنگا جمنی تہذیب کے نعرے نے دونوں جانب ایک ایسی منافقت کو رواج دیا جس میں پاکستان کے ہر اس طبقے میں بھارت کو گھسنے کا موقع ملا جو ریاست پاکستان کی سالمیت کے درپے تھا۔ یہ سب جانتے تھے کہ کون، کب اور کہاں بھارت کی ایجنسیوں سے رابطے میں ہوتا ہے، کون کہاں سے سرمایہ حاصل کرتا ہے، کون کس کی زبان بولتا ہے لیکن کہیں اس کا تذکرہ تک نہ ہوتا۔ میڈیا سے لے کر اقتدار پر بیٹھے سیاسی رہنما ہوں یا فوجی جرنیل سب اسے ”پڑوسی ملک“ کہتے۔ کوئی بھارت کا نام نہ لیتا۔ ہم کس قدر ظالم ہیں کہ ہم نے اپنے ساتھ زیادتی کرنے والوں کا نام تک لینا چھوڑ دیا۔ یہی بدقسمتی تھی کہ کسی کو اس بات پر شرم تک محسوس نہ ہوئی کہ بنگلہ دیش جسے بھارت نے فوجی حملہ کر کے ہم سے الگ کیا تھا، اس کی تحریک آزادی کا ایوارڈ وصول کرنے جاتے۔ دنیا کی تاریخ میں ہم شاید واحد ایسے لوگ تھے۔ کیا کسی امریکی نے ویت نام میں، کسی روسی نے یوگوسلاویہ میں یا کسی انگریز 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران انگریز قوم سے غداری پر ایوارڈ وصول کیا تھا۔ ہم نے یہ تاریخ بھی رقم کر دی۔

لیکن اب وقت بدل رہا ہے۔ یہ وقت ہم نے خود نہیں بدلا، اس لئے کہ شاید ہم یہ جرات خود نہ کر پاتے۔ جتنے سال ہم نے مفاہمت اور ”ایک پڑوسی ملک“ کہہ کر گزارے، بھارت نے ٹھیک اتنے سال ہمیں عالمی دہشت گردی کا حصہ ثابت کرنے میں لگائے۔ ممبئی حملہ سے لیکر آج تک حالات نے پلٹا کھایا اور نریندر مودی مسند اقتدار پر آ گیا۔ پہلوان للکار کر اکھاڑے میں اترا تو ہماری جانب بھی منافقت کا لبادہ اتارنا پڑا۔ اب صرف سچ سامنے ہے۔ ہم ایک دوسرے سے کتنی نفرت کرتے ہیں، ایک دوسرے سے کس قدر الگ ہیں۔ دونوں قوموں پر واضح ہوتا جا رہا ہے۔ یہ صف بندی ہے۔ یہ صف بندی صرف پاک و ہند میں نہیں عالم اسلام میں بھی ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق وہ وقت قریب آن پہنچا ہے کہ جب مسلمان دو محاذوں پر آخری بڑی جنگ لڑ رہے ہوں گے ایک بھارت کے ساتھ اور دوسری شام کے محاذ میں دجال کے ساتھ۔ آپؐ نے فرمایا ”جب تم ہند کے بادشاہوں کو زنجیروں میں جکڑ کر لاؤ گے تو حضرت عیسیٰؑ کو اپنے درمیان پاؤ گے (کتاب الفتن)۔ یہ ٹائم لائن قریب نظر آ رہی ہے۔ صف بندیاں ہو رہی ہیں، منافقت ختم ہو رہی ہے دشمن آمنے سامنے آ رہے ہیں۔

سیکولر قومی ریاستیں اور مظلوم انسان

انسانی تہذیب کی ارتقاء اور معاشرتی ترقی کی داستان بیان کرنے والے دانش ور، موجودہ سیکولر قومی ریاستوں کو ترقی کی معراج سمجھتے ہیں۔ یہ قومی ریاستیں پہلی جنگ عظیم کے آس پاس دنیا کے نقشے پر اس طرح ابھریں جیسے جھیل کا پانی خشک ہو جائے تو مٹی کی تہہ میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے کی دو تین صدیاں پانچ قوموں کی دنیا بھر پر یلغار کی صدیاں ہیں۔ ان میں تین اقوام، برطانیہ، فرانس اور سپین تو وسیع علاقوں پر قابض رہیں جبکہ ہالینڈ اور پرتگال نے نسبتاً کم علاقے اپنے زیر نگیں کیے۔ ان تمام اقوام نے آسٹریلیا سے لے کر امریکہ کے مغربی ساحلوں تک ہر جگہ کبھی تجارت اور کبھی براہِ راست جنگ کے ذریعے علاقوں پر قبضہ کیا، ان کے وسائل کو لوٹا، وہاں سے انسانوں کی کثیر تعداد کو غلام بنا کر اپنے ملکوں میں لے جایا گیا اور اس لوٹ مار سے اپنے چھوٹے چھوٹے مغربی ممالک کو دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں تبدیل کر لیا۔ جب یورپ کے یہ چھوٹے چھوٹے ملک دنیا بھر کی لوٹ مار سے ترقی کی منازل طے کر گئے تو پھر ایک خاص منصوبے کے تحت انسانوں کو سیکولر قومی ریاستوں میں تقسیم کر کے زمین پر مصنوعی لکیریں کھینچ دی گئیں۔ یہ لکیریں آج بھی مصنوعی ہیں، اگر ان لکیروں کے دونوں جانب چاک و چوبند افواج کے مسلح دستے نہ کھڑے ہوں اور ایک جانب سے دوسری جانب جانے والوں کو زبردستی نہ روکیں۔ جنگ عظیم اوّل ختم ہوئی تو ان تمام سیکولر قومی ریاستوں کی ایک انجمن بنائی گئی جسے لیگ آف نیشنز کہتے تھے۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد ان مصنوعی لکیروں کے تقدس، حرمت اور قانونی حیثیت کو ایک مسلمہ اصول کی حیثیت سے تسلیم کروانا تھا۔ اسی اصول کے تحت 1920ء میں پاسپورٹ کا ڈیزائن، لیگ آف نیشنز میں پیش ہوا۔ 1924ء تک ویزا ریگولیشن بنائے گئے اور پھر بارڈر سکیورٹی فورسز نے ہر سیکولر قومی ریاست کی لکیریں جنہیں عالمی سرحدیں کہا گیا تھا، ان کے تحفظ کے لیے بندوقیں تان لیں۔ پوری دنیا انسانوں کے ایک بڑے چڑیا گھر میں تبدیل کر دی گئی۔ ہر ملک ایک بہت بڑا پنجرہ تھا، جس میں قید انسان اگر بغیر اجازت دوسرے پنجرے کی طرف گئے، تو قید کر دیے گئے، واپس دھکیل دیئے گئے یا گولیوں سے بھون دیئے گئے۔ ان پنجروں کو سیکولر بنیادوں پر اس لیے استوار کیا گیا، یا پھر یہ حدود سیکولر بنیادوں پر اس لئے زمین پر کھینچی گئیں، تاکہ انسانوں میں موجود نسل، رنگ، زبان اور علاقے کا نفرت انگیز تعصب ابھر کر سامنے آئے اور وہ اپنے ساتھ بسنے والے انسانوں سے اس قدر نفرت کریں کہ ان کو قتل کرنے، ان کے گھر اجاڑنے، کھیتوں کو آگ لگانے اور شہر برباد کرنے میں بھی سکون حاصل کریں۔ سیکولر قومی ریاستوں کے اس جذبہ نفرت و تعصب کا اظہار پہلی دفعہ جنگ عظیم اوّل میں ہوا۔ کروڑوں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ سرحدوں کی حرمت اور تقدس کی قسمیں کھائی گئیں، لیکن صرف تیس سال بعد جنگ عظیم دوم میں ایک بار پھر کروڑوں انسانوں کا خون بہایا گیا، ہزاروں شہر راکھ کا ڈھیر بنا دیئے گئے، کروڑوں بے گھر اور خانماں برباد ہو گئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قومی ریاستوں کو سیکولر کیوں رکھا گیا۔ اس لئے کہ اگر کہیں بھی انسانی اقدار، انسانی جان کا احترام اور انسانیت کی مدد کے اصول دستیاب ہیں تو وہ مذاہب میں ملتے تھے۔ عیسائیت ہو یا یہودیت، بدھ ہو یا اسلام، ہندوازم ہو یا جین مت، ان سب کی کتابوں اور ان کی صدیوں کی تعلیمات میں انسانوں کی مدد اور خیر خواہی کا درس ضرور موجود ہے۔ کم از کم اپنے ہم مذہب بھائی کے لیے تو ہر مذہب میں ہمدردی پائی جاتی ہے۔ لیکن سیکولر قومی ریاست کا کمال یہ تھا کہ جرمن اور فرانس دونوں ایک کاک یشین نسل سے تھے، ایک مذہب کے پیروکار تھے، مدتوں ایک ہی رومی سلطنت کا حصہ تھے، لیکن سرحدوں کے تحفظ نے انہیں درندہ بنا دیا۔

سرحدوں کے تقدس اور سیکولر قومی ریاستوں کے تحفظ سے جنم لینے والی درندگی کی مثال اس وقت بحرِ ہند کے سمندروں میں برما سے بھاگے ہوئے روہنگا مسلمانوں کی بھٹکتی ہوئی کشتی میں سوار عورتیں، مرد اور بچے ہیں۔ تھائی لینڈ کے ساحلوں سے گذرتے ہوئے یہ لوگ بھوک اور پیاس سے تڑپ رہے تھے، جب بی بی سی کے ایک صحافی نے ان کی فلم بندی کی۔ یہ وہ مسلمان ہیں جنہیں برما اپنا شہری تصور نہیں کرتا۔ بنگلہ دیش جن پر اپنے دروازے بند کر چکا۔ پیاس میں تڑپتے ہوئے بچے، بھوک سے نڈھال مرد اور عورتیں، جزائر انڈیمان کے نزدیک چودہ مئی کو انہیں دیکھا گیا۔ انڈونیشیا کی حکومت نے کہا کہ ان کو ساحل پر اترنے میں مدد دینے والے کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ یہ ایک کشتی تھی جس میں 370 مرد اور بچے سوار تھے۔ اس وقت تقریباً اس طرح کی تیس کشتیاں جن میں دس ہزار لوگ سوار ہیں، سمندر میں سرگرداں ہیں کہ کسی ملک کی سرزمین انہیں پناہ دے۔ سات دن بعد اس ایک کشتی کے تین سو ستر مسافروں کو ملائیشیا نے اس شرط پر اترنے دیا کہ انہیں واپس ان کے ملک برما بھیجا جائے گا۔ وہ برما جو انہیں اپنا شہری ہی تسلیم نہیں کرتا اور جہاں ان کا قتل عام ہو رہا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ جب برما کے ان روہنگا مسلمانوں کو ملائیشیا کے ساحل پر اتارا گیا تو اس میں بنگلہ دیش کے لوگ بھی شامل تھے۔ وہ بنگلہ دیش جسے ساٹھ کی دہائی میں پاکستان کے عظیم دانش ور یہ کہتے تھے کہ مغربی پاکستان ان کے وسائل کو لوٹ رہا ہے۔ 1971ء میں آزادی کے بعد اس بنگلہ دیش کی حالت یہ ہوئی کہ تقریباً نوے لاکھ بنگالی بھارت میں معمولی نوکری کرنے کیلئے غیر قانونی طور پر آباد ہیں اور دس لاکھ بنگالی عورتیں دنیا کے بازاروں میں بیچی جا چکی ہے۔ ان بھٹکتی ہوئی کشتیوں میں نامعلوم کتنے بنگلہ دیشی ہوں گے جو خوف اور معاشی مجبوری کے ہاتھوں پناہ ڈھونڈ رہے ہوں گے۔

دوسرا تماشہ اس سمندر میں لگا ہوا ہے جو مصر، لیبیا، تیونس، الجزائر، شام اور مراکش کو ایک جانب سے چھوتا ہے اور دوسری جانب سپین، اٹلی، یونان اور یورپ کے ساحلوں پر ختم ہوتا ہے۔ یہ وہ سمندر جس کے ساتھ آباد ممالک سے کبھی امریکہ اور یورپ کے سفاک انسانی سمگلر افریقی غلاموں کو زنجیروں میں جکڑ کر لے جایا کرتے تھے اور اپنے ملکوں میں بیچ دیتے تھے۔ آج یورپی یونین نے اقوام متحدہ سے اجازت مانگی ہے کہ افریقہ اور مشرقِ وسطی سے آنے والی کشتیوں پر فوجی طاقت استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس سال اقوام متحدہ کے اندازوں کے مطابق ساٹھ ہزار افراد نے اس سمندر کو عبور کر کے یورپ میں داخل ہونے کی کوشش کی جن میں سے تیس ہزار کے قریب افراد سمندر کی لہروں کی نذر ہو گئے۔ جب کے organization for migration International کے مطابق 2014 میں تین ہزار دو سو اناسی (3279) افراد یہ سمندر عبور کرتے ہوئے لقمۂ اجل بن گئے۔ یہ سب لوگ شام، لیبیا، صومالیہ، اوسیٹریا، نائیجریا اور دیگر ممالک سے ہیں۔ یہ وہ تمام ممالک ہیں جنہیں سیکولر قومی ریاستوں کے نام پر تقسیم کیا گیا۔ افریقہ کے نقشے کو ایسے کاٹا گیا جیسے میز پر کیک رکھ کر کاٹا جاتا ہے۔ پھر ان ممالک پر خانہ جنگی مسلط کی گئی۔ انہیں معاشی طور پر لوٹ کر قحط کا شکار کیا گیا اور آج وہاں کے عوام اپنے ملکوں سے خوف، بدامنی اور بھوک کی وجہ سے بھاگ رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ان ممالک سے انسانوں کو ایسے پکڑا جاتا تھا جیسے جنگلوں میں جانوروں کو جال لگا کر پکڑا جاتا ہے۔ پھر ان کو زنجیروں سے باندھ کر غلام بنا کر لے جایا جاتا تھا۔ ان لوگوں کی محنت سے امریکہ کے مسس پی کی زمینیں آباد ہوئیں اور یورپ کے شہروں کی رونقیں ان کے خون پسینے کی بدولت ہیں۔ آج یہ لوگ اسی یورپ کی جانب جاتے ہیں تو انہیں سمندر کی لہروں میں غرق کر دیا جاتا ہے۔ سیکولر قومی ریاستوں کا یہ خوفناک منظر، انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

لیکن کیا ستاون اسلامی ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کو اندازہ ہے کہ اگر روزِ حشر اللہ نے یہ سوال کر لیا کہ جس دن ہزاروں روہنگا مسلمان بھوک اور پیاس سے مجبور ہو کر سمندر میں دم توڑ رہے تھے اور تم آرام دہ کمروں میں بیٹھے، شاندار مرغن کھانوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جب ان کے بچے بھوک سے بلک رہے تھے اور تم اپنے بچوں کو زندگی کو آسائشوں سے بہرہ مند کر رہے تھے۔ ایسے میں حشر کی گرمی اور میزانِ عدل کی موجودگی میں ہم ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے پاس کوئی جواب ہو گا۔ سوچئے تو شاید اس بات کا جواب بھی مل جائے کہ ہم پر عذاب کیوں نازل ہوتے ہیں۔

سیلانی ٹرسٹ.......ایک انوکھا طرز امداد

لوگ ہمیں کہتے ہیں کہ آپ یہ جو روزانہ 65 ہزار افراد کو دو وقت کا کھانا کھلاتے ہو، اس طرح آپ انہیں نکما اور ہڈ حرام بنا رہے ہو۔ میں انہیں جواب دیتا ہوں کہ کبھی آپ ہمارے دستر خوانوں پر آ کر تو دیکھیں آپ کو اسی فیصد لوگ ایسے ملیں گے جو روزانہ مزدوری کرتے ہیں اور اس مزدوری سے بمشکل ان کے گھر کا خرچ نکل سکتا ہے۔ یہ لوگ عموماً دوپہر کو بھوکا رہتے تھے یا پانی میں نمک مرچ گھول کر گھر سے لائی ہوئی خشک روٹی کھا کر دوبارہ کام میں لگ جاتے تھے۔ اب یہ ہمارے دستر خوان پر بہترین کھانا کھاتے ہیں اور ایک نئی توانائی سے کام پر لگ جاتے ہیں۔ باقی 20 فیصد واقعی وہ ہیں جو بالکل کام نہیں کرتے لیکن ہمارے دستر خوان پر آ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اگر انہیں یہ سہولت میسر نہ ہو تو وہ یقیناً اپنی پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے چوری کرتے، بھیک مانگتے یا پھر کسی اور دھندے کا شکار ہو جاتے۔ یہ الفاظ تھے محمد بشیر فاروق قادری کے جو سیلانی ویلفیئر انٹرنیشنل ٹرسٹ کے سرپرست اعلیٰ ہیں۔ اللہ نے عجز و انکسار اور خلق خدا کا درد انہیں اس قدر وافر دیا ہے کہ رشک آتا ہے۔ میں ٹھیک دو سال بعد انہیں ملنے بہادر آباد کراچی چورنگی کے ساتھ والی گلی میں کئی منزلہ سیلانی ویلفیئر ٹرسٹ کی بلڈنگ میں گیا۔ دو سال قبل جب میں یہاں آیا تھا تو اس سے پہلے میں اس ٹرسٹ کے تمام منصوبوں کو دیکھ کر آیا تھا۔ ایسا حسن انتظام تو ایک خواب ہے۔ ایسے کارکن کہاں سے میسر آتے ہیں کہ حرص و ہوس کی اس دنیا کے باسی ہی معلوم نہیں ہوتے۔ جامعہ کلاتھ مارکیٹ سے گزرتے ہوئے سول ہسپتال پہنچا تو دروازے پر کار پارکنگ کی جانب سے سیلانی ویلفیئر ٹرسٹ کے مستعد کارکنان سٹریچر اور ویل چیئر ہاتھوں میں پکڑے کھڑے تھے۔ ٹرسٹ کے لوگوں کو علم ہوا کہ ہسپتالوں میں سٹریچر اور وہیل چیئر پر قبضے کا ایک مافیا بن چکا ہے اور لوگوں کو اپنے پیاروں کے لیے سٹریچر یا وہیل چیئر لینے کے لیے خطیر رقم ان اہلکاروں کو دینی پڑتی ہے جنہوں نے ان پر قبضہ کیا ہوتا ہے۔ سیلانی کے کارکنان ایسے مریضوں کو وہیل چیئر یا سٹریچر پر بٹھاتے اور جب تک ان کا ہسپتال کا تمام کام مکمل نہ ہو جاتا اس کے ساتھ رہتے اور پھر مین گیٹ پر کسی سواری تک چھوڑ کر آتے۔ پارکنگ کے ساتھ لگے سٹینڈ میں وردیوں میں ملبوس یہ کارکنان ان کی استعداد اور لگن دنیا کے کسی بھی مہذب معاشرے کی عکاس تھی۔ سیلانی کا دستر خوان بھی ایک خوش کن تجربہ تھا۔ بکرے کا گوشت اور وہ بھی اس قدر صاف کیا ہوا۔ باورچیوں نے مکمل حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق لباس پہنا ہوا۔ کھانے کی خوشبو اشتہا انگیز تھی اور گرم گرم روٹیوں کا تصور ہی آدمی کو بہترین کھانے کی لذت سے آشنا کر دیتا ہے۔ ان کے سٹور میں لوگ بکرے خرید کر بھی دے جاتے ہیں اور ان سے بھی خریدتے ہیں۔ جہاں ان کا اپنا مذبحہ خانہ ہے، میں نے اس قدر خوبصورت انتظام کسی مذبحہ خانے میں نہیں دیکھا۔ ان دستر خوانوں پر روزانہ 65 ہزار افراد کھانا کھاتے ہیں اور اس کھانے پر زکوۃ کی رقوم سے ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کیا جاتا۔ دو سال قبل یہ دستر خوان کراچی میں تھے اور آج یہ حیدر آباد، اسلام آباد، فیصل آباد اور لاہور میں بھی ہیں۔ انہی دستر خوانوں پر رمضان کے مہینوں میں افطاری اور سحری کا بھی بندوبست ہوتا ہے۔ یہ تو ان افراد کی بات ہے جو ان دستر خوانوں پر آ کر کھانا کھاتے ہیں۔ ہزاروں گھرانے ایسے ہیں جن کے ہاں گوشت کھانا ایک خواب ہے، سیلانی ٹرسٹ روزانہ کئی سو بکرے جو صدقے کے ہوتے ہیں انہیں ذبح کرتا ہے اور ان کا گوشت ان گھرانوں تک پہنچاتا ہے جو کراچی کی دور افتادہ بستیوں میں رہتے ہیں۔ یہ امداد صرف گوشت پہنچانے تک محدود نہیں بلکہ سیلانی ٹرسٹ سات ہزار پانچ سو خاندانوں کو ماہانہ راشن فراہم کرتا ہے۔

سیلانی کا ایک شعبہ ایسا ہے جو میں نے صرف یورپ اور امریکہ میں دیکھا ہے۔ امریکہ میں اسے گڈول سروسز کہا جاتا ہے۔ اس میں لوگ اپنے پرانے کپڑے اور بعض اوقات نئے کپڑے عطیہ کرتے ہیں تاکہ ایسے لوگوں کے کام آئیں جو کپڑے نہیں خرید سکتے۔ سیلانی کلاتھ بینک بھی ایسی ہی ایک سروس ہے۔ قرض حسنہ کا یہ طریق کار تو حیران کن تھا۔ سیلانی والوں کو علم ہوا کہ ایک رکشہ ڈرائیور کرائے پر رکشا لیتا ہے جس کا اسے روزانہ تقریباً دو ہزار روپے کرایہ دینا ہوتا ہے۔ انہوں نے اس رکشہ ڈرائیور کو رکشہ لے کر دے دیا اور روزانہ ایک ہزار روپے اس سے قسط کر لی اور یوں وہ چند مہینوں بعد رکشے کا مالک بن گیا۔ ہنر سکھانے کا سیلانی کا پروگرام بھی کمال کا ہے۔ جب تک کوئی شخص کوئی ہنر سیکھ رہا ہوتا ہے اس وقت اس کے تمام اخراجات ٹرسٹ اٹھاتا ہے یہاں تک کہ اس کے گھر سے ادارے تک جانے کا سفر خرچ بھی۔ یوں جب وہ ایک کار آمد فرد بن جاتا ہے تو اپنا روزگار خود کما لیتا ہے۔ دو سال قبل امریکہ سے ایک صاحب ضیاء الدین خان صاحب تشریف لائے تھے جو انفارمیشن ٹیکنالوجی کی بے شمار ڈگریوں سے آراستہ تھے۔ وہ وہاں icloud ٹیکنالوجی کی تربیت دے رہے تھے جو اس وقت پاکستان میں ناپید تھی۔ آج دو سال بعد ان کی کمپیوٹر لیب کی وسعت دیکھ کر کسی بڑے ادارے کا گمان ہوتا ہے۔ سیلانی والوں نے مجھے وہ موٹر سائیکل بھی دکھائے جو ایک مکمل فائر بریگیڈ کا کام کر سکتے تھے۔ فائر بریگیڈ تنگ گلیوں میں نہیں جا سکتا اس لیے خاص طور پر انہوں نے یہ موٹر سائیکل ڈیزائن کیے۔ عدالتوں میں روزانہ کئی سو گھرانے خلع اور طلاق کے مقدمات میں حاضر ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔ عدالت کے احاطے میں سیلانی نے جھولوں اور بچوں کی تفریح کا بندوبست کیا تاکہ والدین ایک ساتھ انہیں ہنستا کھیلتا دیکھ کر شاید اپنا ارادہ بدل دیں۔ بڑے شہروں کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ وہاں انسان کے مر جانے کے بعد کسی کو تجہیز و تکفین کا پتہ نہیں ہوتا۔ سیلانی کی چوبیس گھنٹہ میت سروس ایسے لوگوں کے مسئلے حل کرتی ہے۔ سیلانی کا بلڈ بینک اور تھیلیسیمیا سنٹر اپنی جگہ کام کر رہا ہے۔ دو سال قبل انہی دنوں میں جس نئے پراجیکٹ کے افتتاح میں مجھے شرکت کا موقع ملا وہ قائداعظم کے مزار کے سامنے ایک ڈسکونٹ سٹور تھا۔ یہ ایک بہت بڑا ڈیپارٹمنٹ سٹور ہے جس پر آپ بہت کم قیمت پر اشیا خرید سکتے ہیں اس کے لئے کسی فرد کی آمدنی دیکھ کر ایک کارڈ بنایا جاتا ہے اور پھر وہ انتہائی عزت و تکریم کے ساتھ وہاں سے سودا سلف لیتا ہے۔ یہ سٹور کسی بھی بڑے سٹور کے ہم پلہ ہے اور یہاں ضرورت کی ہر چیز میسر ہے۔

بشیر فاروق قادری صاحب کی شخصیت ایک روحانی شخصیت ہے' ان سے مل کر سکون حاصل ہوتا ہے' دل کو طمانیت ملتی ہے۔ اس بار بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ایک ایسا فرد جسے دیکھ کر اللہ یاد آ جائے۔ گزشتہ ملاقات پر انہوں نے دو کتابیں تحفے میں دیں۔ ایک ان کے آئیڈیل حضرت عمر بن عبدالعزیز کی شخصیت پر کتاب تھی اور دوسری غیبت کی برائی پر۔ یقین جانئے دونوں کسی فرد کو بدلنے کے لئے کامل کتب ہیں۔ اس دفعہ ملے تو کہنے لگے میں نے اپنے تمام ملازمین کے بارے میں وہ تمام سہولیات فراہم کرنے کا حکم دے رکھا ہے جو حضرت عمر فاروق دیا کرتے تھے۔ ہر ملازم کے بچے کا پیدا ہوتے ہی وظیفہ مقرر کر دیا جاتا ہے جو اس کی تعلیم مکمل ہونے تک قائم رہتا ہے۔ کہنے لگے گزشتہ دنوں مجھے پتہ چلا ہماری ایک ملازمہ اپنا چند ماہ کا بچہ گھر چھوڑ کر آتی ہے کیونکہ اس کے خاوند نے بیرون ملک شادی کر لی ہے۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی کہ مجھے اپنے ملازموں کے حالات کا بھی علم نہیں۔ اس خاتون کو کہا گیا کہ جب تک تمہارے بچے بڑے نہیں ہو جاتے تو تنخواہ لو گی لیکن کام یہ ہے کہ صرف بچے پالو گی۔ میں نے کہا مجھے آپ کی اس بات سے سیدنا عمر فاروق ؓ کا واقعہ یاد آ گیا۔ آپ کے ایک جاننے والے نے ایک دن ان سے مدد کا سوال کیا تو حضرت عمرؓ دھاڑیں مار کر رونے لگے کہ اے عمر ہر شخص ضرورت مند تھا' تیرے قریب تھا اور تجھے اس کا احساس تک نہ ہو سکا اور اسے دست سوال دراز کرنا پڑ گیا۔ سیلانی کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ میں یہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ بحیثیت امت مسلمان دنیا میں سب سے زیادہ خیرات دینے والی امت ہے۔ یہاں کوئی بل گیٹس طرح خیرات نہیں کرتا کہ اس کے اپنے حصص قائم رہیں اور منافع خیرات کر دے۔ کارپوریٹ ویلفیئر سسٹم نہیں ہے یہ۔ لیکن شاید ہمیں عادت ہو چکی ہے مرعوب ہونے کی' ہمیں اپنی خوبیوں پر فخر کرنا ہی نہیں آیا۔ میں دنیا کے کسی بڑے ڈونر کو بشیر فاروق قادری کی طرح چوبیس گھنٹے محتاجوں' غریبوں اور ناداروں کے درمیان نہیں دیکھا۔ ہمارا طرز زندگی بھی مختلف ہے اور طرز امداد بھی۔ ہم طلب دنیا اور ناموری کے لئے نہیں اللہ کی رضا کے لئے خیرات کرتے ہیں۔ ہماری فیس بک نہیں جو ہماری امداد ہماری شخصیت کا قد بلند کرتی پھرے۔

شام، فلسطین، یمن، عراق، ہند (پہلی قسط)

گزشتہ چودہ صدیوں سے مسلمان اس زمین پر آباد ہیں۔ان کی داستان عروج سے زوال کی دردناک کہانی ہے۔ "حالی نے جب مدو جزرِ اسلام پر مسدس لکھی تو اس کا آغاز اس مصرعے سے کیا" پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے تھا۔ پستی کی انتہا جس کو حالی نے اس وقت محسوس کیا تھا۔اس کے بارے میں دردمندانِ ملت یہ سمجھتے تھے کہ اس کا علاج موجود ہے۔اسی زمانے میں پورے عالم اسلام میں خوابیدہ ملت کو جگانے کی کئی تحریکوں نے جنم لیا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک سے لے کر تحریکِ خلافت تک ایک بیداری کی لہر تھی جو نہ صرف برِ صغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں دوڑی بلکہ افریقہ میں مہدی سوڈانی، مصر میں اخوان، انڈونیشیا میں ماشومی جیسی کئی تحریکوں نے جنم لیا۔ ملت کو اقبال جیسا حدی خوان میسر آیا جس نے عجم میں آباد مسلمانوں کے دلوں میں امید کی شمعیں روشن کیں۔ان تمام تحاریک اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے علمبرداروں کی کاوشیں اور محنتیں اس وقت بکھر کر رہ گئیں جب مسلم دنیا جدید سیکولر قومی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ ہر کوئی سرحدوں میں قید اپنے ملکوں پر مسلط کئے گئے حکمرانوں سے لڑنے میں مصروف ہو گیا۔ان ستاون کے قریب اسلامی ملکوں میں جتنے بھی حکمران تھے ان میں اکثریت سیکولر ڈکٹیٹروں کی تھی۔ ہر ملک میں ان سیکولر ڈکٹیٹروں کا ایک تسلسل نظر آتا ہے۔ مصر میں جمال عبد الناصر، انور السادات، حسنی مبارک، عراق میں احمد حسن البکر، صدام حسین، شام میں حافظ الاسد اور بشار الاسد، لیبیا میں معمر قذافی، پاکستان میں ایوب خان، یحییٰ خان، پرویز مشرف۔ سعودی عرب اور ایران کو چھوڑ کر پوری عرب دنیا اور مسلم خطوں میں تمام کے تمام حکمران خواہ ڈکٹیٹر ہوں یا جمہوری سیکولر قومی ریاستی اقتدار کے پاسبان ہیں۔ کوئی سیکولر جمہوری ہے تو کوئی سیکولر ڈکٹیٹر۔ یہ سب کے سب مسلمانوں کی چودہ سو سال کی تاریخ، روایت، اقدار اور طرزِ زندگی کا الٹ ہیں۔ چودہ سو سال میں مسلمانوں میں حکمران خلافت اور ملوکیت دونوں طرز کے رہے لیکن 1924ء تک مسلم دنیا میں اسلامی اصولوں پر مبنی تمام ادارے قائم رہے۔ اسلام کا تعزیراتی نظام نافذ رہا اور عدالتی نظام بھی اسی طرح قائم رہا۔ مسلمانوں کا معاشی نظام 1924ء تک ترکوں کے "سوک" تک چلتا تھا جس میں سود نام کی چڑیا پر نہیں مار سکتی تھی۔ مجلّہ عدلیہ الاسلامیہ بھی اسی دور تک نافذ رہا جس سے تمام اسلامی معاشی اصول نافذ کئے جاتے تھے۔ تمام تعلیمی ادارے اسلامی اصولوں کے تحت تعلیمی نظام چلاتے تھے۔

جدید سیکولر قومی ریاستوں کے وجود کے بعد مسلم امت پر مسلط سیکولر ڈکٹیٹروں نے اپنے ملکوں میں سیکولر اخلاقیات نافذ کرنے کی کوشش کی۔ امت کے وہ لوگ جو چودہ سو سال سے ایک مختلف طرزِ زندگی کے عادی تھے ان میں اوّل اوّل تو شدید نفرت کے جذبات ابھرے۔ یہی وجہ ہے اس دور کا لکھا گیا اسلامی ادب مزاحمتی ادب کا پیکر تھا۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اور سید قطب اس دور کے درخشندہ ستارے تھے جن کی تحریروں نے امت کے پژمردہ اور مایوس جسم میں انقلاب کی روح پھونکنے کا فریضہ انجام دیا۔اس کے بعد ہر مسلم کہلانے والے ملک میں ایک گروہ ایسا ضرور پیدا ہو گیا جو اپنے ماضی کی طرف لوٹنا چاہتا تھا جس میں ان کے دین کو معاشرتی زندگی پر غلبہ حاصل تھا۔ جدید سیکولر قومی ریاستوں کا المیہ یہ تھا کہ ان میں ہر کوئی عالمی سیاسی نظام کا محتاج اور عالمی طاقتوں کے رحم و کرم پر تھا۔ان عالمی طاقتوں نے جو عالمی سیاسی نظام وضع کیا تھا اس میں جمہوریت کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن ایسی جمہوریت جو سیکولر اقدار پر استوار ہو۔اسی لئے الجزائر اور مصر میں جب ایسے لوگ جمہوری طور پر برسرِ اقتدار آئے جو اسلامی نظامِ حکومت کے داعی تھے تو انہیں بزور طاقت کچل دیا گیا۔ افغانستان اور عراق میں لاکھوں لوگوں کو قتل کر کے، خود ایک آئین تحریر کیا گیا، اپنی نگرانی میں الیکشن کرائے گئے اور طاقت کے زور پر جمہوریت نافذ کر دی گئی۔ یہ گزشتہ سو سال کی مایوسی، ناکامی، نامرادی، عالمی طاقتوں کی غنڈہ گردی، تشدد، شدید قتل عام، اور ہر سطح پر عدم شنوائی تھی جس کی وجہ سے چیچنیا سے شام، یمن سے عراق، لیبیا سے صومالیہ اور فلسطین سے کشمیر تک ہر جگہ مسلح جدوجہد کے سوا اب کچھ اور نظر نہیں آتا۔ کیا یہ سب فساد کسی دن امن کے خوبصورت مستقبل میں بدل جائے گا یا پھر ایک طویل خونریزی اور بہت بڑی جنگ ہماری راہ دیکھ رہی ہے۔ یہ اس امت کے ہر مرد و زن کے چہرے پر لکھا ہوا سوال ہے۔

جو لوگ سید الانبیاء ﷺ کے علم حدیث کے دریا میں غوطہ زن ہیں، ان کے نزدیک اب امن نہیں بلکہ ایک طویل خونریزی اور بہت بڑی جنگ ہماری راہ دیکھ رہی ہے۔ یہ دورِ فتن ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا "تم پر چار فتنے آئیں گے، پہلے فتنے میں خونریزی کو حلال سمجھا جائے گا، دوسرے فتنے میں خون اور مالوں کو حلال سمجھا جائے گا، تیسرے فتنے میں خون، مال اور شرمگاہوں کو حلال سمجھا جائے گا اور چوتھا فتنہ بہرا، اندھا اور سب پر چھا جانے والا ہو گا، وہ سمندر کی موجوں کی طرح ٹھاٹھیں مارے گا حتیٰ کہ لوگوں میں کسی ایک کے لئے بھی اس فتنے سے بچنے کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو گا۔ یہ فتنہ ملک شام میں پھرے گا اور عراق کو ڈھانپ لے گا اور جزیرہ عرب کو اپنے ہاتھ اور پاؤں سے روند ڈالے گا"۔ (کتاب الفتن، نعیم بن حماد: 89) یہ ہے وہ ترتیب جو میرے آقا نے دورِ فتن کے دوران آنے والے فتنوں کے بارے میں بتائی۔اس دورِ فتن کے آخر میں ایک بہت بڑی جنگ ہے جس میں حق کی فتح اور اسلام کا غلبہ ہے۔

حضرت ابراہیم کی نسل سے تین مذاہب نے جنم لیا۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام۔ ان تینوں مذاہب کے لوگ اس جنگ پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن بحیثیت قوم اس پر پختہ ایمان صرف اور صرف یہودیوں کا ہے، اور انہوں نے اجتماعی طور پر پختہ یقین کے ساتھ اس کے لئے ہجرت بھی کی ہے۔ ذرا چند لمحوں کے لئے یہ تصور کیجئے کہ آپ یورپ یا امریکہ کے کسی بڑے شہر میں آباد ہیں۔ آپ کا وہاں وسیع کاروبار ہے۔ آپ کا وہاں بہت بڑا گھر ہے، جس میں آپ کئی دہائیوں سے امن، سکون اور عیش و عشرت سے رہ رہے ہیں۔ آپ یا آپ کی کم از کم گزشتہ چھ سات نسلوں کا یروشلم سے گزر تک نہیں ہوا کہ آپ کی کوئی جذباتی وابستگی اس شہر یا اس کے گرد و نواح کے ساتھ ہو۔ آپ کی قوم پر گزشتہ دو ہزار سال سے افتاد ضرور ٹوٹی ہے، آپ کو دنیا بھر میں شدید نفرت کا سامنا رہا ہے۔ مگر اب تو حالات بدل چکے۔ اب تو معاشی، سیاسی، بینکاری اور میڈیا تک کی قوتیں آپ کے ہاتھ ہیں۔ آپ کا دنیا کے فیصلہ کرنے والے مراکز پر قبضہ ہے۔ ایسے حالات میں آپ سے یہ کہا جائے کہ جزیرہ نمائے عرب کے ایک کونے اور صحرائے سینا کے دامن میں جا کر آباد ہو جاؤ۔ ایسا علاقہ جہاں نہ پانی میسر ہے نہ بجلی، نہ کوئی شہری آبادی ہے اور نہ ہی شہری سہولیات کا تصور۔ تو یقیناً آپ اسے پاگل پن کہیں گے۔ لیکن یہودی 1920ء سے آہستہ آہستہ اپنا گھربار اور کاروبار چھوڑ کر یہاں آباد ہونا شروع ہوئے۔ حیفہ اور تل ابیب جیسے صحرائی علاقوں میں جہاں چاروں جانب ریت اور ارد گرد آباد دشمن۔ جنگ عظیم دوم آئی یہودیوں پر شدید ظلم و ستم ہوا لیکن وہ ڈٹے رہے اور اتحادی افواج کی فتح کے بعد وہ ان ملکوں میں مستحکم ہو گئے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اب انہی ملکوں میں رہتے اور اقتدار کے مزے لوٹتے۔ لیکن وہ یروشلم کے آس پاس آ گئے، انہوں نے ایک خود مختار قومی ریاست بنائی، اسے سیکولر نہیں مذہبی ریاست رکھا اور تورات کو اس کا آئین قرار دیا۔ ریاست بنتے ہی پہلی عرب اسرائیل جنگ ہوئی لیکن کسی یہودی میں عدم تحفظ کا احساس پیدا نہ ہوا، کوئی اسرائیل چھوڑ کر نہ بھاگا۔ بلکہ آج دن تک امریکہ اور یورپ کے خوشحال یہودیوں کا وہاں آ کر آباد ہونے کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ سب یہاں کاروبار کرنے، شہر آباد کرنے یا کسی پر فضا مقام پر زندگی گزارنے کے لئے جمع نہیں ہو رہے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی عالمگیر جنگ کے لئے جمع ہو رہے ہیں، جس کے بعد انہیں یقین ہے کہ ان کی ایک ایسی حکومت قائم ہو گی جو پوری دنیا پر حکمران ہو گی اور جس کا ہیڈ کوارٹر یروشلم ہو گا۔ جہاں ان کا مسیحا آئے گا، ہیکل سلیمانی دوبارہ تعمیر ہو گا اور وہ اپنا عروج دیکھیں گے۔

کیا تمام مسلم امہ میں دس فیصد لوگوں کو بھی اس بات کا ادراک ہے کہ وہ سب کے سب ہم سے لڑنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ کیا ہمارے منبر و محراب پر سید الانبیاء کی بیان کردہ وہ حدیث جو متفق علیہ ہے بیان ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہو گی یہاں تک کہ تم یہودیوں سے جنگ کرو گے، یہاں تک کہ وہ پتھر جس کے پیچھے یہودی ہو گا، کہے گا کہ اے مسلم! یہ دیکھو یہ ایک یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے،" (بخاری) ۔ایسی ہی حدیث مسلم شریف میں بھی درج ہے جس میں ایک اضافہ ہے "یہودی پتھر یا درخت کے پیچھے چھپیں گے تو پتھر یا درخت کہے گا، اے مسلمان! اللہ کے بندے! یہ یہودی میرے پیچھے ہے، سوائے غرقد کے درخت کے کیوں کہ وہ یہود کا درختوں میں سے ہے" (مسلم)۔ یہ وہ عالمی جنگ جس کی تمام تیاری دوسری جانب سے مکمل ہے۔ لیکن اس جنگ سے قبل مسلم امہ ایک بہت بڑے دورِ فتن سے گزرے گی، یہ وہی فتنے ہیں جو اندھے گونگے اور بہرے ہیں۔ یہ فتنے چار سو ہیں، اور اس وقت ہر ملک میں پھیلے ہیں۔ (باقی آئندہ)

شام فلسطین یمن عراق جنگ (دوسری قسط)

وہ طاقتیں جنہوں نے یہ آخری عظیم جنگ مسلم امہ کے خلاف لڑنی ہے' ان کا ہیڈ کوارٹر اور مرکز تو یروشلم میں ہو گا اور دنیا بھر کا یہودی اس جنگ میں حصہ لینے کے لئے ایک جذبہ ایمانی کے ساتھ گزشتہ ایک سو سال سے وہاں جا کر آباد ہو رہا ہے۔ اس ملک کو ایک بڑی فوجی اور ایٹمی قوت کے طور پر مستحکم کیا جا رہا ہے۔ چودہ سو سال قبل جب سید الانبیاء ﷺ اس دجالی ہیڈ کوارٹر کے بارے میں خبردار کر رہے تھے تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ ایسا کب اور کس طرح ہو گا۔ اگر یروشلم دجال یا پھر یہودی مسیحا کا ہیڈ کوارٹر اور مرکز ہو گا تو پھر اس سے لڑنے والی مسلمان افواج کا مرکز کونسا مقام ہو گا۔ سید الانبیاء ﷺ نے اس کی بھی وضاحت فرما دی۔ ''حضرت ابو الدرداء سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنگ عظیم کے وقت مسلمانوں کا خیمہ (ہیڈ کوارٹر) شام کے شہروں میں سب سے اچھے شہر دمشق کے قریب ''الغوطہ'' کے مقام پر ہو گا'' (سنن ابوداؤد' مستدرک' المغنی لابن قدامہ)۔ الغوطہ شام کے دارالحکومت دمشق سے ساڑھے آٹھ کلو میٹر پر ہے۔ موجودہ شام اس بڑے شام کا حصہ ہے جو رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں اردن' فلسطین اور لبنان پر مشتمل تھا۔

آج کا شام جنگ و جدل اور قتل و غارت کا شام ہے۔ عرب دنیا میں 2011 میں اٹھنے والی آزادی اور انقلاب کی تحریکوں میں شام کی تحریک جس طرح خانہ جنگی اور قتل و غارت میں تبدیل ہوئی ہے اس کی مثال عرب دنیا کی گزشتہ ایک ہزار سالہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایسے لگتا ہے پوری مسلم امہ کا انتشار شام میں آ کر جمع ہو گیا ہے اور عالمی طاقتوں کی رسہ کشی کا مرکز بھی شام ہی ہے۔ گزشتہ بیس سالوں سے دنیا کے بارے میں یہ تصور عام ہو چکا تھا کہ اب یہ صرف ایک ہی عالمی طاقت امریکہ کے زیر اثر ہے اور روس ایک قصہ پارینہ بن چکا ہے لیکن شام کی خانہ جنگی نے بیس سال پہلے کے میدان جنگ کو پھر تازہ کر دیا۔ یہ دونوں عالمی طاقتیں روس اور امریکہ میدان میں بعد میں کودے ہیں جبکہ مسلم دنیا کے دو ممالک ایران اور سعودی عرب' خالصتاً علاقائی بالادستی کے لئے پہلے دن سے میدان میں اتر چکے تھے۔ بشار الاسد کی حکومت کو بچانے یا اسے گرانے کی کوشش ایسے لگتا ہے شیعہ سنی جنگ میں تبدیل کر دی گئی ہے حالانکہ اس کے پس پردہ محرکات میں ایران' ترکی' سعودی عرب اور قطر کی شام کے علاقے میں بالادستی کی جنگ ہے۔ ورنہ بشار الاسد علوی عقیدہ رکھنے والے افراد میں سے ہے جن کے بارے میں شیعہ سنی گزشتہ ایک ہزار سال سے متفق ہیں کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ کس قدر چالاکی اور ہوشیاری سے ایران اور دیگر مسلم ممالک نے اسے ایک شیعہ سنی لڑائی میں تبدیل کر کے پوری ملت اسلامیہ کو فتنہ و فساد میں مبتلا کر دیا ہے۔ آیئے دیکھیں وہاں کون کون سے گروہ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں اور ان کو کس طاقت کی حمایت حاصل ہے۔

پہلا گروہ جس نے بشار الاسد کی حکومت کے خلاف اٹھنے والی عوامی تحریک کا رخ ہتھیار اٹھانے کی طرف موڑا، وہ جبۃ النصرہ تھا۔ 2012 میں عوامی تحریک کو کچلنے کے لئے بشار الاسد نے طاقت کا استعمال شروع کیا' چار لاکھ کے قریب لوگ ہجرت کر کے لبنان اور اردن میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ ہجوم پر براہ راست فائرنگ کر کے انہیں قتل کیا جا رہا تھا۔ ایسے میں عراق میں القاعدہ نے 12 لڑکوں کو ابو ماریہ القحطانی کی سربراہی میں شام بھیجا تا کہ وہاں بشار الاسد کے خلاف جدوجہد کا آغاز کرے۔ یہ تمام لڑکے شام سے عراق لڑنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے ساتھ شام کے افراد کو ملایا اور کچھ علاقوں کو اپنے کنٹرول میں لینا شروع کیا۔ ان کے ساتھ اردن کے بہت بڑے عالم ڈاکٹر سامی العریبی بھی آ کر مل گئے۔ یہ وہی ڈاکٹر سامی ہیں جنہوں نے موجودہ دور میں حدیث کے سب سے بڑے شارح علامہ ناصر البانی سے 23 سال کی عمر میں مناظرہ کیا تھا کہ مسلمان دنیا کے تمام حکمران کافر ہیں۔ اس وقت جبۃ النصرہ کی قیادت ابو محمد الجولانی کے پاس ہے جو شافعی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں اور جبۃ النصرہ کے پاس شمال میں ادلب اور جنوب میں دران اور کونیترہ کا علاقہ ہے۔ الدولۃ الاسلامیہ یعنی داعش نے جب عراق اور شام میں اپنی حکومت کا اعلان کیا تو ان کی لڑائی ان کے ساتھ بھی شروع ہوئی۔ 3 جنوری 2013ء کی لڑائی بہت خونریز تھی۔ اس وقت النصرہ کے کافی افراد داعش کے ساتھ جا ملے ہیں۔ جس طرح القاعدہ کے اپنے مالی امداد کے ذرائع تھے جو خفیہ طور پر ان کی مدد کرتے تھے اسی طرح یہاں پر ان گروہوں کے پس پردہ لوگ بھی واضح نہیں ہیں۔

دوسرا گروہ جیش الاسلام ہے۔ اس کی سربراہی شیخ زاہران اللوش کے پاس ہے۔ ان کے والد سعودی عرب میں جلاوطنی کی زندگی گزارتے رہے' مدینہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں۔ اصل وطن دوحہ ہے لیکن یہاں اس لڑائی میں اپنے گروہ کی سربراہی کر رہے ہیں۔ جیش الاسلام کے پاس ''الغوطہ'' کا مشرقی علاقہ ہے۔ اس گروہ کی مدد اور اعانت سعودی حکومت سے کی جاتی ہے۔ شام میں بشار الاسد کے خلاف لڑنے والوں کی سب سے بڑی قوت حرکت واحرار الشام الاسلامیہ ہے۔ جسے حسان عبود نے قائم کیا۔ یہ انگریزی کے استاد تھے اس کی سربراہی حمہ کے سبیل القاب کے پاس ہے۔ حرکت احرار کے پاس دو مکمل صوبے طرطوس اور سویدا کا کنٹرول ہے۔ اس تنظیم کو ترکی کی مکمل مدد حاصل ہے۔ ترکی اس وقت شام کے معاملات میں دلچسپی لینے والا سب سے بڑا ملک ہے جہاں 18 لاکھ شامی مہاجرین پناہ گزین ہیں جن پر ترکی کا تقریباً 6 ارب ڈالر خرچہ اٹھ رہا ہے۔ حرکت واحرار کو بھی شام میں معتدل قوت سمجھا جاتا ہے۔ مصر کے اخوان المسلمون کی ایک تنظیم لواء التوحید عبدالقادر الصالح کی سربراہی میں شام میں قائم ہوئی لیکن 2013 میں ان کے ایک معرکے میں جاں بحق ہونے کے بعد تقریباً دم توڑ چکی ہے۔ امریکہ اور اس کے اتحادی دو تنظیموں کی مدد کر رہے ہیں۔ ایک الجیش السوری الحر ہے جسے عرف عام میں فری سیرین آرمی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بشار الاسد کی فوج سے باغی ہوئے اور انہوں نے اپنا ایک گروہ بنا لیا۔ اس گروہ کو امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی حمایت اور فوجی معاونت حاصل ہے۔ دوسرا گروہ کردستان ورکرز پارٹی ہے۔ یہ لوگ کرد علاقوں میں لڑ رہے ہیں۔ ان کا مقصد وہاں کا کنٹرول حاصل کر کے ترکی میں کرد آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانا ہے۔ مغرب اور امریکہ کی مدد ان کو بھی حاصل ہے۔ دوسری جانب بشار الاسد کی حمایت میں پہلے ایران کے پاسداران آ کر لڑتے رہے اور اب ایران نے جنرل قاسم سلیمانی کی سربراہی میں اپنی افواج بھی اتار دی ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ پوری دنیا سے اپنے ہم مسلک افراد کو وہاں لڑنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ ان کے دو گروہ وہاں دیگر سنی گروہ سے لڑ رہے ہیں۔ ایک لواء الفضل العباس ہے جس میں عراقی شیعہ شامل ہیں جبکہ دوسرا گروہ زینبیہ ہے جس میں پاکستان اور بھارت سے گئے ہوئے اہل تشیع کے افراد ہیں۔ حسن نصر اللہ نے اسرائیل سے اپنی جنگ گزشتہ کئی سالوں سے ترک کی ہوئی ہے اور اب حزب اللہ صرف شام میں لڑ رہی ہے۔ شام میں اکثریت سنی العقیدہ عوام کی ہے جس پر دس فیصد سے بھی کم علویوں کی حکومت بشار الاسد کی آمریت کے ذریعے قائم ہے۔ شام میں اثنا عشریہ شیعوں کی آبادی صرف فواء کے شہر میں ہے۔ حرکت الاحرار کی ایک ہزار توپیں اس شہر کے ارد گرد نصب ہیں جس کی وجہ سے حزب اللہ حرکت کے ساتھ لڑائی نہیں کرتی۔ پوری دنیا میں الدولۃ اسلامیہ یعنی داعش کا تذکرہ ہے حالانکہ وہ صرف صحرائی علاقوں پر قابض ہے جس میں رقہ' دیر الزور اور حمص شامل ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ بشار الاسد کی افواج اور داعش میں شمال اور مشرق کے محاذ پر ایک سمجھوتہ ہے۔ اس پورے محاذ کا 45 کلو میٹر بشار کی افواج کے پاس ہے اور باقی پوری سرحد پر داعش تمام دیگر سنی تنظیموں کے حملوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی عالمی طاقت نے حملہ کرنا ہو تو نام داعش کا استعمال کیا جاتا ہے اور حملہ باقی تنظیموں پر کیا جاتا ہے۔ پہلے امریکہ اور اس کے اتحادی حرکت الاحرار اور جبۃ النصرہ پر فضائی حملے کرتے تھے جس سے داعش مضبوط ہوتی تھی اور بشار الاسد کی حکومت ڈگمگاتی تھی' ان حملوں میں الجیش السوری الحر کو مدد فراہم کی جاتی تا کہ وہ مضبوط ہو۔ اب روس' ایران اور عراق مل کر الجیش السوری پر حملہ کرتی ہے تا کہ امریکہ وہاں مضبوط نہ ہو۔

(باقی آئندہ)

شام، فلسطین، یمن، عراق، ہند (آخری قسط)

شام کی سرزمین پر جو جنگ وجدل اور خونریزی ہے اور جس طرح مغربی طاقتیں امریکہ اور روس اس پر قبضے کی جنگ لڑ رہے ہیں، اسی طرح مسلم امہ کی دو طاقتیں سعودی عرب اور ایران بھی وہاں اپنے غلبے کی لڑائی لڑ رہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ امریکہ اور روس کھل کر اعلان کرتے ہیں کہ یہ ہمارے اس خطے میں مفادات کی جنگ ہے، لیکن سعودی عرب اور ایران اسے مسلک کا لبادہ اوڑھا کر منافقت کرتے ہیں اور اپنے علاقائی ایجنڈے کو حق و باطل کی جنگ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ نہ شیعہ کی لڑائی ہے اور نہ سنی کی، یہ وہ قتل وغارت اور خانہ جنگی ہے جس نے پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ مارچ 2011ء میں شام کے صدر بشار الاسد کے خلاف بھی ویسی ہی عوامی تحریک اٹھی تھی جیسی مصر، تیونس، مراکش، لیبیا اور یمن میں تحریکیں اٹھیں۔ پہلی جماعت جس نے بشار الاسد کے خلاف تحریک سے جنم لیا اسے حسن آن عبود ابو عبداللہ نے منظم کیا، جسے حرکت احرار الشام الاسلامیہ کہتے ہیں۔ گیارہ نومبر 2011ء کو اس نے اپنے قیام کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا کسی عالمی جہادی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں۔ اس دوران بشار الاسد کے مظالم اسقدر شدید ہو گئے کہ لاکھوں لوگ ہجرت کر گئے اور بھوک کا عالم یہ تھا کہ لوگ مردہ جانوروں کا گوشت تک کھا کر زندہ رہنے پر مجبور ہو گئے۔ اس ظلم کے ردعمل میں بشار حکومت کے خلاف ہر علاقے میں جہادی گروہوں نے جنم لینا شروع کیا۔ سعودی عرب نے اپنے ایک عالم دین امیر زہران علوش کو مکمل امداد کے ساتھ وہاں بھیجا جس نے جیش الاسلام کے نام سے تنظیم بنائی۔ یہ غوطہ شہر پر قابض ہیں اور انہوں نے دمشق پر حملہ کرنے کے لئے درجنوں سرنگیں کھود رکھی ہیں۔ چند ماہ قبل انہوں نے شام کے وزیرِ انصاف کو دمشق کے ریڈ زون سے اغوا کیا اور بدلے میں پانچ سو قیدیوں کو چھڑایا۔ 22 نومبر 2013ء کو حسان عبود نے ان تمام تنظیموں کو اکٹھا کیا اور گیارہ جماعتوں کے اتحاد کے بعد "ال جبہۃ الاسلامیہ" کا اعلان کر دیا۔ اس اتحاد میں کردوں کی بہت بڑی تنظیم ال جبہۃ الاسلامیہ کردیہ بھی شامل تھی۔ یہ وہ موڑ تھا جس سے عالمی طاقتوں کو اس کھیل میں کودنے کا موقع ملا۔ سعودی عرب کی جیش الاسلام کی حمایت کے بعد ایران ویسے تو بشار الاسد کی پہلے سے ہی مدد کر رہا تھا، لیکن اب وہ کھل کر سامنے آ گیا۔ اپنے پاسداران اور بسیج کے نوجوانوں کو وہاں لڑنے کے لئے بھیجا اور دنیا بھر میں اسے حق و باطل کا معرکہ قرار دے کر لوگوں کو وہاں لڑنے کے لئے اکسایا۔ اس وقت وہاں ایران کی مدد سے تین ملیشیا لڑ رہے ہیں جو کہتے ہیں ہم اپنے مقدس مقامات کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ دوسری جانب دولتِ الاسلامیہ یعنی داعش کو اٹھایا گیا تاکہ کسی طور پر بھی شام کی سنی اکثریت جو دس فیصد علوی بشار الاسد کے پر تشدد عہد میں رہ رہی ہے وہ متحد نہ ہونے پائے۔ داعش کے قیام میں عراق اور شام کے حکومتوں نے جس طرح تعاون کیا اس کی مثال عراق میں موصل اور شام میں تدمر کے شہروں کی داعش کے ہاتھوں فتح ہے۔ موصل کو چھوڑتے ہوئے عراقی فوجی اپنا اسلحہ، ٹینک، دیگر ساز و سامان داعش کے لئے چھوڑ گئی۔ اسی طرح شام کے شہر تدمر کو جب بشار الاسد کی فوجوں نے خالی کیا تو جدید اسلحہ، گولہ بارود اور ٹینک داعش کے لئے چھوڑ گئے۔ گزشتہ تین سالوں سے شام کی فوج حمص شہر پر قبضے کی کوشش کر رہی ہے لیکن دو ماہ پہلے وہ وہاں سے پیچھے ہٹ گئی ہے اور حیرانی کی بات ہے کہ اب ان سے بشار الاسد کی یہ لڑائی لڑنے کیلئے داعش جا رہی ہے جو حمص سے چند کلومیٹر فاصلے پر ہے۔ شام کے شہر لاتاکیہ میں ایرانی فوج کا جرنیل قاسم سلیمانی پہنچ چکا ہے جس کی تصاویر رائٹرز نے جاری کیں، جب وہ ایرانی پاسداران اور حزب اللہ کے دستوں سے مشترکہ خطاب کر رہا تھا۔

اب یہ میدان بہت گرم ہونے جا رہا ہے، اس کی کئی وجوہات ہیں۔ 3 دسمبر 2014ء کو جب گیارہ جماعتوں کے اتحاد کا اجلاس ادلب میں ہو رہا تھا جس میں حسان عبود سمیت تمام قائدین جمع تھے تو ایک بہت بڑا دھماکہ ہوا جس میں سب کے سب جاں بحق ہو گئے۔ یہ سب اس وقت "وحدت الصف" یعنی ایک ساتھ لڑنے کا طریقہ کار طے کر رہے تھے۔ اس کے بعد سے ہر کوئی اپنے طور پر لڑ رہا ہے۔ اس دوران داعش نے اپنی جگہ بنا لی ہے، کیونکہ اس کا ایک خفیہ اتحاد بشار لاسد کی افواج سے ہے اسی لئے شام میں داعش نے اب تک صرف دیگر جہادی تنظیموں سے ہی جنگ کی ہے۔ روس، عراق اور ایران کے اتحاد اور امریکی حکمتِ عملی کی وجہ سے یہ جنگ بہت طویل بھی ہو سکتی ہے کیونکہ یہ سب طاقتیں مل کر بشار الاسد کو مستحکم اور مضبوط بنا دیں گی۔ یہ جنگ جسے ایران اور سعودی عرب نے حق و باطل کی جنگ بنا کر مسلم امہ کو ہیجان میں مبتلا کیا ہے، دراصل وہ فساد ہے جس کی نشاندہی میرے آقا سید الانبیاء ﷺ نے کی تھی۔ آپ ذرا احادیث کو ترتیب سے دیکھیں تو حیران رہ جائیں گے چودہ سو سال پہلے آپ ﷺ نے کیسے خبردار کیا تھا۔ فرمایا "جزیرۃ العرب اس وقت تک خراب نہ ہو گا جب تک مصر خراب نہ ہو جائے (الفتن)، عنقریب تم افواج کو پاؤ گے شام، عراق اور یمن میں (البیہقی) خبردار کرتے ہوئے فرمایا "جب شام میں فساد ہو تو تمھاری خیر نہیں (مسند احمد بن حنبل)۔ حضرت اسحٰق بن ابی یحییٰ الکعبی حضرت اوزاعی سے روایت کرتے ہیں کہ "جب پیلے جھنڈوں والے مصر میں داخل ہوں تو اہلِ شام کو زمین دوز سرنگیں کھود لینا چاہیں (السنن الواردۃ الفتن)۔ ان احادیث کو موجودہ زمانی ترتیب سے دیکھ لیں۔ عرب بہار کا آغاز سب سے پہلے مصر سے ہوا اور جیسے وہیں تحریر اسکوائر پر چار انگلیوں والے پیلے رنگ کے جھنڈے بلند ہوئے اور ادھر بشار الاسد کی فضائیہ نے نہتے عوام پر حملے شروع کر دیئے اور اب تو پوری دنیا شام کے عوام پر حملہ آور ہے جنہیں آپ ﷺ کے ارشاد کے مطابق زمین دوز سرنگیں کھود لینا چاہیں۔

یہ فساد جو اس وقت برپا ہے اس کا انجام کیا ہو گا۔ ایک تو وہ تجزیہ ہے جو سیاسی، عسکری اور عالمی تجزیہ نگار کرتے ہیں۔ یہی تجزیے آپ کو نیویارک، لندن، تہران اور ریاض کے اخباروں میں ملیں گے۔ ہر کوئی اپنے حساب سے تجزیہ کر رہا ہے۔ لیکن ایک تجزیہ وہ ہے جو رسولِ اکرم ﷺ کی احادیث کی اور پیش گوئیوں کی روشنی میں ہے، اور وہی حق ہے کہ صادق و امین پیغمبر کی زبان سے جاری ہوا ہے۔ اس سارے فساد اور لڑائی سے کسی خیر کی کوئی توقع نظر نہیں آ رہی بلکہ اس کے بطن سے شام پر ایک شخص کی حکومت قائم ہو گی" جس کا نام عبداللہ ہو گا اور وہ سفیانی کے نام سے مشہور ہو گا، اس کا خروج مغربی شام میں اندر نامی جگہ سے ہو گا" (الفتن۔ نعیم بن حماد)۔ دوسری روایت "ام المومنین امِ سلمہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ سے سنا کہ سفیانی کا خروج شام میں ہو گا، پھر وہ کوفہ کی جانب روانہ ہو گا تو مدینہ منورہ کے جانب بھی لشکر روانہ کرے گا، چنانچہ وہ لوگ وہاں لڑائی کریں گے جب تک اللہ چاہے، اور حضرت فاطمہ کی اولاد میں سے ایک پناہ لینے والا حرم شریف میں پناہ لے گا، لہٰذا وہ لشکر اسکی طرف نکلیں گے تو جب یہ لوگ مقامِ بیداء میں پہنچیں گے تو ان سب کو زمین میں دھنسا دیا جائے گا سوائے ایک شخص کے جو لوگوں کو ڈرائے گا (علل ابن ابی حاتم)۔ اس دھنسانے کے واقعہ کے بعد اس بڑی عالم گیر جنگ کا صحیح آغاز ہو گا۔ اس لئے وہ پناہ لینے والے شخص امام مہدی ہونگے جن کے بارے میں تمام مسالک متفق ہیں۔ امت اس وقت جس انتشار اور فساد میں مبتلا ہے اس کو متحد صرف انہی کی ذاتِ گرامی کرے گی۔ ان کا ہیڈ کوارٹر شام کا شہر غوطہ ہو گا۔ سفیانی کے دھنسائے جانے کے بعد جو جنگ شروع ہو گی اس بارے میں فرمایا "جب رومی جنگِ عظیم میں اہلِ شام سے جنگ کریں گے تو اللہ دو لشکروں کے ذریعے اہلِ شام کی مدد کرے گا، ایک مرتبہ ستر ہزار سے اور دوسری مرتبہ اسی ہزار اہلِ یمن سے جو اپنی بند تلواریں لٹکائے آئیں گے۔ وہ کہتے ہوں گے ہم پکے سچے اللہ کے بندے ہیں (الفتن)۔ مغرب کی طاقتوں سے یہ جنگ اعماق اور دابق کے مقام پر ہو گی۔ یہ دونوں قصبے شام کے شہر حلب سے پنتالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا "اہلِ روم اعماق اور دابق کے مقام پر پہنچیں گے۔ ان کی جانب ایک لشکر مدینہ کی طرف سے پیش قدمی کرے گا جو اس زمانے کے بہترین لوگوں میں سے ہو گا۔ جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوں گے تو رومی کہیں گے تم ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان سے ہٹ جاؤ جو ہمارے لوگ قید کر کے لائے ہیں، ہم انہی لوگوں سے جنگ کریں گے۔ مسلمان کہیں گے اللہ کی قسم ہم ہرگز تمہارے اور اپنے بھائیوں کے درمیان سے نہیں ہٹیں گے۔ اس پر تم ان سے جنگ کرو گے۔ اب ایک تہائی مسلمان بھاگ کھڑے ہوں گے، جن کی توبہ اللہ کبھی قبول نہیں کرے گا، ایک تہائی شہید کر دیے جائیں گے، باقی ایک تہائی فتح حاصل کریں گے (مسلم، ابن حب آن)۔ یہ ہے وہ میدانِ جنگ جو سیدنا امام مہدی کی سربراہی میں برپا ہو گا۔ اس وقت امتِ مسلمہ جس افتراق، انتشار، خانہ جنگی اور مسلکی بنیاد پر قتل و غارت کا شکار ہے، ہر کوئی ایک دوسرے کا گلہ کاٹنے کو حق سمجھتا ہے۔ مفادات نے مسالک میں پناہ لے لی ہے۔ ذاتی تعصب کو لوگ حق و باطل کی جنگ سمجھتے ہیں۔ مغرب سے مغلوبیت اور ان کی کاسہ لیسی کو کامیابی تصور کیا جاتا ہے۔ ایسے میں ڈیڑھ ارب مسلمان کیا کسی ایک جگہ اکٹھا ہو سکتے ہیں۔ اس کا جواب نفی میں نظر آتا ہے۔ ہاں صرف اسی وقت اکٹھا ہوں گے جب اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان کے مطابق سیدنا امام مہدی جیسی قیادت ان کے درمیان موجود ہو گی۔ حالات و واقعات اسی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں۔ اس فساد نے ظالموں کو ظالموں سے لڑا کر ختم کرنا ہے اور اس کی کوکھ سے اتحاد نے جنم لینا ہے۔ (ختم شد)

پرچم [illegible] تحفظ اردو اور افواج پاکستان

1857ء کی جنگ آزادی کو انگریز غدر یا بغاوت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ انگریز اور اس کے حواری مؤرخین نے اسے ایک ہندوستانی قوم کی مشترکہ جنگ قرار دیا اور وہی تاریخ ہم نے کئی سال اپنی نصابی کتب میں پڑھی۔ لیکن موجودہ دور کا عظیم مؤرخ ولیم ڈارل پل نے جب لاہور میں موجود آرکائیوز میں وہ خط وکتابت اور انگریز فوجی افسران کی رپورٹیں دیکھیں تو حیران رہ گیا۔ اس کی حیرت اس بات پر تھی کہ یہ جنگ آزادی تو صرف اور صرف مسلمانوں نے لڑی تھی۔ سب سے پہلے جامع مسجد دلی کے خطیب نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ اور اعلان جاری کیا تھا اور پھر اس اعلان کے بعد پورے برصغیر سے مسلمان جہاد اور شوق شہادت کی آرزو میں دلی پہنچنا شروع ہوگئے۔ ادھر پورے برصغیر میں موجود انگریز کی چھاؤنیوں سے بھی سپاہی ان جذبہ جہاد سے سرشار متوالوں کا مقابلہ کرنے کے لیے وہاں پہنچنا شروع ہوئے۔ لاہور کے آرکائیوز میں موجود ریکارڈ ان تمام بڑے بڑے چودھریوں، خانوں، نوابوں، وڈیروں یہاں تک کہ مشائخ عظام اور گدی نشین پیروں کے نام اپنے کاغذات میں چھپائے بیٹھا ہے جنہوں نے چند روپے فی سپاہی کے عوض یہاں سے انگریز کو افراد فراہم کیے جو دلی میں جاکر انگریز کی فتح ونصرت کے لیے لڑے۔ دلی فتح ہوگیا، بہادر شاہ ظفر قلعے سے بھاگ کر ہمایوں کے مقبرے میں جا چھپا۔ مجاہدین قلعے میں محصور ہونے لگے تو ایک سپاہی نے بند ہوتے ہوئے دروازے میں اپنا وجود ڈال کر کھولنے کی کوشش کی۔ اس کی گردن بیچ میں آگئی جو دو مضبوط دروازوں میں آکر نیلی ہوگئی' لیکن انگریز فوج کو مہلت مل گئی اور وہ زور لگا کر دروازہ پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہوگئے اور پھر لال قلعہ دلی پر انگریزی پرچم یونین جیک لہرا دیا گیا۔ آپ ان تمام افراد کی فہرست اٹھا کر دیکھ لیں جنہیں انگریز فوجی افسروں نے پھانسی پر لٹکایا۔ توپوں کے سامنے باندھ کر اڑا دیا گیا، آپ کو اکثریت ہی نہیں مکمل کی مکمل فہرست مسلمانوں کی ملے گی۔ ہزاروں میں سے ایک کسی دوسرے مذہب کا فرد نظر آتا ہے۔ ہندوستان تاج برطانیہ کے ماتحت آگیا تو دو کام کیے گئے۔ پہلا یہ کہ وفاداری نبھانے والوں کو انعامات اور القابات دیئے گئے۔ یہ فہرست بھی ان تمام افراد کے نام بتاتی ہے جنہوں نے O.B.E، K.B.E اور سر کے خطاب حاصل کیے۔ یہ سب کے سب اسی زمین کے بیٹے تھے اور ان میں سے اکثریت کی اولاد آج پاکستان کی سیاست کے تخت پر جلوہ گر ہے۔ جس سپاہی نے قلعے کے دروازے میں گردن دی تھی وہ فرنٹیئر فورس رجمنٹ کا تھا، اس کے اعزاز میں اس کی یونٹ کو کہا گیا کہ وہ اپنے کالروں میں نیلی پٹی لگایا کریں۔ دوسرا کام یہ کیا گیا کہ ایک انکوائری کمیشن بٹھایا گیا جو اس بات کی تحقیق کرے کہ برصغیر میں تقریباً ایک سو سال سے انگریزی فتوحات جاری ہیں۔ جہاں جہاں انگریز نے اپنی حکومت قائم کی وہاں بغاوت کا تصور تک نہ تھا۔ رعایا پر امن تھی۔ پھر یہ اچانک آگ کیسے بھڑک اٹھی۔ کمیشن کی رپورٹ تین بڑی بڑی جلدوں میں مرتب کی گئی ہے جسے "انڈیا میوٹنی رپورٹ" کہا جاتا ہے۔ اس میں بغاوت کے بہت سے اسباب بتائے گئے' لیکن چند بڑے اسباب میں ایک یہ تھا کہ انگریز افسران اور عام ہندوستانی سپاہیوں کے درمیان زبان کے فرق نے ایک ایسی خلیج قائم کر دی تھی جس سے انہیں ہمیشہ یہ احساس ہوتا رہا کہ ہم کسی غیر ملکی کے تسلط میں ہیں۔ اس کو مزید ہوا ایک غیر مذہب کے عیسائی انگریز حکمران کے تصور نے دی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سپاہیوں اور انگریز حاکموں کے بیچ میں کوئی مقامی آفیسر ایسا نہ تھا جو ان کا ہم قوم ہوتا، ان کی زبان بولتا، لیکن ہمارا وفادار ہوتا اور ہمارے لیے فوج میں ڈسپلن قائم کرتا۔ اس کے بعد دو بہت بڑے اقدام کیے گئے۔ ایک یہ کہ سول سروس اور فوج میں مقامی افسران کو بھرتی کیا جانے لگا۔ فوج میں کمیشن اور سول سروس میں امتحانات۔ دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ انگریز نے جو بھی قوانین بنائے فوراً ان کا اردو میں ترجمہ کر دیا گیا۔ اس اہم ترین ذمہ داری کو ڈپٹی نذیر احمد نے نبھایا۔ یوں ضابطۂ فوجداری، ضابطۂ دیوانی، تعزیرات ہند، قانون معاملات زمین وغیرہ تمام دفاتر میں مہیا کر دیئے گئے۔ چھوٹی سے چھوٹی عدالت میں بھی عرضی نویس کے لائسنس جاری کیے گئے جو عدالتوں کے باہر درخواستیں لکھ کر دیتے تھے جو اردو زبان میں ہوتیں۔ یہ عرضی نویس عموماً وکیلوں کے برابر قانون جانتے تھے اور وہ درخواستوں کو قانونی حوالوں سے اس طرح بہترین بناتے کہ عدالت میں بیٹھے مجسٹریٹ یا جج کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی۔ تمام سول افسران کو علاقائی زبان سیکھنے پر علیحدہ وظیفہ دیا جانے لگا اور ان کی کارکردگی میں شمار کی جانے والی صلاحیت بن گئی۔ دوسری جانب فوج چونکہ انگریزی کی حکمران فوج تھی۔ اس لیے اس کے مقامی افسران کو معاشرتی، تہذیبی اور رہن سہن کے اعتبار سے مکمل طور پر انگریز افسران کے ہم پلہ بنایا گیا۔ ان کی گھریلو زندگی سے لے کر آفیسرز میس اور کلبوں تک سب کا سب ایسا علاقائی زبان کا علم بنا دیا گیا جیسے ایڈنبرا کی چھاؤنی ہو یا سینڈ ھرسٹ کا آرمی کالج۔ یونیفارم سے لاؤنج سوٹ، گھڑ سواری کا لباس، گالف کا کھیل اور میس کے آداب' یہ سب کا سب انگریز تہذیب کی علامتیں تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انگریزی کو فوجی زبان کے طور پر مستعمل کر دیا گیا۔ غلط بولو، صحیح بولو لیکن انگریزی بولو تاکہ تم عام سویلین سے الگ نظر آؤ۔ اسی انگریزی تہذیب و ثقافت کا اثر تھا کہ پورے ہندوستان کی افواج میں مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی کا فرق مٹ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان بن رہا تھا تو مسلمان فوجی افسران کے نمائندہ وفد نے جنرل کری اپا کے ہمراہ قائداعظم سے ملاقات کی اور کہا کہ ملک تقسیم کرلو لیکن فوج تقسیم نہ کرو ورنہ تم بدامنی اور بدانتظامی کے اندھیروں میں ڈوب جاؤ گے۔ لیکن قائداعظم نے دو ٹوک جواب دیتے ہوئے کہا۔ اگر فوج تقسیم نہ کی گئی تو وہ حلف نہیں اٹھائیں گے۔ اس لیے کہ ان کو علم تھا کہ یہ ایک نظریاتی ملک ہے اور اس کی فوج بھی ایک نظریاتی فوج ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم نے اس مملکت خداداد پاکستان کی یک جہتی کی دو علامتیں بتائیں ایک کلمہ طیبہ اور دوسری اردو بحیثیت قومی زبان۔

اردو سول عدالتوں اور ڈپٹی کمشنروں کے دفاتر میں تو انگریز کے زمانے سے نافذ رہی اور ہر دفتر میں باقاعدہ ورنیکلر کے نام پر ایک علیحدہ شعبہ تھا۔ واحد ریاستی ذریعہ آمدن مالیہ و آبیانہ تھا۔ اس کا تمام ریکارڈ اردو میں تھا۔ مقامی سطح پر تمام کاروبار اردو میں ہوتا تھا۔ لیکن فوج میں انگریزی ہی کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا گیا۔ لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ملٹری اکیڈمی کے پہلے انگریز کمانڈنٹ فرانسس ایچ بی اینگل نے یہ احساس کیا کہ یہ فوج اس وقت تک ایک قومی فوج نہیں بن سکتی جب تک اسے اسلامی اصولوں پر استوار نہ کیا جائے۔ ورنہ اس میں اور بھارت کی فوج میں کوئی فرق نہ ہوگا' اس نے کہا کہ جب تک اس فوج میں ایک "روحانی جذبہ" نہ ہوگا۔ یہ قربانی کے لیے تیار نہ ہوگی۔ اس نے "قائداعظم اون" کے نام سے کیڈٹ بٹالین بنائی۔ علمائے کرام کے فتوے سے ایک موٹو ترتیب دیا جو "نصر من اللہ و فتح قریب" تھا۔ اسی نے اکیڈمی میگزین کا نام مسلم امہ کے حوالے سے "Rising Crescent" ابھرتا ہوا ہلال رکھا۔ اس نے پہلی دفعہ رمضان میں آفیسرز میس بند رکھنے کا اعلان کیا۔ وہ خود سگریٹ پیتا تھا لیکن رمضان کے دوران تمام عملے کو سگریٹ سے منع کیا گیا۔ ایک فرض شناس ماتحت کے طور پر اس نے پاکستان کی فوج کو انہی اصولوں پر منظم کرنے کی کوشش کی جس کے لیے یہ ملک بنا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم وہ بدنصیب قوم ہیں کہ جس کے رہنماؤں نے محکومیت کے احساس کمتری کو اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ سول محکموں سے اردو کی چھٹی کروا دی۔ دوسری جانب فوج میں تو انگریزی تہذیب اور زبان پلتی بڑھتی اور جواں ہوتی رہی۔ یحییٰ خان کے زمانے میں پریڈ کی آوازوں کو چپ راس وغیرہ میں تبدیل کیا گیا۔ ضیاء الحق نے کھانے کے شروع میں جنٹل مین بسم اللہ اور آخر میں جنٹل مین الحمد للہ کا آغاز کیا۔ مگر آج بھی سب جگہ انگریزی کا راج ہے۔ فوج کو اس زمین کے لیے لڑنا اور اسی کا تحفظ کرنا ہے۔ یہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بشارتوں کی امین سرزمین کی فوج ہے۔ ایک فوجی تو کسی سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں علاقائی زبان کے علم کی ڈگریاں وصول نہیں کرتا۔ سپریم کورٹ کا حکم آئین کے مطابق سب پر نافذ العمل ہے۔ آرمی چیف کا صرف ایک فرمان کہ ہم آئین کے احترام اور سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق کل سے افواج پاکستان کے جی ایچ کیو سے عام بٹالین تک اور ہر ادارے میں اردو زبان کو رائج کرتے ہیں' اس فیصلے پر صرف چند منٹ میں علمدر آمد کرا سکتا ہے۔ کیا راحیل شریف صاحب اس معاملے میں بھی عوام کا دل جیتنے کے لیے تیار ہیں۔

تعلیم کا کاروبار

گزشتہ پچیس تیس سالوں سے ہماری شہری اور قصباتی زندگی میں کاروباری ہوس نے ایسے تعلیمی اداروں کو راستہ دکھایا ہے جنہیں عرف عام میں "انگلش میڈیم سکول" کہا جاتا ہے۔ان کی بے شمار اقسام ہیں۔دنیا میں کسی بھی ملک کے نظام تعلیم کے ساتھ اتنا بھونڈا مذاق نہیں کیا گیا جسقدر بے رحمانہ طریقے سے چند سو روپے ماہانہ پر انگلش میڈیم تعلیم دینے والوں سے لے کر کئی ہزار روپے ماہانہ پر تعلیمی ادارے قائم کر کے کیا گیا۔ایک چھوٹے سے قصبے میں لوگوں کے بچوں کو جدید انگریزی تعلیم کا لالچ دینے کے لئے کیا کیا ڈھنگ اختیار کیے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے ایک عمارت' خواہ گھر ہو' کوئی گودام ہو یا تین چار دکانوں کا مجموعہ 'اسے خریدا یا کرائے پر حاصل کیا جاتا ہے۔اس میں رنگی برنگی کرسیوں' دیواروں پر چیختے چلاتے رنگ کے پلستر' ان پر مغرب سے متاثر کارٹون کے کرداروں کی تصویریں اور اگر ممکن ہو تو چند عالمی حقائق اور مناظر کی پینٹنگز لگا کر اس قابل کیا جاتا ہے کہ اس کے تنگ و تاریک کمروں' یہاں تک کہ راہداریوں اور برآمدوں میں کلاسوں کا اہتمام کیا جا سکے۔انتہائی مشکل سا انگریزی نام منتخب کیا جاتا ہے۔ایسا نام کہ جوان دیہات نما قصبے کے رہنے والوں کو اچنبھا سا لگے۔آپ ان لوگوں کی کاروباری صلاحیت کی داد ان ناموں کو دیکھ کر ہی دے دیں گے۔"لٹل سکالرز" "لٹل اینجلز"، "رائزنگ سٹار" "بیسٹ ریڈرز"،ان تمام کے آگے انگلش میڈیم سکول لکھ کر اس "عظیم" ادارے کا افتتاح ہوتا ہے۔پورے قصبے میں یا قریبی شہر سے ایسی بچیاں ڈھونڈی جاتی ہیں جنہوں نے اسی طرح کے اداروں سے واجبی تعلیم جیسے میٹرک یا ایف اے وغیرہ کیا ہوتا ہے۔انہیں معمولی تنخواہ پر ملازم رکھا جاتا ہے۔ان میں اکثر کی تنخواہ پاکستان میں ایک عام مزدور کی تنخواہ سے بھی کم ہوتی ہے۔خواتین یا لڑکیوں کے انتخاب کی کئی وجوہات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی وجہ سے سکول ان فرسودہ اور دقیانوسی اردو میڈیم تعلیمی اداروں سے مختلف نظر آتا ہے جہاں استاد، جنہیں عرف عام میں ماسٹر کہا جاتا ہے، پڑھاتے ہیں۔ان سکولوں میں پڑھانے کے لئے سیلی بس نام کی کسی چڑیا کا کوئی وجود نہیں۔ادھر ادھر کے سکولوں میں' اور جہاں کہیں جو نرسری' پرائمری اور پھر میٹرک کی انگلش میڈیم کتابیں میسر آتی ہیں انہیں سکول کا نصاب بنا دیا جاتا ہے۔اکثر ایسی کتابوں کو مالکان خود خریدتے ہیں اور انہیں بچوں کے والدین کو مہنگی قیمت پر فروخت کر کے منافع کمایا جاتا ہے۔سکولوں کے نظام تعلیم کو اس دیہی قصباتی ماحول سے الگ تھلگ دکھانے کے لئے عجیب و غریب بھونڈے طریقے اپنائے جاتے ہیں۔آپ ان کی کلاسوں میں جائیں' ایک بیچاری معمولی تعلیم یافتہ استاد فوراً بچوں سے کہے گی' بچو! گڈ مارننگ بولو! اور پوری کلاس لہک لہک کر گڈ مارننگ کہے گی۔ بعض اوقات ایسی مضحکہ خیز صورت حال بھی پیش آتی ہے کہ دن کے ایک بجے بھی یہ بچے اسی رٹے رٹائے گڈ مارننگ کو ادا کر رہے ہوتے ہیں۔اس کے بعد بچوں کو وہ نرسری نظمیں یاد کروائی جاتی ہیں جنہیں بڑے بڑے انگلش میڈیم سکولوں میں سکھایا جاتا ہے۔ان نظموں کو نہ وہاں کے بچے سمجھ پاتے ہیں اور نہ ہی ان کے والدین۔آپ لوگوں نے ایک نظم "ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل سٹار" عموماً بچوں کی زبانی سنی ہو گی۔ان کو چند مخصوص اشارے سکھائے جاتے ہیں کہ ٹوئنکل کہتے ہوئے کیسے انگلیوں کو کھولنا اور بند کرنا ہے' سٹار یا "سکائی" کہتے اوپر ہاتھ کرنا ہے وغیرہ وغیرہ آپ ان بچوں کو کھڑے کر کے پوچھیں کہ ٹوئنکل کا کیا مطلب' سکائی کے کیا معنے یا سٹار اور ڈائمنڈ کیا چیز ہیں تو انہیں بالکل اس کا ادراک تک نہ ہو گا۔لیکن ان بچوں کو یہ سب رٹایا جا رہا ہوتا ہے تا کہ معلوم ہو کہ یہ سکول گجومتہ' جھٹو' کھڈ کوچہ یا میر علی کے قصبوں میں نہیں بلکہ برمنگھم اور گلاسگو کے نواح میں کھلا ہوا ہے۔اس بدترین اور بھونڈے طریقے سے یہ ہزاروں چھوٹے چھوٹے سکول بچوں کو نام نہاد "انگلش میڈیم" تعلیم دے رہے ہوتے ہیں۔بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ان قصبوں کے والدین غریب ہوتے ہیں' اپنا پیٹ کاٹ کر ان بچوں کی فیسیں ادا کرتے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ان کا بچہ بھی ویسی ہی تعلیم حاصل کر رہا ہے جیسی لاہور' کراچی اور اسلام آباد میں چالیس پچاس ہزار روپے ماہانہ دے کر اشرافیہ کے بچے حاصل کرتے ہیں۔

یہ اشرافیہ کے بچے کیسی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔اس کا حال بھی قابل رحم ہے۔دنیا میں اولیول' اے لیول یا کیمبرج کا تعلیمی نظام دیگر نظام ہائے تعلیم کے مقابلے میں ایک کمتر نظام سمجھا جاتا ہے۔اس کی ترجیح یعنی ریٹنگ جرمنی اور دیگر ممالک کے نظاموں سے بہت کم ہے لیکن "ہم" نے اس کو اختیار کیا ہے،اس "ہم" سے مراد یہ ملک یا اسی کی حکومت نہیں بلکہ ان کاروباری تعلیمی اداروں کے مالکان ہیں جنہوں نے اس سے وابستہ ہو کر اپنے کاروبار کو چار چاند لگائے۔پورے ملک کے طول و عرض میں لوگوں کی جیبیں کاٹ کر تعلیمی ادارے بنائے اور ان میں سہانے خواب دکھا کر بچوں کو داخل کروایا گیا۔ہزاروں روپے ماہانہ فیس دے کر یہ بچے اولیول اور اے لیول کر کے جب پیشہ وارانہ تعلیم کے میدان کے لئے میڈیکل کالجوں یا انجینئرنگ یونیورسٹیوں میں داخلے کے لئے نکلے تو جب ان کے سرٹیفکیٹوں کو میٹرک اور ایف ایس سی کے برابر تولا گیا تو وزن کرنے والی مشین یعنی بورڈ کمیٹی نے کم قرار دے دیا۔اولیول میں 80 فیصد نمبر لینے والا یہاں 60 فیصد پر آگیا۔اب ایک اور کاروباری طبقہ وجود میں آگیا۔یہ تھا پرائیویٹ میڈیکل کالج' انجینئرنگ کالج اور یونیورسٹیاں۔ہر بڑے چھوٹے شہر میں ان طلبہ کے لئے یہ تعلیمی ادارے کھولے جانے لگے۔یہ صرف اور صرف وہ مضامین پڑھاتے تھے جن کی مارکیٹ میں زیادہ سے زیادہ کھپت ہو۔نوے کی دہائی میں کمپیوٹر کا جنون چڑھا تو ہر گلی محلے میں ایک کمپیوٹر کالج کھل گیا۔کاروباری اداروں نے اپنی ضرورت کے لئے ملک میں ایک دو بزنس ایجوکیشن کے سکول کھلوا دیے۔ایک پرائیویٹ میڈیکل کالج کی اجازت ملی تو پھر یار لوگوں کو بھی کمائی کا لالچ آیا۔ہسپتال ہو نہ ہو' مریض میسر ہو نہ ہو' لیبارٹری یا لائبریری کی سہولت کے بغیر میڈیکل کالج کھلے اور بے تحاشہ کھلے۔دوسری جانب کچھ طلبہ ایسے بھی تھے جن کے والدین سرمایہ خرچ کر سکتے تھے' قرض لے سکتے تھے' گھر یا گاڑی بیچ سکتے تھے' انہیں جب معلوم ہوا کہ اولیول اور اے لیول کرنے کے بعد ان کے بچے کا اس پاکستان کے تعلیمی اداروں میں کوئی مستقبل نہیں یا ان کا بچہ یہاں کے ماحول' اور یہاں کے اداروں پر عدم اعتماد کر چکا ہے تو انہوں نے اپنے بچوں کو انگلستان' یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بصد مشکل اور بہت سا بوجھ اٹھا کر بھیجنا شروع کر دیا۔یہاں ایسے بچے جو قابل تھے ان کو انہی ملکوں نے اپنے ہاں ملازمتیں دے کر رکھ لیا اور ان بچوں کو وہ ماحول ذرا بھی اجنبی اس لئے محسوس نہ ہوا کہ انہوں نے بچپن ہی سے نرسری نظموں کے ذریعے اپنے ذہنوں میں اس ماحول کے خواب بسائے ہوئے تھے۔وہ لوگ جو انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کا ذکر کرتے ہوئے ایک بات کا بہت واویلا کرتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم انگریزی کے علاوہ دی ہی نہیں جا سکتی۔ان کی حیرت کے لئے کیا یہ حقیقت ہی کافی ہے کہ یہ انگلش میڈیم بچے جب جرمنی' ناروے' سویڈن' چین اور جاپان کی یونیورسٹیوں میں گئے تو انہوں نے پہلے ان کی زبان سیکھی اور پھر وہاں انہی کی زبان میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ لیکن تعلیم کو کاروبار بلکہ بدترین اور مکروہ کاروبار بنانے والے کبھی بھی اس بات پر راضی نہ ہوں گے کہ انگریزی ذریعہ تعلیم کی جگہ اردو میں تعلیم دی جائے۔اس لئے کہ اسی انگریزی نام پر تو وہ لوگوں کی جیبوں سے پیسے لوٹتے ہیں ورنہ نہ ان کے سکولوں کی عمارتیں اردو میڈیم اچھے سکولوں سے بہتر ہیں' نہ ان کے استاد اور نہ ہی لیبارٹری و لائبریری اور کھیل کے میدان۔ لیکن چونکہ ان تمام کاروباری تعلیمی اداروں کے سرپرست سیاستدان ہیں' ان کے خیر خواہ بیوروکریٹ ہیں اس لئے دانستہ عدم توجہی کی وجہ سے بڑے بڑے سرکاری تعلیمی ادارے زوال کا شکار ہیں' بے توجہی کی تصویر ہیں اور والدین ان کاروباری دکانوں پر بچے بھیجنے کے لئے مجبور۔

اردو ہے جس کا نام

پرویز مشرف کے بعد جنم لینے والی اسمبلیوں‘ نوزائیدہ جمہوری نظام اور ارباب سیاست سے اگر آپ یہ سوال کریں کہ ان سات آٹھ سالوں میں ایسا کونسا کارنامہ سرانجام دیا ہے جس پر آپ کا نام تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے تو تمام سیاسی پارٹیوں کے اراکین اتفاق رائے سے یک زبان ہو کر کہیں گے کہ اٹھارویں ترمیم...... ہم نے گزشتہ ساٹھ ستر سالوں کی صوبائی خود مختاری کی جدوجہد کا ثمر لوگوں کی جھولی میں ڈال دیا۔ اب صوبے آزاد اور خود مختار ہیں‘ اپنا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم خود بنائیں‘ اپنے ہسپتال خود چلائیں‘ اپنی معدنیات خود نکالیں۔ مرکز تو ایک وحدت کی علامت ہی رہے گا‘ در حقیقت یہ پاکستان اور اس کی سرحدیں اہم سچائی اور زمینی حقائق نہیں بلکہ زمینی حقیقتیں تو پنجاب‘ سندھ‘ بلوچستان اور خیبر پختونخوا ہیں۔ ان کی سرحدیں مقدس اور محترم ہیں۔ ان سرحدوں پر کھڑے ہو کر کوئی سیاسی لیڈر گرجتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر تم لوگوں نے ہماری یہ بات نہ مانی تو پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا‘ اس ملک کا مستقبل مخدوش نظر آنے لگے گا۔ لیکن اسی سرحد کے اندر کوئی شخص اگر یہ سوال اٹھائے کہ یہ پنجاب‘ سرحد‘ بلوچستان اور خیبر پختونخوا کی سرحدیں کوئی آسمانی صحیفے نہیں بلکہ یہ لکیریں تو انگریزی سامراج نے کھینچی تھیں اور اب ان صوبوں میں موجود اقلیتوں کو بھی اپنے الگ صوبے چاہئیں تو کوئی یہ نہیں کہتا کہ اب صوبے کا وجود خطرے میں پڑ جائیگا بلکہ نعرہ یہ بلند ہوتا ہے کہ ہم اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے لیکن سندھ‘ پنجاب‘ بلوچستان اور خیبر پختونخوا کو تقسیم نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن پاکستان کے حوالے سے خون کا آخری قطرہ بہانے کا ذکر آپ کو بس چودہ اگست یا 23 مارچ کی تقریبات میں کہیں مل جائے۔

لسانی‘ صوبائی اور علاقائی عصبیت وہ ہتھیار ہے جس سے غریب آدمی کو دوسرے گروہ کا خوف دلا کر‘ اس کے خلاف نفرت ابھار کر سیاسی رہنما انہیں اپنے پیچھے لگاتے ہیں اور وہ بھیڑ بکریوں کی طرح سہمے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں کہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ملکی تناظر میں بلوچ‘ سندھی اور پختون کو پنجابی کھا جائیں گے‘ صوبائی سطح پر سندھی کو اردو بولنے والے اور اردو بولنے والوں کی سندھی‘ پختون کو ہزارہ اور ہزارہ کو پختون ’کھا جائیں گے۔ خوف کے مارے یہ غریب عوام ان چالاک سیاسی رہنماؤں کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ میں نے چالاک کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ یہ تمام سیاسی رہنما‘ لسانی ہوں یا علاقائی‘ قومی ہوں یا صوبائی ان سب کی ذاتی زندگیوں کا ان تمام نعروں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ ان کے حواریوں اور اس ملک کے حکمران طبقوں کا بھی لسانیت اور علاقائیت سے دور کا واسطہ تک نہیں ہوتا۔ انہوں نے اپنے لیے ایسا نظام وضع کر لیا ہے کہ اٹھارویں کیا ایک سو اٹھارویں ترمیم بھی آجائے اور صوبے خود مختار حکومتیں کیوں نہ بن جائیں ان کی زندگیوں پر ان کا کوئی اثر تک نہ ہوگا۔ رونا پیٹنا صرف اور صرف غریب عوام کا مقدر بن جائے گا۔

اٹھارویں ترمیم کے بلند بانگ نعروں کی گونج میں صوبوں کو تعلیمی نظام وضع کرنے کی آزادی میسر آئی ہے۔ لیکن اسمبلی کے ارکان‘ ان کے امیر عزیز و اقارب‘ بیوروکریٹ‘ جرنیل‘ کرنیل سے کپتان تک اور سپریم کورٹ کے ججوں سے لے کر سول ججوں تک سب کے بچے ایسے سکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں جن پر اٹھارویں کیا ایک سو اٹھارویں ترمیم کا بھی کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے کوئی سبی یا خضدار میں ہو تو اس کے او یا اے لیول کی جانب لے جانے والے سی لیبس والے سکول میسر ہیں۔ اس کے بعد وہ گلگت بلتستان چلا جائے یا میرپور خاص اس کو وہاں کے سکول میں نہ کورس فرق ملے گا اور نہ ہی نظام تعلیم۔ اس لئے کہ صوبائی خود مختاری کا نعرہ تو غریب آدمی کے لئے ہے۔ دشمنی نہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے تحت لیے جانے والے او لیول اور اے لیول سے ہے اور نہ ہی انگریزی ذریعہ تعلیم سے۔ ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تو وہ قومی زبان اردو ہے۔ اس قومی زبان اردو سے اسقدر دشمنی کیوں ہے۔ یہ سوال اس قدر مضحکہ خیز بن جاتا ہے جب اردو کے خلاف بولنے والے تقریریں بھی اردو میں کر رہے ہوتے ہیں۔ زبانیں اپنی ضروریات اور لوگوں کے درمیان خود بخود بننے والے رابطے سے ترقی کرتی ہیں۔ انہیں کبھی کوئی نافذ نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو برصغیر جہاں ہر فرد کو اتالیق فارسی ضرور پڑھاتا تھا‘ وہاں کی زبان فارسی ضرور ہو جاتی۔ لیکن سوچنے کی بات ہے کہ انتہائی جنوب میں چنائی‘ مشرق میں کلکتہ‘ شمال میں سارناتھ اور مغرب میں کوئٹہ تک پھیلے ہوئے برصغیر پاک و ہند اگر آپس میں کوئی ایک زبان لوگ رابطے اور سمجھ بوجھ کیلئے آج بھی استعمال کر رہے ہیں تو وہ اردو ہے جسے لاکھ ہندی کہا جائے‘ اس کی اصل اردو ہی ہے۔ پاکستان میں اٹک کا پل عبور کر کے آنے والے پشتون‘ رحیم یار خان کے بازار میں آنے والے سندھی‘ مکران سے کراچی آنے والے بلوچ اور شہروں شہروں گھومنے والے پنجابی کو اگر کوئی زبان بولنا آتی ہے تو وہ اردو ہے۔

ایک اور حیران کن بات یہ کہ وہ ممی ڈیڈی برگر کلاس جسے بچپن ہی سے نرسری گیتوں کی انگریزی لوریاں ملی ہوتی ہیں وہ بھی آپس میں اپنی ایک خود ساختہ اردو میں گفتگو کرتی ہے جو اب ان کی پہچان بن چکی ہے۔ مدتوں انگریزی ذریعہ تعلیم میں پڑھنے کے باوجود وہ آج تک انگریزی کو ذریعہ اظہار نہیں بنا سکے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کا تصور بھی انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی سے لے کر او لیول یا اے لیول تک کہیں بھی آپ کو استاد انگریزی زبان میں پڑھاتے یا تشریح کرتے نظر نہیں آئیں گے۔ انہیں بات کو واضح کرنے‘ ذہن نشین کرانے اور بہترین ابلاغ کے لئے اردو استعمال کرنا پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ انگریزی شاعری اور ڈرامے میں موجود اصطلاحات کی گرہیں بھی اردو میں کھولی جاتی ہیں اور یہ کام برسوں سے انگریزی لٹریچر کی کلاسوں میں جاری ہے کہ شیکسپیئر کے ڈرامے اور کیٹس کی شاعری کا ابلاغ ایسے ہی ممکن ہے۔ سائنس کی اصطلاحات کو چھوڑ کر اور میڈیسن کے وہ الفاظ جو بیماریوں کے ناموں اور دواؤں وغیرہ سے متعلق ہیں یا پھر قانون میں مروجہ اصطلاحات کو جوں کا توں بولا جاتا ہے باقی ان سب کی تشریح کلاسوں میں اردو زبان میں کی جاتی ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ سائنس میڈیسن اور قانون کی یہ تمام اصطلاحات بذات خود انگریزی نہیں بلکہ لاطینی اور فرانسیسی ہیں۔ انگریز نے بھی اصطلاحات لے کر ان کی اپنی زبان میں تشریح کی اور ہم بھی وہی کرتے ہیں‘ لیکن امتحان دینے اور کتابیں لکھنے کیلئے ہم نے انگریزی کو منتخب کیا ہے۔ کتابیں تو ہم لکھ ہی نہیں رہے بلکہ انگریزی کی برآمد کر رہے ہیں اس لئے ہمیں مجبوراً امتحان لینے کی زبان بھی انگریزی رکھنا پڑتی ہے۔ یہ زبان کا مسئلہ نہیں بلکہ ہماری کام چوری ہے‘ ورنہ کتاب استاد کے ہاتھ میں انگریزی میں ہوتی ہے اور اسے سمجھانے کیلئے اسے اردو کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

لیکن سب سے زیادہ منافقت اور دوغلا پن ہماری انتظامیہ اور عدالتی نظام میں ہے۔ ہمارے سامنے روزانہ لاکھوں سائل آتے ہیں۔ اپنا دکھڑا اپنی زبان میں روتے ہیں یا پھر کوئی مسئلہ ہو تو اردو میں بیان کرتے ہیں۔ لیکن پاکستان کا انتظامی عہدہ پر بیٹھا انگریز کا غلام سول سروس کا آفیسر اسے حکم نامہ انگریزی میں تھماتا ہے۔ یہی حال چھوٹی سی چھوٹی عدالت کا ہے۔ سائل اپنی زبان میں گفتگو کر رہے ہوتے ہیں‘ وکیلوں کو چار فقرے روانی سے انگریزی میں بولنے نہیں آتے لیکن درخواست بھی انگریزی میں لکھتے اور جج فیصلہ بھی انگریزی میں تحریر کرتا ہے۔ یہ ہے اس قوم کی سب سے بڑی منافقت۔ ہم کس پر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں انگریزی لکھنا پڑھنا آتی ہے۔ یقیناً ان بے بس اور مجبور اٹھارہ کروڑ عوام پر۔ مجھے کس قدر حیرت ہوئی جب وفاق نے سپریم کورٹ میں یہ جواب جمع کروایا کہ اب صدر اور وزیراعظم اردو میں تقریر کریں گے۔ اس سے عوام کا بھلا نہیں ہوگا۔ بھلا اس سے ہوگا جب آپ صرف ایک سطر کا یہ آرڈر کریں گے کہ اگلے لمحے دفتروں میں اردو مستعمل ہو گی۔ پاکستان میں بیوروکریسی کی ننانوے فیصد میٹنگ اردو میں ہوتی ہیں لیکن کارروائی انگریزی میں تحریر کی جاتی ہے۔ جس سول سروس کے آفیسر نے ساری زندگی دفتر میں اردو‘ پنجابی‘ سندھی‘ بلوچی اور پشتو بولنی ہے اس کا امتحان انگریزی میں کیوں لیا جاتا ہے۔ صرف ایک فیصلہ کہ سول سروس کا مقابلے کا امتحان اردو میں ہوگا۔ پھر دیکھئے اس ملک کے پبلشرز صرف پندرہ دن میں تمام مواد اردو زبان میں مارکیٹ میں لے آئیں گے اور تمام اشرافیہ اپنے بچوں کو اردو کی لوریاں دینے لگے گی کہ یہی حکمرانی کا راستہ ہوگا۔

اردو کے مخالفین کا المیہ

سپریم کورٹ کے اردو کے نفاذ کے فیصلے کے بعد اس مملکت خداداد پاکستان کے اٹھارہ کروڑ عوام پر صرف اور صرف انگریزی زبان کی وجہ سے حکمرانی کرنے والے چند ہزار افراد کی منطقیں اور لن ترانیاں دیکھنے والی ہیں۔ان میں سب سے سر خیل وہ گروہ ہے جسے بیوروکریسی کہا جاتا ہے اور جس گروہ کے درمیان میں نے تیس سال سے بھی زیادہ عرصہ گزارا ہے۔ دوسرا گروہ ان چند ادیبوں، شاعروں، کالم نگاروں، دانشوروں اور تجزیہ نگاروں کا ہے جنہیں اردو سے اس لئے بغض ہے کہ یہ واحد کڑی ہے جو پاکستان کے عوام کو گوادر سے لے کر گلگت تک ایک لڑی میں پروتی ہے۔ میری زندگی کے گزشتہ چالیس سال ان کے درمیان بھی گزرے ہیں۔ تیسرا گروہ ہے جسے ہمارے شہروں میں کاروباری تعلیمی اداروں نے جنم دیا ہے۔ گزشتہ تیس سالوں سے انگلش میڈیم کا ایک خمار اس ملک کے کاروباری طبقہ کے دماغ میں پیدا ہوا اور انہوں نے گلی گلی سکول کھول کر سرمایہ کمانے کی مشینیں لگا دیں۔ ان سے ایک ایسی نسل نے جنم لیا جسے نہ تو ڈھنگ کی انگریزی آئی اور نہ ہی وہ اردو سے شناسا ہو سکے۔ سارا دن گھروں، بازاروں، محلوں اور علاقوں میں اردو بولتے اور چند گھنٹے سب مضامین انگریزی میں پڑھتے۔ میں نے پڑھنے کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ پاکستان میں تمام ایسے ادارے جن کا انگریزی ذریعہ تعلیم بتایا جاتا ہے، وہاں بات سمجھانے، کسی مضمون کی اصل کو تفصیل سے بتانے کے لئے اردو بلکہ بعض دفعہ علاقائی زبان استعمال کی جاتی ہے۔ یہ تمام طلبہ اساتذہ سے مضمون اردو میں پڑھتے ہیں لیکن امتحان انگریزی میں دینے پر مجبور ہیں۔ یہ وہ فریب خوردہ شاہین ہیں جنہیں زبردستی اس راستے پر ڈالا گیا اور آج وہ اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ اگر کہیں اردو اس ملک میں رائج ہو گئی تو وہ کہیں کے نہیں رہیں گے۔ ایسے طلبہ کی تعداد چند لاکھ سے بھی کم ہے۔

لارڈ کارنیوالس کی 1773ء میں جنم لینے والی بیوروکریسی کا المیہ یہ ہے کہ وہ اور ان کے "اسلاف" نے اس زبان کو اس لئے اختیار کیا تھا کہ یہ ان کے حاکموں کی زبان تھی اور اس کے ذریعے وہ حکمرانوں کے منظورِ نظر بھی بنتے تھے اور ساتھ ساتھ عوام سے الگ تھلگ بھی نظر آتے تھے۔ ان لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان پر کون مسلط ہے۔ جو مسلط ہے وہی ان کا آقا ہے، اسی کی زبان یہ بولتے ہیں، اسی کا ملبوس زیب تن کرتے ہیں اور اسی کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ انگریز سے پہلے فارسی دربار کی زبان تھی تو یہ طبقہ فارسی بولتا، اسی تہذیب کو اوڑھنا بچھونا بنانا اپنا فخر سمجھتا تھا۔ کون تھا جس نے اپنی زبان میں فرامین جاری کئے ہوں۔ ان شاہ پرست اور غلام صفت لوگوں کو راہِ راست پر لانا کوئی مسئلہ نہیں۔ ضیاء الحق کے لئے نماز کی پابندی کرنے، اور مشرف کے لئے عیش و عشرت کی محفلیں سجانے والے یہ بیوروکریٹ صرف ایک حکم نامے کے محتاج ہیں۔ آپ نے حکم جاری کیا تو ان میزوں پر آج کل جو انگریزی ڈکشنریاں اور تھیزیرس رکھے ہوتے ہیں، حکم نامے کے ساتھ ہی ان کی جگہ اردو لغت آ جائے گی۔ اپنے کمال تجربے کے باوجود یہ انگریزی بھی بدترین حد تک بری لکھتے ہیں جس کا ہر انگریزی جاننے والا مذاق اڑاتا ہے اور اردو بھی کوئی اتنی اچھی نہیں لکھیں گے لیکن کم از کم اردو میں لکھنے سے ان کے حکم نامے اس زبان میں ضرور آ جائیں گے جسے عام آدمی پڑھ کر سمجھ سکے۔ ڈیڑھ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ انہوں نے ایک منافقانہ طرز کا دفتری نظام چلایا ہے۔ وزیرِ اعظم سے لے کر اسسٹنٹ کمشنر تک تمام گفتگو، میٹنگ، بریفنگ وغیرہ اردو میں ہوتی ہے۔ سائل سے اردو یا اس کی علاقائی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن منافقت دیکھیں کہ میٹنگ کے "منٹس" یعنی کاروائی انگریزی ہی میں لکھتے ہیں۔ اور سائل کو فیصلہ انگریزی میں تھماتے ہیں۔ اسی بیوروکریسی کے ہم پلہ ہمارا عدالتی نظام ہے۔ تمام کاروائی سپریم کورٹ سے لے کر سول جج تک اردو یا علاقائی زبان میں ہو رہی ہوتی ہے۔ لیکن مسل پر بیان تک انگریزی میں ترجمہ کر کے ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ فیصلے انگریزی میں تحریر ہوتے ہیں، PLD انگریزی میں مرتب ہوتا ہے۔ وکیل بحث اردو ہی میں کرتا ہے اور حوالہ انگریزی میں پیش کرتا ہے کیونکہ منافقانہ طرزِ عمل یہ ہے کہ ہم اس زبان میں فیصلے تحریر نہیں کرتے جو عدالت میں بولی جا رہی ہوتی ہے۔

شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور تجزیہ نگاروں کی لن ترانیاں عجیب ہیں۔ یہ اردو کہاں سے آ گئی، یہ تو صرف چند لوگوں یعنی 9 فیصد لوگوں کی مادری زبان ہے۔ علاقائی زبانوں اور مادری زبانوں میں تعلیم ہونی چاہیے۔ لیکن آپ ان لوگوں کا اپنا طرزِ عمل دیکھیں۔ پیدا ملتان میں ہوتے ہیں، مادری زبان سرائیکی، کالم اردو میں لکھتے ہیں، بلکہ پروگرام بھی اردو میں کرتے ہیں۔ پیدا پشاور میں ہوئے ہیں مادری زبان پشتو، لیکن اردو کے لازوال شاعر، پیدا تربت میں ہوئے، مادری زبان بلوچی، اردو کے قابلِ فخر شاعر۔ پنجاب کے تو ہر قصبے اور قریے میں یہ ہی معمول ہے کہ کوئی مادری زبان میں لکھنا پسند ہی نہیں کرتا۔ فیض احمد فیضؔ سے مجید امجد اور سعادت حسن منٹو سے راجندر سنگھ بیدی تک، سندھ سے تلوک چند محروم، بلوچستان سے گوپی چند نارنگ، عطا شاد، سرحد سے احمد فراز۔ ان سے کہو پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی میں کیوں نہیں لکھتے، تو بڑے وثوق سے کہیں گے کہ علاقائی زبان کے سننے اور پڑھنے والے کم ہیں۔ بڑے بڑے شعرا اور ادیبوں کی اکثریت سے میں ملا ہوں، جن میں فیض احمد فیض سے احمد فراز تک اور منیر نیازی سے عطا شاد تک شامل ہیں، سب یہی کہتے ہیں کہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو طبیعت اردو میں ہی رواں ہوتی ہے۔ دانشوروں کا حال یہ ہے کہ وہ انگریزی کی وکالت میں قلم توڑ دیتے ہیں لیکن اس انگریزی کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ دو انگریزی چینل چلانے کی جسارت کی گئی مگر عدم مقبولیت کی وجہ سے بند کرنا پڑے۔ ان سارے علاقائی زبانوں کے حامیوں اور اس کا نعرہ بلند کرنے والوں سے کہو کہ تم نے آج تک اپنی زبان میں کیا لکھا، کتنے پروگرام کئے، کتنی کتابیں لکھیں تو ان کا منہ لٹک جاتا ہے۔ لیکن ہر کسی نے اردو میں کتاب، کالم، مضمون لکھا بھی ہوتا ہے اور بار بار تقریر بھی کی ہوتی ہے اور ٹاک شو میں علم کے جوہر بھی دکھائے ہوتے ہیں۔ ان کا المیہ یہ ہے کہ یہ کسی ایسی زبان کو پاکستان میں رائج ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے جس سے اس ملک میں یک جہتی کی فضا نظر آئے، جو پاکستان کو بحیثیت قوم زندہ کر سکے۔

رہا نظامِ تعلیم کا مسئلہ تو یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اور تاریخ نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی ہے کہ دنیا میں ایک قوم بھی ایسی نہیں جس نے کسی دوسرے کی زبان میں علم حاصل کیا ہو اور ترقی کی ہو۔ ناروے، سویڈن، ڈنمارک، فن لینڈ اور آئس لینڈ جیسے ملک جن کی آبادیاں چند لاکھ لوگوں پر مشتمل ہیں وہ بھی انگریزی نہیں بلکہ قومی زبان میں تعلیم دلواتے ہیں بلکہ پی ایچ ڈی تک اسی زبان میں کرواتے ہیں۔ چین، جرمنی، جاپان کی تو مثال ہی اور ہے کہ ان کی آبادی بہت بڑی ہے۔ یہ انگریزی میڈیم ہمارے ہاں چند دہائیوں کا مسئلہ ہے۔ یہ بھی اس مقصد کیلئے نافذ کیا گیا کہ ایک ایسی نسل پیدا کی جائے جو بچپن ہی سے ایسے خواب دیکھے جیسے یورپ کا بچہ دیکھتا ہے۔ اسکے ذہن میں ہیر، سسی اور سوہنی کی جگہ سنڈریلا آباد ہو، تاکہ وہ اگر ایک دن یہاں سے پڑھ لکھ جائے تو خدمت کرنے کے لئے یورپ کا انتخاب کرے اور وہ مغرب کے کسی بھی ملک میں جائے تو وہ اسے اجنبی محسوس نہ ہو۔ یہ کسی بھی ملک کی معیشت کے ساتھ بڑا ظلم ہوتا ہے۔ ایسے طلبہ کی تعداد چند لاکھ سے بھی کم ہے۔ سپریم کورٹ پاکستان کے فیصلے کے ساتھ ایک تازہ فیصلہ الہ آبادہائی کورٹ بھارت کا بھی پڑھ لینا چاہیے۔ الہ بادہائی کورٹ نے حکم دیا ہے کہ تمام سرکاری ملازم اور سیاسی رہنما اپنے بچوں کو سرکاری سکول میں پڑھائیں۔ جس دن وزیرِ اعظم، وزیرِ اعلیٰ، چیف سیکرٹری، آئی جی، کور کمانڈر اور سیکرٹری تعلیم کے بچے، پوتے، پوتیاں، نواسے نواسیاں، سرکاری سکولوں میں داخل ہو گئے ان سکولوں کا معیار پاکستان کے کسی بھی انگلش میڈیم سے بلند ہو جائے گا۔ رہا بیوروکریسی کا معاملہ تو آج سول سروس کا امتحان اردو میں لینے کا فیصلہ ہو جائے، دس دن کے اندر اس کی تمام کتابیں اردو زبان میں مارکیٹ میں آ جائیں گی۔ ہر بڑے خاندان کا بچہ کسی ایسے سکول میں داخل ہونے کے لئے تڑپے گا جہاں اردو ذریعہ تعلیم ہو کیونکہ اس نے اردو میں امتحان دے کر آفیسر بننا ہو گا۔ رہا شاعروں، دانشوروں، ادیبوں اور تجزیہ نگاروں کا مسئلہ تو وہ پنجابی، سرائیکی، سندھی، بلوچی، پشتو کے حق میں اردو میں گفتگو کرتے رہیں گے، اردو میں کالم بھی لکھیں گے، شاعری، افسانہ نگاری بھی کریں گے، ٹی وی میں اینکری بھی اردو میں کریں گے اور اپنی مادری زبان کے لئے آنسو بھی بہاتے رہیں گے۔

وہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

کیا اس طرح بے بسی کی موت مرنے والے بچے کی یہ پہلی تصویر ہے جو پوری انسانیت کے منہ پر طمانچے کی طرح ثبت ہوئی ہے۔ نہیں اس جدید تہذیب کے منہ پر ایسے ہزاروں بلکہ لاکھوں طمانچے ایسے ہیں جو اپنی انگلیوں کے نشان تک چھوڑ کر گئے ہیں۔ جدید تہذیب جس کی سب سے بڑی پہچان جدید سیکولر قومی ریاستیں اور ان کی سرحدیں ہیں۔ وہ سرحدیں جن میں کسی دوسرے انسان کا گھسنا حرام ہے۔ سرحد کے بانکے پہریدار بندوقوں سے مسلح وہاں موجود ہوتے ہیں۔ آپ کو کسی دوسرے ملک میں یا تو پناہ کی بھیک مل سکتی ہے یا پھر اگر انہیں آپ کے کام کی ضرورت ہو تو مزدوری۔ آپ کے پاس سرمایہ ہے تو آپ کا استقبال بھی کیا جاتا اور آپ کو عزت و توقیر بھی ملتی ہے۔ آپ کے لئے یہ تمام سرحدیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ آسٹریلیا سے لے کر امریکہ تک آپ اپنا کاروبار چمکا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ سمندروں میں غرق ہو جائیں' صحراؤں میں جان دے دیں' رستے میں ڈاکو آپ کو لوٹ لیں' آپ کی عورتیں اغوا کر کے دنیا کے بازاروں میں بیچی جائیں' بچے پیاس سے تڑپ کر جان دے دیں۔ کوئی آپ کے لئے اپنی سرحدوں کے دروازے نہیں کھولے گا۔ یہ جدید سیکولر قومی ریاستوں کا "خوبصورت" چہرہ ہے جو 1920ء میں لیگ آف نیشنز میں پاسپورٹ کے ڈیزائن منظور ہونے کے بعد تحریر کیا گیا۔ جس کے بعد میں 1924ء میں ویزا ریگولیشنز آئے' بارڈر سکیورٹی فورسز قائم ہوئیں اور پوری دنیا کو ایک بہت بڑے چڑیا گھر میں تبدیل کر دیا گیا۔ خاردار تاروں کے پنجروں کے پیچھے کوئی ترک تھا تو کوئی عرب' کوئی ہسپانوی تھا تو کوئی ایرانی۔ بانکے پہریدار کسی کو اپنے پنجرے میں گھسنے کی اجازت نہیں دیتے' خواہ ایک جانب غلے کے گوداموں میں کائی لگنے سے ضائع ہو جائے اور دوسری جانب روزانہ قحط سے لوگ مر رہے ہوں۔ جدید قومی سیکولر ریاستوں غلہ کی سرحدوں کا تحفظ مفلوک الحال انسانوں کی جانوں سے زیادہ مقدس اور محترم ہے۔

یہ ساحل تھا اور یہی ترکی کا شہر قسطنطنیہ جب یہ مسلم امہ سرحدوں اور جدید سیکولر قومی ریاستوں میں تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ کوئی عربی' ایرانی' مصری' شامی اور لبنانی نہیں تھا۔ خلافت عثمانیہ کے تخت پر بایزید دوم متمکن تھا۔ اس دوران 1492ء میں سپین پر ازبیلا اور فرڈی نینڈ نے قبضہ کر لیا اور کیتھولک چرچ نے ایک ٹرائیبونل قائم کیا جس کا مقصد غیر عیسائیوں' ملحدوں اور چرچ کے مخالفین سے زمین کو پاک کرنا تھا۔ اس کا نام تھا "delainguicion Tribunaldelofficio" اس کا مقصد غیر عیسائیوں کو زبردستی عیسائی کرنا' ان کو ملک بدر کرنا' قتل کرنا' غلط نظریات رکھنے والوں کو آگ میں جلانا اور عمر بھر جیل میں قید رکھنا تھا۔ 31 مارچ 1492ء کو ایک حکم نامہ جاری کیا گیا' جسے حکم نامہ الحمراء کہا جاتا ہے جس کے تحت حکم دیا گیا کہ تمام یہودی 31 جولائی تک سپین چھوڑ دیں۔ یہودیوں پر سپین میں نہ رہنے کی پابندی 16 ستمبر 1968ء تک قائم رہی جب دوسری ویٹیکن کونسل نے 1492ء کے حکم نامے کو منسوخ کر دیا اور 2014ء یعنی گزشتہ سال سپین کی حکومت نے یہ قانون منظور کیا ہے کہ وہ یہودی جو یہاں سے چلے گئے تھے' ان کی نسل میں کوئی شخص اگر ثابت کرے تو وہ دہری شہریت کے طور پر سپین کی شہریت حاصل کر سکتا ہے۔ اس ٹرائیبونل کے مظالم سے تاریخ کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ اس ٹرائیبونل کے مظالم سے تاریخ کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ شاعروں' مصوروں' سائنس دانوں اور فلسفیوں کو جمع کیا جاتا' ٹرائیبونل فیصلہ کرتا کہ ان میں شیاطین کی روح گھس گئی ہے۔ پھر ایک دن شہر کے بیچوں بیچ بہت بڑا الاؤ روشن کیا جاتا اور ان سب کو اس میں پھینک دیا جاتا۔ یہودیوں کو جب یہ حکم ملا کہ وہ ناپاک ہیں اور سپین چھوڑ دیں تو ان میں نصف کے قریب عیسائی ہو گئے۔ چرچ کے پروہتوں نے یہ حکم جاری کیا کہ وہ روزانہ ان کے سامنے سئور کا گوشت کھائیں گے اور ہفتہ یعنی یہودیوں کی چھٹی کے دن اپنی دکانیں کھولیں گے۔ ایک مہینے کی مہلت تھی۔ لاکھوں یہودی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار اسی سمندر میں پناہ اور امان کی تلاش میں بھٹکنے لگے۔ کچھ کو قریب کے افریقی ساحلوں پر رہنا نصیب ہو گیا لیکن تاریخ کا روشن باب یہ ہے کہ سلطان بایزید دوم کو جب ان کی حالت زار کا علم ہوا تو اس سمندر میں بکھرے یہودیوں کو بچانے کے لئے اپنا سب سے بڑا بحری جہاز "کمال رئیس" روانہ کیا جو تقریباً ڈیڑھ لاکھ یہودیوں کو سمندر کی لہروں کے سپرد ہونے سے بچا کر لایا۔ یہودیوں کو خلافت عثمانیہ کے کسی بھی شہر میں آباد ہونے' کاروبار کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس وقت تک جدید قومی سیکولر ریاستوں کے قیام کے بعد پناہ گزین' مہاجرین' یا عارضی شہری کا تصور نہیں تھا جو آج کی مہذب دنیا کا تحفہ ہے۔ کسی سے شہریت دینے کے لئے پانچ' دس یا پندرہ سال تک مملکت سے وفاداری کا تجربہ نہیں مانگا جاتا تھا۔ پہلے کام کا ویزہ' پھر عارضی رہائش اور پھر شہریت کے جدید مہذب قوانین نہیں تھے۔ انسان دنیا بھر کے انسانوں کو اپنی طرح ہی کے انسان تصور کرتے تھے۔ یہ یہودی ترکی میں آباد ہو گئے۔ 1923ء میں جب خلافت عثمانیہ ٹوٹی اور ترکی بھی ایک جدید سیکولر قومی ریاست بن گیا تو یہودیوں نے یروشلم کی جانب آہستہ آہستہ جا کر آباد ہونا شروع کیا۔ 1949ء میں کمال اتاترک کے سیکولر ترکی نے اسرائیل کو تسلیم کیا تو یہودیوں کی اکثریت وہاں جا کر آباد ہوئی۔ اسے دنیا میں اسرائیل کی طرف جانے والی دوسری بڑی ہجرت کہا جاتا ہے۔

یہودی اسرائیل میں آباد ہو گئے بلکہ آباد کر دیئے گئے۔ وہ لوگ جو اس وقت عالمی ضمیر کے جاگنے اور برطانوی وزیر اعظم کے ضمیر کے زندہ ہونے پر تحسین کے ڈونگرے برسا رہے ہیں انہیں 1982ء کا صابرہ و شتیلہ کا وہ قتل عام اور اس کی تصویریں یاد نہیں آ رہی ہیں۔ انہیں گلیوں میں کھیلتے ان سینکڑوں معصوم بچوں کے گولیوں سے چھدے جسموں کی تصویریں بھول گئی ہیں۔ انہیں غزہ کے معصوم بچے یاد نہیں آئے جو اسرائیل کی بمباری سے ہسپتالوں میں مارے گئے' گھروں میں ان کے جسموں کے پرخچے اڑا دیئے گئے۔ انہیں عراق کے فلوجہ میں امریکی فوجیوں کے ہاتھوں قتل ہوتے بچوں کی تصویریں بھول گئیں۔ افغانستان میں غزنی کے قریب امریکی فوجی ہیلی کاپٹر سے پوری کی پوری بارات کی لاشیں کیا ذہن سے محو ہو گئیں۔ روہنگیا مسلمانوں کے بچوں کی لاشیں تو آج بھی کبھی ملائشیا اور کبھی تھائی لینڈ کے ساحلوں پر دفنائی جاتی ہیں۔

یہ عالمی ضمیر کس چڑیا کا نام ہے۔ یہ انسانی حقوق کس خطے میں پائے جاتے ہیں۔ ایلان کُردی وہ تین سالہ بچہ جسے کوبائی کے شہر میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس کے آباؤ اجداد کو تقسیم کس نے کیا اور کیوں کیا۔ وہ جو صلاح الدین ایوبی کے وارث تھے آج یورپ میں پناہ حاصل کر کے خوش ہو رہے ہیں۔ انہیں جدید قومی ریاستوں کی تخلیق کے وقت شام' عراق' ترکی' اردن اور ایران میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان کے گرد عالمی سرحدیں کھینچ دی گئیں۔ ان کے ہاتھ میں بندوق دے کر کہا گیا لڑو' ترکی سے لڑو' ایران سے لڑو' شام سے لڑو' عراق سے لڑو' پھر انہیں دربدر کیا گیا۔ وہ کبھی روس کے ہاتھ میں کھیلے اور کبھی امریکہ کا کھلونا بنے۔ صلاح الدین ایوبی کی قوم جس سے شکست آج بھی مغرب نہیں بھولا۔ کس قدر انا کو تسکین ملی ہو گی۔ برطانوی وزیر اعظم اور یورپ کے دیگر حکمرانوں کو جب انہوں نے اعلان کیا ہو گا کہ ہم ان کرد مہاجرین کے لئے سرحدوں کے دروازے کھولتے ہیں۔ سوال کیا جاتا ہے مسلم امہ کہاں ہے۔ مسلم امہ کہاں ہے۔ ستاون اسلامی جدید قومی ریاستوں پر سیکولر حکمران مسلط ہیں۔ وہ اتنے ہی قوم پرست ہیں جتنا کوئی فرانسیسی یا برطانوی ہو سکتا ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ۔

یہودیوں کی پیشگوئیاں نہیں چلنے والیں

بساط بچھ چکی ہے۔ تمام مہرے آہستہ آہستہ اپنی جگہ پر آرہے ہیں۔ ان مہروں میں کئی مدت سے اپنے مقام پر موجود بار بار پیش قدمی بھی کر چکے ہیں۔ کہیں جیت، کہیں ہار اور کہیں مسلسل لڑائی جاری ہے۔ میدان جنگ وہی ہیں جن کی نشاندہی مخبر صادق سید الانبیاء ﷺ فرما چکے۔ ایک شام اور دوسرا ہند۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے مسلمانوں سے یہ آخری معرکہ لڑنا ہے، ان کی تمام تر منصوبہ بندی معروضی اور علاقائی حالات کے مطابق نہیں ہے بلکہ ان کی کتابوں میں موجود پیش گوئیوں کے مطابق ہے۔ مگر وہ پوری دنیا کو معروضی حالات، عالمی امن، اقتصادی صورتِ حال اور علاقائی معاملات کے مطابق منصوبہ بندی کا درس دیتے ہیں۔ ان کے بتائے ہوئے ان اصولوں کو مدِ نظر رکھا جائے تو دنیا کی سب سے احمقانہ اور بے وقوف حرکت ایک بے سرو سامان اور بے آب و گیاہ علاقے میں اسرائیل کا قیام ہے۔ یہ قیام وہاں پر آباد لوگوں کے لئے نہیں تھا بلکہ دو ہزار سال پہلے وہاں سے نکالے گئے یہودیوں کے لئے تھا۔ ان لوگوں کی ساٹھ سے زیادہ نسلیں یورپ اور دیگر ممالک میں زندگیاں گزار کر دفن ہو چکی تھیں۔ لیکن انہوں نے اپنی آنے والی ہر نسل کو ایک سبق ذہن نشین کروایا تھا کہ خواہ تم لندن، پیرس، نیویارک، برلن اور سٹاک ہوم کے امیر ترین شخص بھی ہو جاؤ، تمہیں ان ملکوں میں سیاسی اقتدار بھی مل جائے، لیکن جب کبھی تمہیں ارضِ شام و فلسطین میں ایک ٹکڑا زمین مل جائے جہاں تمہاری حکومت قائم ہو تو تم نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں آباد ہو جانا ہے۔ ہے نا کس قدر احمقانہ، غیر سیاسی اور غیر اقتصادی حرکت۔ ایسا کرتے ہوئے کسی نے نہیں سوچا کہ معروضی حالات کیسے ہیں۔ چاروں جانب ایک ارب سے زائد مسلمان بستے ہیں، ہم ان کی زمین پر قبضہ کر رہے ہیں، وہ ہمارے خون کے پیاسے بن جائیں گے۔ پھر وہاں ہے کیا۔ ایک ریگستان، جس میں نہ کوئی پھل ہے نہ پھول، معدنیات بھی نہیں کہ ہم ملک کا اقتصادی پہیہ رواں دواں کر سکیں۔ کاروبار کے مواقع ہیں اور نہ ہی کوئی انڈسٹری۔ لیکن ان سب کو صرف ایک بات کا یقین دلایا گیا تھا اور نسل در نسل اس خواب کی آبیاری کی گئی تھی کہ ایک دن تمہارا مسیحا آئے گا اور وہ ارضِ فلسطین پر ایک ایسی حکومت قائم کرے گا جو پوری دنیا پر حکمران ہو گی اور تم نے اس مسیحا کی حکومت کے قیام کے لئے راہ ہموار کرنا ہے اور اس کے ساتھ مل کر ایک عالمگیر جنگ لڑنا ہے۔

آج کوئی سیکولر، لبرل، دفاعی اور سیاسی امور کا ماہر ایسی کسی پیش گوئی کا یقین کرتا ہے۔ سب مذاق اڑائیں گے کہ دنیا بھر میں اس قوم کی آبادی آدھا فیصد سے بھی کم ہے اور یہ ساڑھے ننانوے فیصد پر حکومت کے خواب دیکھ رہی ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ دنیا کا ہر سیکولر، لبرل، جمہوریت پسند اور عالمی امن کا علمبردار یہودیوں کے اس خواب کی تکمیل کے لئے دانستہ اور نادانستہ طور پر کام کر رہا ہے۔ انہیں اس "ارضِ مقدس" میں آباد کرنے، وہاں ان کا قبضہ مستحکم کرنے سے لے کر ان کی سیاسی، اقتصادی اور فوجی امداد تک انہی قوتوں نے کی ہے۔ اسرائیل کی مسلمانوں کے ساتھ ہر لڑائی میں یہ قوتیں سیاسی، اخلاقی اور فوجی سطح پر اسرائیل کے ساتھ رہیں اور آج وہ اسرائیل کے ممکنہ دشمن ملکوں کو بھی نیست و نابود کرنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پوری دنیا کی مغربی جمہوری طاقتیں صرف اور صرف اس ایک پیشگوئی پر ایمان رکھتی ہیں کہ ایک یہودیوں کا مسیحا فلسطین سے پوری دینا پر حکومت کرے گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی مصر، عراق، شام اور افغانستان پر جنگ مسلط نہ کرتا۔ کوئی اسرائیل کی بے جا حمایت کر کے، اس کے مظالم پر خاموش رہ کر اپنے ملکوں تک میں بسنے والے پرامن مسلمانوں کو تشدد پر مجبور نہ کرتا۔ پوری دنیا کے تجزیہ نگار اور سیاست دان اسرائیل اور اس کے مظالم کی حمایت کی ایک بھی عقلی دلیل نہیں پیش کر سکتے۔ کیا وہاں تیل کی دولت ہے جو مغرب استعمال کرتا ہے، معدنیات کے خزانے ہیں کہ بڑی بڑی کمپنیوں نے وہاں کام شروع کر رکھا ہے، دنیا کی مصنوعات کے بہت بڑی منڈی ہے جس سے ہر ملک کا مفاد وابستہ ہے۔ عالمی تجارت کا راستہ ہے کہ اسے کھلا رکھنا چاہیے۔ ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ اس کے باوجود تمام عالمی طاقتیں اسرائیل سے کسی قسم کا مفاد حاصل کئے بغیر اس کی اس طرح حمایت کرتی ہیں کہ چاہے وہ ایٹم بم بنا لے، ہزاروں عورتیں اور بچے مار دے، دوسرے ملکوں کے علاقے پر قبضہ کر لے، لیکن پھر بھی اس کی پشت پناہی جاری رہتی ہے۔ اپنے ملک میں گیارہ ستمبر کروا لینا ہے، لندن، پیرس اور دیگر شہروں میں حملے کروا لیتے ہیں، اپنے شہروں کی سیکورٹی پر اربوں روپے خرچ کر لیتے ہیں، لیکن اسرائیل کی حمایت نہیں ترک کرتی۔ اس کا مطلب ہے کہ دانستہ، یا نادانستہ طور پر پورا مغرب یہ سب کچھ سیاسی، معروضی اور اقتصادی وجوہات کی بنیاد پر نہیں کر رہا بلکہ ان کو بھی شاید یہودیوں کی طرح یقین ہے کہ انہوں نے مسلمانوں سے ایک بڑی جنگ لڑ کے ایک عالمی ریاست کو قائم کرنا ہے۔ اسی لئے تمام یہودی جنگ کے لئے ہمہ وقت مستعد ہیں، اور مغربی طاقتیں انہیں تمام سامان مہیا کر رہی ہیں اور انکے خلاف منظم ہونے والے ہر دشمن کا قلع قمع کر رہی ہیں۔

لیکن ان تمام سیکولر، لبرل، جمہوریت پسندی اور عالمی امن کے داعی سیاست دانوں، تجزیہ نگاروں اور دانشوروں کی منافقت اور دوغلا پن کا عالم یہ ہے کہ کوئی ریاست اگر اسرائیل کے مقابل کھڑی ہونے کی کوشش کرتی ہے تو اسے دہشت گرد یا دہشت گردوں کی پناہ گاہ کہا جاتا ہے اور اگر کوئی گروہ ان کے مقابلے میں منظم ہونے لگتا ہے تو اسے عالمی امن کے لئے خطرہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ تمام سیاست دان، دانشور اور تجزیہ نگار مسلمان ممالک کو ہر روز یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تم اقتصادی، معروضی اور سیاسی حالات کے مطابق فیصلے کرو۔ اپنی حالت دیکھو، اپنی معاشیات کو بہتر بناؤ، اپنے ملکوں کو امن کا گہوارہ بناؤ، اپنے اندر سے ایسے افراد کا خاتمہ کرو جو اس آخری عالمی معرکے کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کی پیش گوئیوں پر ایمان کی حد تک یقین رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آخری فتح ہماری ہے۔

ہمیں اس کا ادراک ہو نہ ہو، اسرائیل کو اس بات کا مکمل یقین ہے کہ اس کا اصل دشمن کون ہے۔ اسرائیل نے جب 1967ء میں مصر، شام اور اردن کے سیکولر حکمرانوں ناصر، اسد اور شاہ حسین کی افواج کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا تو اس کے پہلے وزیر اعظم ڈیوڈ بن گوریان نے پیرس کی ساربون یونیورسٹی میں دنیا بھر کے یہودیوں کی کانفرس سے خطاب کرتے ہوئے کہا "بین الاقوامی صیہونی تحریک کو کسی طرح بھی پاکستان کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ پاکستان در حقیقت ہمارا اصلی اور حقیقی آئیڈولوجکل جواب ہے۔ پاکستان کا ذہنی و فکری سرمایہ اور جنگی و عسکری قوت و کیفیت آگے چل کر کسی بھی وقت ہمارے لئے باعث مصیبت بن سکتی ہے۔ بھارت سے دوستی ہمارے لئے نہ صرف ضروری ہے بلکہ مفید ہے" (یروشلم پوسٹ 9 اگست 1967ء)۔ ممبئی حملے کیا ہیں۔ ان کو کس لئے ہر مذاکرات میں اہمیت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر مشترکہ اعلامیہ میں ان کا ذکر لازمی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ممبئی حملہ بھارت اور اسرائیل کے اس گٹھ جوڑ پر حملہ تھا۔ دنیا بھارت میں مرنے والے ایک لاکھ انسانوں کو توپسِ پشت ڈال سکتی ہے لیکن ممبئی میں مرنے والے اسرائیلی ایجنٹوں کی موت کو بھلانے کے لئے تیار نہیں۔ سشما سوراج کے ساتھ ہونے والے مذاکرات کے مشترکہ اعلامیہ میں بھی ممبئی حملے کی یاد تازہ کی گئی جبکہ سمجھوتہ ایکسپریس کو فراموش کر دیا گیا جس میں پاکستانیوں کو ٹرین کے دروازے مقفل کر کے آگ لگا دی گئی تھی۔ وقت، تاریخ اور حالات کی مخالف سمت سفر کرنے والے آج بھی سمجھتے ہیں کہ پاک بھارت دوستی کا سفر آگے بڑھ سکتا ہے۔ دنیا چاہے جتنے اقتصادی، سیاسی اور علاقائی تجزیے پیش کرے، ڈیوڈ بن گوریان اور اس کی قوم کی حکمتِ عملی اس سفر کے برعکس ہے۔ وہ کہتا ہے "ہمیں اس تاریخی عناد سے لازماً فائدہ اٹھانا چاہیے جو ہندو، پاکستان اور اس میں رہنے والے مسلمانوں کے خلاف رکھتا ہے۔ یہ تاریخی دشمنی ہمارے لئے زبردست سرمایہ ہے۔ لیکن ہماری "حکمتِ عملی ایسی ہونی چاہیے کہ ہم بین الاقوامی اداروں کے ذریعے بھارت کے ساتھ اپنا ربط و ضبط رکھیں (یروشلم پوسٹ۔ 9 اگست 1967ء)۔ جس طرح یہودیوں کو ایمان کی حد تک یقین ہے کہ یہ عالمی جنگ برپا ہونی ہے۔ ویسے ہی ہر مسلمان کے ایمان کا حصہ سید الانبیاء ﷺ کی وہ حدیث ہے جس میں آپؐ نے صحابہ سے جہادِ ہند کے لئے وعدہ لیا، بشارت دی کہ اس لشکر پر جہنم کی آگ حرام ہے اور وقت بتاتے ہوئے کہا کہ جب آپ لوگ ہند کے حکمرانوں کو زنجیروں میں جکڑ کر لاؤ گے تو عیسیٰ ابن مریم کو اپنے درمیان پاؤ گے اور عیسیٰ ابن مریم کی آمد اسرائیل اور دجال کی شکست ہے۔ (سنن نسائی، مسند احمد، بیہقی، مستدرک، الفتن)۔ جس طرح یہودیوں کا ایمان ہے کہ ہم نے جنگ لڑنا ہے اور وہ گھربار اور عیش و آرام چھوڑ کر اسرائیل میں آباد ہوئے ہیں۔ ایسے میں ہمارا بھی ایمان یہ ہونا چاہیے کہ جو کوئی ہند سے دوستی کرتا ہے وہ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ کئے گئے عہد سے منہ موڑتا ہے۔ اور شاید اسی منہ موڑنے کی سزا ہمیں نہیں بلکہ پوری امت کو مل رہی ہے۔

ضمیر کی موت اور پارٹی وفاداری

اٹھارویں ترمیم کے آئینی مراحل سے جمہوری پارلیمانی آسمان پر چمکنے والے رضا ربانی کی ایک تقریر کو اس ملک کے دانشوروں اور تجزیہ نگاروں نے اِس طرح سراہا جیسے ان کی یہ تقریر ایتھنز کی جیوری کے سامنے سقراط کی تقریر کے ہم پلہ ہو۔ ان کی یہ تقریر فوجی عدالتوں پر لائی جانے والی آئینی ترمیم کے بارے میں تھی، جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ میں آج اپنی پوری سیاسی زندگی میں سب سے زیادہ شرمندہ اور غمزدہ ہوں۔ میرا ووٹ میری پارٹی کی امانت تھی، اس لیے میں یہ ووٹ اسے دے رہا ہوں لیکن میرا ضمیر اس کی اجازت نہیں دیتا۔

جمہوری، پارلیمانی، سیکولر اور سیاسی پارٹیوں سے آراستہ اس نظام کا کمال یہ ہے کہ یہاں ضمیر ہمیشہ پارٹی، پارٹی لیڈر اور پارٹی مفادات کے سامنے شکست کھا جاتا ہے اور اس شکست کو جمہوری نظام کی فتح اور بالادستی کا نام دیا جاتا ہے اور جو شخص اس ضمیر کی موت کا اعلان کرتا ہے اسے عظیم رہنما اور جمہوریت کی مسند اعلیٰ پر سرفراز تصور کیا جاتا ہے۔ یہ پارٹی سسٹم اس جمہوری نظام کا کیوں جزو لاینفک سمجھا جاتا ہے۔ پورے جمہوری نظام کو سیاسی پارٹیوں کا یرغمال کیوں بنایا جاتا ہے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ امریکہ، برطانیہ، یورپ اور یہاں تک کہ بھارت تک اس جمہوری نظام میں سرگرم سیاسی پارٹیوں کے منشور اٹھا کر دیکھ لیں، آپ کو ان میں بہت کم نظریاتی فرق نظر آئے گا۔ جبکہ نظریاتی اساس پر قائم سیاسی پارٹیاں دنیا کے ان جمہوری ملکوں میں ایک کونے میں پڑی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جن کا پرچم چند دیوانے اٹھائے پھرتے ہیں۔ تمام بڑی سیاسی پارٹیاں ایک طرح کے گروہ ہیں جو سرمایہ، قبیلہ برادری اور جتھے کی بنیاد پر قائم کیے جاتے ہیں۔ سب کے منشور ایک جیسے ہوتے ہیں اور سب کے لیڈر بھی ایک طرح کے راگ الاپتے ہیں۔ مغربی ممالک میں وقت کے ساتھ ساتھ ایک تصور بہت مضبوط ہوا ہے کہ کوئی اپنی پارٹی چھوڑ کر کسی دوسری پارٹی میں نہیں جا سکتا۔ شکست و فتح، دونوں صورتوں میں وہ سیاسی ورکر یا لیڈر پارٹی کے ساتھ منسلک رہتا ہے اور اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ انگلینڈ میں مشہور سیاسی رہنما چرچل کی ایک مثال ایسی ہے جس نے اپنی پارٹی چھوڑ کر دوسری پارٹی میں شمولیت اختیار کی تھی اور جنگ عظیم دوئم کے ہنگاموں میں اس کی یہ حرکت نمایاں نہیں ہو سکی تھی۔ چھوٹے ملکوں کی جمہوریتوں میں تو پارٹی بدلنا شیروانی بدلنے کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ جو کوئی پارٹی بدلتا ہے اس کے ساتھ یہ خبر بھی میڈیا نشر کرتا ہے کہ وہ اپنے لاکھوں ساتھیوں سمیت پارٹی میں شامل ہوا ہے۔ قبیلے، گروہ، جتھے اور برادری ان ملکوں میں مضبوط ہیں اور ان کا ملغوبہ ایک سیاسی پارٹی ہوتی ہے جو جمہوری نظام کو چلاتی ہے۔ دنیا بھر میں عموماً ہر ملک میں دو یا تین سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں جو میدان سیاست پر چھائی ہوتی ہیں، باقی چھوٹی چھوٹی درجنوں پارٹیاں ہر ملک میں موجود ہوتی ہیں لیکن ان کی حیثیت ایک خاص طبقے، گروہ یا علاقے سے آگے نہیں بڑھتی۔

غیر سیاسی انتخاب، جمہوری نظام میں گالی کیوں ہے؟ آزاد امیدوار تھالی کا بینگن کیوں ہے؟ جیتنے کے بعد بھی وہ اس تلاش میں رہتا ہے کہ اسے کوئی صاحبِ اقتدار پارٹی اپنا لے اور اس کا الیکشن میں جیتنا کام آ جائے۔ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ سیاسی پارٹیاں لوگوں کی سیاسی تربیت کرتی ہیں۔ دنیا کے کسی بھی ملک کے بڑے سے بڑے سیاسی لیڈر کی زندگی اور سیاست کو اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو وہ ایک سطحی سی شخصیت نظر آئے گا۔ کیا باراک اوباما، جارج بش، ٹونی بلیئر، گورڈن براؤن، منموہن سنگھ، نریندر مودی، نواز شریف اور زرداری اعلیٰ سطح کے مفکرین تھے جنہوں نے اپنی اپنی قوموں کو سیاسی فکر اور سوچ عطا کی۔ ہرگز نہیں۔ وہ تو اس سیکولر سیاسی جمہوری پارلیمانی نظام کے سانچے میں ڈھلے ہوئے روبوٹ تھے جن کی تمام تر صلاحیتیں اس حد تک محدود ہوتی ہیں جنہیں موجودہ کمپیوٹر سسٹم کی زبان میں پروگرامڈ (Programmed) کہا جا سکتا ہے۔ اس سیکولر، جمہوری، سیاسی، پارلیمانی نظام کے بنائے گئے پروگرام کے باہر جس نے بھی سوچنے کی کوشش کی، موت اس کا مقدر بنا دی گئی۔ مصر کے صدر مرسی اس کی تازہ ترین مثال ہے۔ آپ ایک سیاسی پارٹی بنا کر، سیاسی جمہوری نظام کا حصہ بن کر اس کے حدود وقیود سے تجاوز کرنے کی کوشش کر کے دیکھیں، آپ کو نشانِ عبرت بنا دیا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ سیکولر، سیاسی، جمہوری نظام کارپوریٹ سرمائے نے اپنے مقاصد کے لیے تخلیق کیا ہے۔ عوام کے لیے تجربہ گاہ نہیں بنایا۔ یہ نظام تو انہوں نے اپنے مفادات کے لیے تخلیق کیا ہے اور انہیں اس نظام کے چلانے کے لیے سیاسی بونے چاہئیں، جن کے نزدیک، ضمیر، اخلاق، سچ، اور اعلیٰ اقدار پر پارٹی مفادات مقدم اور محترم ہوں اور وہ ایسا کرنے کو جمہوریت کی بقا اور روح سمجھیں۔

دنیا بھر کی جمہوریتیں، سیاسی پارٹیوں کے ذریعے چلائی جاتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ لوگ جنہوں نے اس نظام کی لگامیں اپنے ہاتھ میں رکھنا ہے ان کے لیے ایک ایک فرد کو خریدنے کی بجائے پوری پارٹی کو خریدنا انتہائی آسان اور ہوتا ہے۔ پوری دنیا میں پارٹی فنڈنگ ایک ایسا تصور ہے جس کے تحت دنیا بھر کا سرمایہ دار اپنے کالے، نیلے سہل پیلے اور سفید دھن کے تحفظ کے لیے اپنے سرمائے کا ایک حصہ ان سیاسی پارٹیوں کی نذر کرتا ہے۔ اربوں ڈالر ان پارٹیوں کے اکاؤنٹ میں چلے جاتے ہیں۔ یہ اربوں ڈالر اگر ان پارٹیوں کے پاس نہ ہوں تو کوئی الیکشن تو دور کی بات جمہوریت کے بارے میں سوچنے کا بھی تصور نہیں کر سکتا۔ ہر ملک میں چند ہفتوں کے لیے الیکشن کا ایک خوبصورت میلہ سجتا ہے، اپنے اپنے ماحول کے مطابق جلسوں، ریلیوں، جلوسوں، رقص و سرود اور میلوں ٹھیلوں کے ذریعے عوام کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ان کے ووٹ سے یہ حکومت بننے جا رہی ہے اور عوام ہی اصل طاقت ہیں جو سیاست دانوں کو حکمران بناتے ہیں۔ چند ہفتے عوام اس خوبصورت فریب میں مبتلا رہتے ہیں۔ کبھی ایک پارٹی اقتدار کی راہداریوں میں جاتی ہے اور کبھی دوسری۔ لیکن ان سب کے آقا، مربی، فنانسر اور ان کی لگامیں اپنے ہاتھوں میں رکھنے والے ایک ہی ہوتے ہیں۔ اسی لیے جب کوئی پارٹی مفادات، پارٹی ڈسپلن یا پارٹی گائیڈ لائن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتا ہے تو اسے غدار، جمہوریت دشمن، لوٹا، مفادات کا غلام قرار دیا جاتا ہے۔ پوری کی پوری پارٹی کو بیچ دیا جائے تو وہ عین جمہوریت، لیکن ایک فرد بکے تو یہ جمہوریت کی توہین ہوتی ہے۔ اس کی سب سے کریہہ مثال یہ ہے کہ امریکہ کے سرمایہ داروں نے 32 ہزار ارب ڈالر کیمن جزیرے میں اس لیے رکھے ہیں تاکہ ٹیکس سے بچا جا سکے لیکن امریکی جمہوریت میں دونوں پارٹیوں کا کوئی ایک رکن بھی آواز بلند نہیں کرتا سب کے سب پارٹی ڈسپلن کے پابند ہیں اور یہی اس جمہوری، سیاسی، پارلیمانی نظام کا کمال ہے۔

اخلاق، اقدار، روایات، سچ، ضمیر اور دیانت صرف اور صرف عام آدمی کے لیے۔ بڑا آدمی ضمیر کی آواز پر ایک تقریر کر کے خاموش ہو جاتا ہے۔ وہ نہ سینٹ کی نشست چھوڑتا ہے اور نہ ہی پارٹی۔ اسے اپنے ضمیر کی آواز کو سلانے کا یہ صلہ ملتا ہے کہ اس ملک کے دانشور اسے عظیم جمہوری رہنما کا لقب دیتے ہیں اور اس ملک کی دونوں پارٹیاں اسے سینٹ کی چیئرمین شپ سے نواز دیتی ہیں۔ صرف ایک لمحے کو سوچئے اگر وہ ضمیر اور سچ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے پارٹی سے اختلاف کرتا، پارٹی چھوڑ دیتا، سینٹ کی نشست سے استعفےٰ دے دیتا تو آج گمنامی کے اندھے کنویں میں اس کا نام و نشان تک مٹ چکا ہوتا۔